آسیب زدہ
انوار صدیقی

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس و ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی و غیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے فری آف کاسٹ وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- ہمارا اردو کتب کا وٹس گروپ جوائن کرنے کے لئے درج ذیل لنکس پر کلک کریں ہر دو کیٹیگری میں صرف ایک ہی گروپ جوائن کریں اگر پہلے سے جوائن ہیں تو اس کو سکپ کر دیں۔ عمران سیریز کے شوقین عمران سیریز گروپ جوائن کر سکتے ہیں۔

اردو بکس 1	https://chat.whatsapp.com/EFrs3uGTgEm2319kK0wfu2
اردو بکس 2	https://chat.whatsapp.com/Ke9odWnuu7T9zRUGgYEcYV
اردو بکس 3	https://chat.whatsapp.com/IEl5cejf7Xc0b1HjApSyxI
اردو بکس 4	https://chat.whatsapp.com/J2HwtCI39spKjifu3aC61i
1 New Books	https://chat.whatsapp.com/EFrs3uGTgEm2319kK0wfu2
2 New Books	https://chat.whatsapp.com/D9yLIpv8dLVJHLjuVNIAtk
3 New Books	https://chat.whatsapp.com/I5dFInQasVTLcmKrbpa1bv
عمران سیریز 1	https://chat.whatsapp.com/Ggokw9DndA68GCuURnNA2H
عمران سیریز 2	https://chat.whatsapp.com/C11xpIXfws3JRqn8gSt3LZ

گروپ فل ہونے کی صورت میں ایڈ من سے وٹس ایپ پر میسج کریں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے ریموو کر دیا جائے گا اور بلاک بھی کیا جائے گا۔

محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز
0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313

پاکستان زندہ باد　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

قارئین کے نام

مکتبہ القریش کے توسط سے میرے سلسلے وار ناول "خبیث" ' برہمچاری" اور "درخشاں" شائع ہو چکے ہیں۔

اب میری کہانیوں کا مجموعہ "آسیب زدہ" پیش کر رہے ہیں۔ مختصر کہانیوں اور افسانوی ادب میں اتنے بڑے بڑے اور قد آور نام موجود ہیں۔ کہ ان کے مقابلے میں اپنے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہو گی۔ جو لوگ مجھ سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ میں نے ادیب یا مصنف ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ جو کچھ لکھا صرف اپنے شوق کی خاطر لکھا۔ اس لئے ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ کبھی نہیں کی۔ کسی نے واہ وا. کیا تو میں نے سمجھا۔ یہ شخص شاید میرا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کسی نے سنجیدگی سے تنقید کا نشانہ بنایا۔ تو یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ کوئی تو ہے۔ جو مجھے قابل اصلاح سمجھتا ہے۔

"آسیب زدہ" کو مرتب کرتے وقت ہر ذوق کے قارئین کی پسند کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اس مجموعے میں آپ کو ہر موضوع کی چاشنی ملے گی۔ "جرم و سزا' پراسرار' ہولناک' مہماتی' ناقابل توجیہہ ماورائی اور دیومالائی" کہانیوں کے علاوہ (میرے خیال میں) کچھ ادبی افسانے بھی ہیں۔

مجھے ان کہانیوں کے بارے میں صرف اتنا عرض کرنا ہے۔ کہ یہ پاکستان کے ان معیاری ڈائجسٹوں میں شامل رہی ہیں۔ جن کو آپ کی پسندیدگی کی سند حاصل ہے۔

"مکتبہ القریش" کی معرفت اپنے بے لاگ تبصروں سے ضرور نوازیں یہ مجھ پر نہیں۔ میرے قلم پر آپ کا احسان ہو گا۔ شکریہ!

انوار صدیقی

ترتیب

درندہ

تھیلما نے اپنی زندگی کے سترہ سال واشنگٹن کے ایک قصبے میں گزارے تھے ——— جو پٹس برگ سے بیس میل جنوب مغرب میں واقع تھا اور کوئلے کی کانوں کے علاوہ ایک مصروف تجارتی مرکز بھی تھا۔ اس کے تمام دوست، واقف کار، پڑوسی اور اسکول کے ساتھی اس بات پر متفق تھے کہ تھیلما انتہائی سیدھی سادی، نیک اور پاکباز لڑکی تھی۔ وہ گھر پر اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی اور گھریلو کاموں میں خوشی خوشی ان کا ہاتھ بٹانا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ فالتو وقت میں اس نے واشنگٹن کے جیفرسن کالج اور اتھیلیٹکس ٹریننگ ہاؤس کے نگران کے ماتحت کی حیثیت سے ملازمت بھی اختیار کر رکھی تھی۔

تھیلما خوبصورت اور نوجوان ہونے کے ساتھ ساتھ جنس مخالف کے لیے اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی تھی لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود وہ کبھی کسی مرد کے ساتھ نہیں دیکھی گئی تھی۔ اس کا کوئی مرد دوست سرے سے تھا ہی نہیں ——— وہ محض ٹینس کھیلنے اور سنیما دیکھنے کی شائق تھی۔ اس نے قصبے میں آنے والی تمام فلموں کو دیکھ رکھا تھا۔ ہالی وڈ کی بنی ہوئی فلمیں تو اسے دیوانگی کی حد تک پسند تھیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ فلموں کا شوق ہی اس کے قتل کی وجہ ثابت ہوا تو بے جا نہ ہو گا اس لئے کہ واردات کی رات اگر وینجٹ تھیٹر میں وہ نئی فلم نہ چل رہی ہوتی اور تھیلما اسے دیکھنے کی غرض سے نہ جاتی تو شاید وہ اس بھیانک موت سے دوچار نہ ہوتی۔

وہ کرسمس اور نئے سال کے درمیان 29 دسمبر کی رات تھی۔ پھولوں کے بڑے بڑے ہار سجے ہوئے درخت اور سانتا کلاز کے مجسمے جو ابھی تک سڑکوں اور بڑی بڑی دوکانوں کے شیشوں کے اندر موجود تھے۔ دھند اور کہر کے باعث بڑے پر اسرار لگ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بے شمار بدروحیں کسی شیطانی رقص میں مصروف ہوں۔ سڑکوں کی روشنیاں بھی گہری دھند کی وجہ سے ٹمٹماتی نظر آ رہی تھیں۔ سارا ماحول بڑا پر اسرار اور ہولناک لگ رہا تھا لیکن تھیلما اس کے باوجود نئی فلم دیکھنے کی غرض سے نکل پڑی تھی۔

ریجنٹ تھیٹر میں اپنی نشست پر بیٹھنے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جب فلم ختم ہونے کے بعد وہ باہر نکلے گی اس وقت تک دھند اور کہر کی وہ یورش جو قصبے والوں کے لیے اس موسم میں قطعی غیر متوقع تھی ختم ہو چکی ہو گی لیکن جب دس بجے سے کچھ پیشتر وہ نئی فلم سے لطف اندوز ہونے کے بعد تھیٹر سے باہر آئی تو ماحول پہلے سے زیادہ خوفناک اور بھیانک نظر آ رہا تھا۔ کہر اور دھند کی چادر کچھ اور بیز ہو گئی تھی مگر تھیلما مطلق خوفزدہ نہیں ہوئی اور جانے پہچانے راستوں پر چل پڑی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے وہ قریبی راستہ اختیارہ کرنے کا رادہ بھی کر لیا تھا جو اسے کم وقت میں گھر پہنچا سکتا تھا۔

قتل سے پہلے اس کی آخری ملاقات ریلوے کراسنگ کے نائٹ ڈیوٹی کے نگران سے ہوئی جو اس سے واقف تھا۔ ان دونوں کے درمیان کچھ رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا پھر ریلوے کراسنگ کے نگران نے اس غیر متوقع دھند اور کہر کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں گھر تک پہنچنے کے لیے بہت محتاط قدم اٹھانے کی ضرورت ہو گی۔"

تھیلما بوڑھے نگران کی اس بات پر زیر لب مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ریلوے کراسنگ سے ایک فرلانگ دور جا کر وہ اس راستے پر ہولی جو بے حد قریب کا تھا۔ یہ ایک غیر آباد راستہ تھا جہاں جنگلی جھاڑیاں اور کانٹے دار درختوں کی بہتات تھی۔ ان ہی جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان سے بل کھاتی ہوئی ایک پگڈنڈی پہاڑی حصے کی طرف چلی گئی تھی اور دوسری بالٹی مور ایونیو کی طرف جس پر تھیلما جا رہی تھی۔

○

جمعہ کی صبح بے حد سرد اور خوشگوار تھی۔ گزشتہ رات کی دبیز کہر اور دھند چھٹ چکی تھی۔ موسم کا حسن نکھر آیا تھا۔ اسی خوشگوار صبح کو ایک مزدور جھاڑیوں والے مختصر راستے سے ہو کر اپنی ملازمت پر جا رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک اونچی ایڑی والی زنانہ سینڈل پر پڑی جو راستے میں پڑی تھی۔ سینڈل سے چند قدموں کے فاصلے پر درختوں کی چند ٹوٹی ہوئی شاخیں موجود تھیں۔ مزدور ان چیزوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھا تو پھٹے ہوئے کپڑے کی کچھ دھجیاں ملیں پھر اس کی نظر ایک لکڑی پر پڑی جس پر خون کے دھبے بھی موجود تھے۔ ابھی وہ دس بارہ ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ اس کی نظر ایک لڑکی کے مردہ جسم پر پڑی۔ جو ٹیلیفون کے کھمبے کے قریب جھاڑیوں کے درمیان زمین کے ایک مختصر مگر صاف ٹکڑے پر بے حس و حرکت پڑا ہو تھا۔ مزدور نے ایک نظر اس لڑکی کے عریاں اور خون آلود جسم پر ڈالی پھر تیزی سے پہاڑی کی طرف دوڑنے لگا تا کہ وہاں سے پولیس کو اس حادثے کی اطلاع دے سکے۔

پولیس کی ایک مختصر جماعت اطلاع ملتے ہی جائے حادثہ پر پہنچ گئی۔ قبل اس کے کہ تفتیش کا آغاز کیا جاتا سارجنٹ ولیم جو ترنے لاش کے اطراف میں اپنے سپاہیوں کو دائرے کی صورت میں گھیرا ڈالنے کا حکم دیا تا کہ ان افراد کو دور رکھا جا سکے جو پولیس کو وہاں دیکھ کر واردات کی نوعیت جاننے کی غرض سے بھاگے چلے آئے تھے اور اب لاش کو ایک نظر قریب سے دیکھ لینے کے لئے بے حد بے چین نظر آ رہے تھے۔ ولیم جو نرنے یہ اقدام محض اس لیے کیا تھا کہ اول تو وہ ان لوگوں کو قبل از وقت اس واردات کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا دوسرے اس کو اس بات کا خدشہ بھی تھا کہ کہیں بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے وہ نشانات نہ مٹ جائیں جو قاتل کو پولیس کی دسترس تک لانے میں مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔

لڑکی کی نبض دیکھتے ہی ایک افسر نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ وہ مر چکی ہے پھر لاش کا باقاعدہ معائنہ شروع ہو گیا۔ لڑکی کا سر بری طرح پھٹا ہوا تھا۔ اس کے خوبصورت سیاہ بال گرد میں اٹے تھے۔ اس کے چہرے اور برہنہ سینے پر جابجا خون جما ہوا نظر آ رہا تھا۔ لڑکی کی ٹانگوں پر جگہ جگہ خراشیں اور کھرونچے موجود تھے جو غالباً کانٹوں کی وجہ سے اس وقت اس کے جسم پر پڑے تھے۔ جب قاتل نے اسے خار دار

جھاڑیوں کے درمیان بے دردی سے گھسیٹا تھا۔ لاش کی ظاہری حالت اور لباس کی بے ترتیبی دیکھ کر یہ بات صاف طور پر عیاں تھی کہ قاتل نے اسے بڑی سنگدلی سے قتل کیا ہے۔ ممکن ہے اس نے لڑکی کو اپنی جنسی درندگی کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کیا ہو۔ اس لیے کہ تھیلما کا لباس تار تار نظر آ رہا تھا۔ زیر جامے کی بھی یہی حالت تھی۔ اس کے موزے خون میں تر بتر ہو گئے تھے اور بلاوز گردن میں پھنسا تھا۔ باقی کپڑے جسم سے اتار کر دور پھینک دیے گئے تھے۔

ولیم جونز نے لاش سے کچھ فاصلے پر بھورے رنگ کا ایک بڑا بٹن پڑا پایا جس میں تھوڑا دھاگا بھی الجھا ہوا تھا۔

"یہ بٹن یقیناً" قاتل کے اوورکوٹ سے اس وقت ٹوٹا ہو گا جب لڑکی نے اپنے بچاؤ کی خاطر اس کے ساتھ ہاتھا پائی کی ہو گی۔" ایک سپاہی نے اس بٹن کو بطور ثبوت ایک لفافے میں محفوظ کرتے ہوئے کہا۔

لاش کے قریب ایک اور نشان بھی ملا تھا۔ یہ ایک انسانی ہاتھ کا مکمل اور واضح نشان تھا جو نم زمین پر موجود تھا اور غالباً" اس وقت بنا تھا جب قاتل نے تھیلما کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد زمین پر ہاتھ ٹیک کر اٹھنے کی کوشش کی ہو گی۔ پولیس کے ماہرین نے پلاسٹر کے ذریعے اس کا نمانہ بنا کر اپنے پاس محفوظ کر لیا۔

موقعہ واردات اور قرب و جوار کی جھاڑیوں کا جائزہ لینے کے بعد پولیس اور سراغرسانوں نے اس امر کا بخوبی اندازہ لگا لیا کہ جرم کیوں کر اور کس انداز میں کیا گیا ہو گا۔ ایک افسر نے تفصیل کے ساتھ بتاتے ہوئے کہا۔

"قاتل جو جنسی جنونی ہے غالباً" ان جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ جیسے ہی لڑکی قریب آئی اس نے اچانک چھلانگ لگا کر اسے گلے سے دبوچ لیا۔ یہ اس جگہ ہوا ہو گا جہاں سے مقتولہ کا سینڈل اور درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخیں ملی تھیں۔ قاتل نے لڑکی کو پکڑتے ہی اس کے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کی پھر اسے جھاڑیوں میں گھسیٹنے لگا۔ لڑکی کے مزاحمت کرنے پر قاتل نے مشتعل ہو کر ایک لکڑی اٹھا کر اس کے سر پر ماری اور اس کے باقی کپڑے پھاڑنے کے بعد دوبارہ گھسیٹتا ہوا یہاں تک لے آیا۔"

"یہاں پہنچ کر لڑکی نے ایک بار پھر خود کو جنسی جنونی کے ناپاک شکنجے سے آزاد کرانے کے لئے جدوجہد شروع کر دی لیکن قاتل جو اس وقت بری طرح جوش میں تھا اس مزاحمت پر دیوانہ ہو گیا۔ اس نے لڑکی کے بالوں کو ہاتھ میں جکڑ کر اس کے سر کو ٹیلیفون کے کھمبے سے ٹکرانا شروع کر دیا جیسا کہ کھمبے پر خون کے دھبوں سے ظاہر ہے۔ لڑکی کے بے ہوش ہو کر زمین پر گر جانے کے بعد قاتل نے اپنی مرضی کے مطابق اس کے جسم کو کپڑوں کی قید سے آزاد کیا پھر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد گہری دھند اور کہر کی دبیز چادر میں چھپتا چھپاتا کسی کی نظر میں آئے بغیر بہ آسانی فرار ہو گیا۔"

اس درمیانی راستے پر جہاں لڑکی کو پکڑا گیا اور جہاں لے جا کر مارا گیا تھا پولیس کو "ٹرو لو اسٹوری" (TRUE LOVE STORY) کا ایک تازہ شمارہ ملا جس کے متعلق اس کا قیاس تھا کہ وہ مقتولہ کے ہاتھ میں رہا ہو گا۔ پولیس اور سراغرساں ابھی قتل کے تمام امکانی پہلوؤں پر غور کر ہی رہے تھے کہ ایک سپاہی ایک لڑکے کو لئے ان کے قریب آ گیا۔ لڑکے کا بیان تھا کہ اس کے پڑوس میں رہنے والی ایک لڑکی گزشتہ رات سے غائب ہے چنانچہ وہ لاش کو دیکھنے کا متمنی تھا۔ جب لڑکے کو مقتولہ کی شکل دکھائی گئی تو سسکیاں بھرتے ہوئے بولا۔

"یہ وہی لڑکی ہے ———— تھیلما جو گزشتہ رات سے غائب ہے۔"

پولیس کے استفسار پر لڑکے نے تھیلما کے بارے میں کہا۔

"تھیلما کی عمر سترہ سال ہے جناب۔ اس کا پورا نام تھیلما ینگ ہے اور یہ الٹا ماؤنٹ ایونیو میں میرے پڑوس میں رہتی ہے۔ گزشتہ شام چائے پینے کے بعد ہی یہ کہیں جانے کے ارادے سے گھر سے نکلی تھی۔ رات دیر تک جب تھیلما واپس نہیں لوٹی تو اس کے والدین پریشان ہو گئے۔ پھر انہیں خیال آیا کہ ممکن ہے اپنی کسی سہیلی کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی ہو گی۔ ایک دو بار پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ جب فلم دیکھنے کے بعد تھیلما رات گزارنے کی خاطر اپنی کسی سہیلی کے گھر چلی گئی تھی۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت اس کے والدین نے پولیس کو ابھی تک اس کی گمشدگی کی اطلاع بھی نہیں دی۔ ان کا خیال تھا کہ تھیلما کچھ دیر میں واپس آ جائے گی۔"

پولیس چیف اور اس کی پوری پارٹی لڑکے کو ساتھ لے کر تھیلما کے گھر پہنچی اور

اس کے والدین کو اس اندوہناک حادثے کی اطلاع سنائی۔ کچھ دیر بعد تھیلما کے والدین نے بھی وہی بیان دیا جو لڑکا دے چکا تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ تھیلما کے کسی ایسے دشمن سے واقف نہیں ہیں جس پر قتل کا شبہ کیا جا سکے۔

پولیس کو دھند والی منحوس رات تھیلما کی بیرونی مصروفیات کے بارے میں مزید معلومات اس کے ایک اور قریبی عزیز سے ملیں۔

"اس وقت میں اپنے شوہر کے ساتھ تھی۔ تھیلما سے ہماری ملاقات تقریباً" سات بجے اتفاقیہ طور پر ہو گئی۔ وہ ریجنٹ تھیٹر میں چلنے والی نئی فلم کو دیکھنے کی خواہشمند تھی لیکن اس کے پاس ٹکٹ کے لئے پورے پیسے نہیں تھے چنانچہ میں نے صرف یہ کہ اسے ایک ڈالر دے دیا بلکہ "ٹرو لو اسٹوری" کا وہ تازہ شمارہ بھی دے دیا جو میرے پاس موجود تھا۔ تھیلما اس قسم کے رسالوں کو بڑے شوق سے پڑھا کرتی تھی۔"

ریجنٹ تھیٹر کے ایک ملازم نے جو تھیلما کو جانتا تھا پولیس کو بتایا کہ گہرے سیاہ بالوں والی لڑکی نے صرف ایک ٹکٹ خریدا تھا اور سات بجکر کچھ منٹ پر وہ ہال میں داخل ہوئی۔ فلم چونکہ تقریباً" ڈھائی گھنٹے کی تھی اس لیے اس نے خیال ظاہر کیا کہ تھیلما تقریباً" نو بج کر پینتالیس منٹ پر وہاں سے روانہ ہوئی ہو گی۔

سراغرسانوں نے ریلوے کراسنگ کے نگراں سے پوچھ گچھ کی تو اس نے کہا۔

"جناب۔ میں تھیلما سے بخوبی واقف ہوں۔ حادثے والی رات میں نے اس سے کچھ دیر بات بھی کی تھی۔ اس وقت رات کے تقریباً" دس بجے کا عمل رہا ہو گا۔ میں نے تھیلما سے یہ بھی کہا تھا کہ اسے گھر تک پہنچنے کے لیے بہت محتاط رہنا چاہئے اس لیے کہ دھند اور کہر کی وجہ سے وہ رات بے حد تاریک اور ہولناک تھی۔ بہر حال ایک بات میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت کوئی بھی شخص تھیلما کا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔"

اسی عرصے میں تھیلما کی اکڑی ہوئی لاش کو واشنگٹن کے ایک مردہ خانے میں بھجوا دیا گیا جہاں اس کا باقاعدہ پوسٹ مارٹم ہوا۔ پوسٹ مارٹم کرنے والے افسر نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔

"میں لاش کا بغور پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تھیلما کی موت تقریباً" ساڑھے دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ اس کے سر کی ہڈیاں ٹوٹ جانے اور خون کے خاصی مقدار میں بہہ جانے پر موت واقع ہوئی۔ اس بات کے آثار بھی پائے گئے کہ موت سے قبل قاتل نے اسے جنسی ہوس کا نشانہ بنایا۔"

پولیس اور سراغرسانوں نے اس خیال کے تحت کہ ممکن ہے تھیلما کی موت کسی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہو اور اس کے کسی ایسے جاننے والے نے اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا ہو جسے معلوم تھا کہ مقتولہ اس رات کس راستے سے گزرے گی۔ اس کے اسکول کے تمام ہم جماعت طلبہ اور ان لوگوں کی نگرانی شروع کر دی گئی جن سے تھیلما کا تھوڑا بہت بھی واسطہ رہا تھا۔ لیکن اس دن رات کی دوڑ دھوپ کے باوجود وہ قاتل کا کوئی سراغ نہ لگا سکے۔ جن کی نگرانی شروع کی گئی تھی ان میں سے نہ تو کسی کے پاس بھورے رنگ کا اوورکوٹ تھا اور نہ ہی ان کے ہاتھ قاتل کے ہاتھ سے ملتے تھے جس کا پلاسٹر والا نقش پولیس کی تحویل میں موجود تھا۔ چنانچہ ان تمام افراد کی نگرانی ختم کر دی گئی ——— پولیس نے دوسرا اقدام یہ کیا کہ ایسے تمام افراد کو جو جنسی جرائم میں ملوث رہ چکے تھے یا مشتبہ سمجھے جانے کی وجہ سے پولیس ریکارڈ پر موجود تھے زیر حراست لے کر ان سے پوچھ گچھ شروع کر دی لیکن اس بار بھی انہیں مایوسی ہوئی۔ سراغرسانوں نے اس علاقے کے گرد و نواح سے جہاں تھیلما کا قتل ہوا تھا۔ اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر بیس سے زیادہ ایسے افراد کو حراست میں لے لیا جن کا کوئی گھر بار نہیں تھا یا وہ غنڈا گردی کرتے پھرتے تھے مگر تھیلما کے قتل سے ان کا دور کا بھی واسطہ ثابت نہ ہوا۔ ان تمام افراد نے اس بات کے ٹھوس ثبوت فراہم کر دیئے کہ حادثے والی رات وہ کسی اور کام میں مصروف تھے۔ سراغرسانوں نے مکمل تفتیش اور دیئے ہوئے ثبوت کی تصدیق کرنے کے بعد ان افراد کو بھی چھوڑ دیا۔ یوں بھی ان میں سے کسی کا ہاتھ قاتل کے ہاتھ سے نہیں ملتا تھا۔

ابھی پولیس اور سراغرساں تھیلما کے کیس کو حل ہی کر رہے تھے کہ نئے سال (نیو ایرز) کے موقع پر ایک اور واقعہ پیش آیا۔ کسی نے ایک غیر آباد باڑے کو جو تھیلما

کو پیش آنے والے حادثے کے مقام سے بمشکل سو گز کے فاصلے پر تھا جلا کر خاک کر ڈالا۔ فائر بریگیڈ والوں کی کوششیں اسے بچانے میں بار آور ثابت نہ ہو سکیں۔ اس آتش زدگی کے سلسلے میں کانسٹیبل نے اپنے چیف سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ممکن ہے آتشزدگی کی وجہ آتش بازی رہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ نئے سال کی خوشی میں کچھ لڑکوں نے آتش بازی چھوڑی اور باڑے کو آگ لگ گئی۔ دوسری صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ ————"

"دوسری صورت میں یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ اس آتش زدگی کا کوئی تعلق تھیلما والے قتل سے بھی ہو۔" چیف نے کانسٹیبل کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کم از کم میرا ذاتی خیال یہی ہے لیکن فی الحال میں اس کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتا۔"

پولیس اور سراغرسانوں نے اس آتش زدگی کی وجہ معلوم کرنے کی خاطر پورے علاقے کے افراد سے پوچھ گچھ کی۔ لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ انہیں ایسا کوئی بھی سراغ نہ ملا جس کی بنیاد پر وہ آگ لگانے والے کے بارے میں کچھ جان سکتے۔

○

تھیلما کے بہیمانہ قتل کے سلسلے میں واشنگٹن کے عوام بڑے پر جوش نظر آ رہے تھے۔ اتنے پر جوش وہ پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے چنانچہ جب تھیلما کی لاش کو دفن کرنے کی رسوم شروع ہوئیں تو چرچ کے اندر تل دھرنے کی جگہ بھی نہیں تھی، اور ہزار ہا آدمی چرچ کے باہر خاموش کھڑے تھے۔ اس اندوہناک قتل کا سراغ لگانے کی خاطر لوگوں نے علیحدہ علیحدہ جماعتیں بھی بنا لی تھیں اور قاتل کی تلاش میں شب و روز مصروف تھے۔ ملک کے سارے اخبارات پہلے صفحے پر جلی سرخیوں کے ساتھ پولیس پر لعن طعن کر رہے تھے اور اس بات کا مطالبہ کر رہے تھے کہ قاتل کو جلد از جلد گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ اس سلسلے میں اب تک قاتل کی گرفتاری کے لئے دو ہزار پانچ سو ڈالر کی رقم بطور انعام مقرر کی جا چکی تھی۔

عوام کے بڑھتے ہوئے جوش و خروش اور سربرآوردہ افراد کی پر زور اپیل کے

پیش نظر شہر اور قصبوں کے تمام سراغرساں اور محکمہ پولیس کے افسران نے اپنی کوششوں میں مزید اضافہ کر دیا اور شب و روز قاتل کی تلاش میں سرگرداں نظر آنے لگے۔ انہوں نے بڑے پیمانے پر یہ اعلان کرائے کہ اگر کسی شخص کے پاس قاتل سے متعلق کوئی معمولی سے معمولی اطلاع بھی ہو یا انہیں کسی پر شبہ ہو تو اس کے بارے میں وہ پولیس کو فوری مطلع کریں۔ پولیس کی طرف سے اس اشتہار کے شائع ہوتے ہی بے شمار افراد نے اپنی اپنی اطلاعات سے پولیس اور سراغرسانوں کو آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ سراغرسانوں نے عوام کی طرف سے ملنے والی چھوٹی چھوٹی اطلاعوں کی بھی چھان بین کی لیکن ان کی تمام جدوجہد اور دوڑ دھوپ بیکار گئی۔

تھیلما کا قاتل ابھی تک قانون کی دسترس سے بالکل اسی طرح محفوظ تھا جس طرح وہ حادثے والی رات بدنصیب لڑکی کو قتل کرنے کے بعد محفوظ تھا۔

17 جنوری کو جبکہ تھیلما کے قتل کو پورے تین ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ واشنگٹن میں قتل کی ایک دوسری واردات سرزد ہو جانے سے سنسنی پھیل گئی۔ مقتول ایک نوجوان اور ہنس مکھ قسم کا خوب صورت آدمی تھا۔ اس کے لیے یہ بات بہت مشہور تھی کہ وہ جب بھی کہیں باہر جاتا اپنی امارت کا مظاہرہ کرنے کی خاطر جیب سے بڑے بڑے نوٹ نکال کر اپنے دوستوں اور واقف کاروں کو دکھاتا اور چھوٹے چھوٹے بلوں کی ادائیگی کے سلسلے میں بھی ہمیشہ بڑے نوٹ پیش کرتا۔ وقوعے والی شام اس نے اپنی منگیتر کے ساتھ اس کے گھر پر گزاری تھی جو اپنے والدین کے ساتھ صوبہ "کالوارما" میں رہتی تھی۔ جس وقت وہ اپنی منگیتر کے گھر سے رخصت ہوا اس کے کچھ دیر بعد ہی اسے مار ڈالا گیا۔ آلہ قتل لوہے کا ایک ٹھوس وزنی پائپ تھا ———— جو مقتول کی لاش کے قریب ہی پڑا ملا تھا۔ قاتل نے مقتول کی جیب سے سو ڈالر کی رقم اور دیگر قیمتی چیزوں کے علاوہ اس کی گھڑی بھی غائب کر دی تھی۔

ہر چند کہ قاتل کا مقصد محض مقتول کو قتل کر کے اسے لوٹنے سے تھا اور جنسی جرم کا اس سے دور کا بھی کوئی تعلق نہ تھا تاہم پولیس اور سراغرساں اس بات کے امکانی پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے مجبور تھے کہ اس نوجوان کا قاتل جو ان کے قیاس کے مطابق ایک تندرست و توانا شخص تھا کہیں وہی ظالم تو نہیں ہے جس نے تھیلما کو

بربریت کا نشانہ بنایا تھا۔

قرب و جوار کے رہنے والے بیشتر افراد نے پولیس کے اس موقف سے اتفاق کیا تھا۔ ان کا متفقہ خیال تھا کہ کوئی جنونی قاتل ان کے علاقے میں آزادانہ گھوم رہا ہے چنانچہ وہ اس درجہ خوفزدہ ہوئے کہ راتوں کو گھر سے باہر قدم نکالتے بھی گھبرانے لگے۔

بہر حال اس واقعے کے بعد پولیس اور سراغرسانوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی جد و جہد تیز کر دی بلکہ قاتل کی گرفتاری کے انعام کی رقم میں بھی اضافہ کر دیا گیا۔ انعام کے لالچ میں ملک کا ایک مشہور و معروف سراغرساں سلیٹر اوہایو سے واشنگٹن آیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ بہت جلد تھیلما کے قاتل کو گرفتار کرلے گا۔ چنانچہ واشنگٹن پہنچتے ہی اس نے بھی مقامی اخبارات میں بڑے بڑے اشتہارات دیے اور لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اس کے ہوٹل کے پتے پر قاتل سے متعلق اطلاعات فراہم کریں۔ مقامی پولیس اور سراغرسانوں نے بھی سلیٹر کے ساتھ بھرپور تعاون کیا لیکن نتیجہ اس بار بھی صفر ثابت ہوا اور ایک ہفتے بعد ہی سلیٹر قاتل کے مقابلے میں اپنی شکست تسلیم کر کے اوہایو مایوس واپس لوٹ گیا۔

وقت یونہی گزرتا رہا اور تب مارچ کے شروع میں ایک بروبار لیکن نوجوان عورت نے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر چیف ورڈربر سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اسے فوری طور پر چیف کے آفس تک پہنچا دیا گیا۔ عورت نے ورڈربر سے ملاقات کے درمیان اپنے شوہر کے بارے میں جو اسے چھوڑ چکا تھا اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

"میں بڑے یقین سے ساتھ کہہ سکتی ہوں جناب کہ میرا شوہر گزشتہ چند مہینوں میں متعدد ڈاکے اور لوٹ مار کے جرائم کا ارتکاب کر چکا ہے۔ ہرچند کہ میرے پاس ان باتوں کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے لیکن جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ حرف بحرف درست ہے۔"

پولیس چیف لفٹیننٹ جونز اور چیف ورڈربر کے علاوہ دوسرے سراغرسانوں کی رائے بھی عورت کے بیان کے بارے میں "غیری یقنی" تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ محض اپنے شوہر کو پریشانیوں میں مبتلا کرنے کی خاطر الٹے سیدھے بیان دے کر چلی گئی ہے۔ بہر حال انہوں نے اس اطلاع کی بھی چھان بین کی اور عورت کے شوہر کو جو

بیس سال کا ایک تندرست و توانا شخص تھا اور ان دنوں بیکار پھر رہا تھا' زیر حراست لے لیا۔ بعد میں جب اس پر سختی کی گئی اور بار بار پوچھ گچھ کی گئی تو عورت کی اطلاع درست ثابت ہوئی۔ بیس سالہ نوجوان نے پولیس کی سختیوں سے تنگ آکر اپنے تمام جرائم کا اقبال کرلیا۔ اس نے پولیس کو اپنے بیان میں بتایا کہ ابتک وہ متعدد ڈاکے اور کئی چھوٹے موٹے چوری چکاری کے جرائم کر چکا ہے۔ آخر میں اس نے اس بات کا اقبال بھی کر لیا کہ 7 جنوری کو صوبہ "کالوراما" میں جو نوجوان قتل ہوا تھا وہ بھی اسی کا شکار تھا۔ اس حادثے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں کئی بار اس امیر نوجوان کو بڑے بڑے نوٹوں کی نمائش کرتے دیکھ چکا تھا چنانچہ میں اس کی تاک میں لگا رہا اور موقع ملتے ہی میں نے لوہے کے پائپ کی ایک شدید ضرب سے اسے ہلاک کر دیا اور لوٹ کر فرار ہو گیا۔"

"اور اس نوجوان سے پیشتر تم نے تھیلما کو قتل کیا تھا ———— کیوں! ٹھیک ہے۔" چیف نے پوچھا۔

"نہیں ———— یہ بالکل غلط ہے۔" نوجوان نے احتجاج کیا۔ "میرا تھیلما کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ میں نے تو اسے اپنی زندگی میں کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔"

اپنے بیان کے ثبوت میں اس نے 29 دسمبر کی کہر آلود رات کے بارے میں تمام تفصیل سراغ رسانوں کو بتا دی۔ ان تفصیلات کی چھان بین کی گئی ———— سراغرساں اس کے بیان کو نہ تو ماننے کے لیے تیار تھے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی ایسا ٹھوس ثبوت تھا جس کی بنیاد پر وہ اسے تھیلما کے قتل کے جرم میں ملوث کر سکتے۔

نوجوان پر مزید سختیاں کی گئیں اور مختلف موقعوں پر مختلف سراغرسانوں نے اس سے پوچھ گچھ کی مگر نوجوان نے ہر بار یہ کہا تھا۔

میرا تھیلما کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ———— نہ میں نے اسے کبھی دیکھا تھا۔"

سراغرسانوں نے اسے 17 جنوری کو قتل ہونے والے نوجوان کے قاتل ہونے کی حیثیت سے عدالت کے روبرو پیش کر دیا جہاں اس کے اقبالی بیان کے پیش نظر

اسے سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا۔

جس وقت اسے بجلی کی کرسی پر بٹھا کر موت کی سزا دی جانے والی تھی اس سے ایک گھنٹے پیشتر پولیس چیف نے اس سے پھر ملاقات کی اور بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا تم آخری بار بھی نہ بتاؤ گے کہ تم تھیلما کے قاتل نہیں ہو ———؟"

"اب جبکہ میری موت میں صرف ایک گھنٹا باقی رہ گیا ہے ظاہر ہے میں آپ سے کچھ چھپانا پسند نہیں کرونگا" نوجوان نے بیحد اداس لہجے میں کہا۔ "اگر میں نے تھیلما کو قتل کیا ہوتا تو یقیناً" اس وقت اس جرم کا اقبال ضرور کر لیتا تا کہ مرتے وقت میرا ضمیر مجھے کسی بات کے لیے ملامت نہ کرے ——— میں اپنے خدا کو حاضر و ناضر جان کر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا اس لڑکی کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

جس وقت اسے بجلی کا سوئچ آن کر کے موت کے حوالے کیا گیا اس وقت بھی چیف وہاں موجود تھا۔ مرنے والے کے چہرے پر اس نے جو تاثرات دیکھے تھے اس کی بنا پر اسے اس بات کا یقین کامل ہو گیا کہ حقیقتہً" اس نوجوان کا تھیلما کی موت سے کوئی تعلق نہیں اور یہ کہ اس نے جو کچھ بیان دیا تھا وہ سچائی پر مبنی تھا۔ ہیڈ کوارٹر پہنچ کر چیف نے دوسرے بڑے افسران سراغرسانوں کو بھی اپنے خیالات سے آگاہ کر دیا۔

"تھیلما ینگ کا کیس ایک ایسا معمہ بن گیا ہے جس کا حل تلاش کرنے میں ہمیں مہینوں لگ جائیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کئی سال گزر جائیں اور ہم کوئی حال تلاش نہ کر سکیں۔" بر کیتل نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "بہر حال ہم اس فائل کو کبھی بند نہیں کریں گے خواہ صدیاں ہی کیوں نہ گزر جائیں ——— ہمیں چاہئے کہ جب بھی کوئی مجرم گرفتار ہو اس پر تھیلما کے قاتل ہونے کا شبہ بھی ضرور کیا جائے اس لیے کہ ہمارے پاس دو اہم ثبوت موجود ہیں۔ اوور کوٹ کا بٹن اور قاتل کے ہاتھ کا مکمل نشان کیا عجب ہے کہ اسی طرح ہم تھیلما کے قاتل کو ایک دن اچانک پالیں ——— ویسے بھی میرا اندازہ ہے کہ جس طرح قاتل نے تھیلما کو اپنی جنسی درندگی کا شکار بنایا تھا ایسی طرح وہ اور بھی جرم کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آئندہ قتل سے گریز کرے اور محض جنسی جرم کا ارتکاب کرے چنانچہ ہمیں ہر لمحے

محتاط رہنا چاہئے۔"

کانسٹیبل ملر نے اس موقع پر بتایا کہ وہ واحد شخص ہے جس کی ڈیوٹی صوبہ "کالوراما" میں کسی بھی دوسرے افسر کے مقابلے میں سب سے زیادہ رہی ہے اور یہ کہ وہ اس علاقے سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے۔

"جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں۔" ملر نے کہا۔ "جنسی درندگی کے بیشتر حادثات کی اطلاع پولیس تک نہیں پہنچنے پاتی۔ لڑکیاں یا عورتیں آگے آتے ہوئے گھبراتی ہیں۔ بہر حال میں اپنے تئیں کوشش کر رہا ہوں اور مجھے قوی امید ہے کہ میں ایسی کچھ لڑکیوں کا اعتماد حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا اور عین ممکن ہے کہ اسی طرح ہم تھیلما کے قاتل تک بھی پہنچ جائیں ———"

غرضیکہ پولیس اور سراغرساں مختلف طریقوں سے قاتل کی تلاش میں سرگرداں و پریشاں رہے لیکن ہر ہر مرحلے پر انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

تھیلما کے قتل کے سولہ ماہ گزر چکے تھے جب اپریل 1929ء میں پولیس چیف کو مینسفیلڈ (MANSFIELD) کے ایک اصلاحی ادارے کے وارڈن کی جانب سے ایک حیرت انگیز اطلاع موصول ہوئی۔ وارڈن نے اپنے خط میں تحریر کیا تھا کہ ایک شخص نے جو اس کے اصلاحی ادارے میں موجود ہے تھیلما کو قتل کرنے کا اقبال کر لیا ہے۔ جس نے اقبال جرم کیا تھا 25 سال کا ایک نوجوان اور ہیسٹبرگ کا رہنے والا تھا۔ اسے چوری کے الزام میں گرفتار کرنے کے بعد اصلاحی ادارے کے سپرد کیا گیا تھا۔ بہر حال وقت ضائع کیے بغیر اس نوجوان کو تھیلما کے قتل کے سلسلے میں تفتیش کی غرض سے مینسفلیڈ سے واشنگٹن لے جایا گیا۔

واشنگٹن آتے ہی وہ شخص جو تھیلما کے سلسلے میں بہت کچھ بتانے کے لیے مضطرب نظر آتا تھا پولیس اور سراغرسانوں کے ہمراہ اس مقام پر گیا جہاں تھیلما کو قتل کیا گیا تھا۔ اس نے پولیس کو بڑی تفصیل کے ساتھ وہ تمام واقعات بتائے جو تھیلما کے ساتھ پیش آئے تھے اور اخبارات میں بھی شائع ہو چکے تھے لیکن جب ان تفصیلات کے بارے میں جس کا ذکر اخبارات میں نہیں آیا تھا اور جس کا علم صرف پولیس اور سراغرسانوں کو تھا اس سے پوچھ گچھ کی گئی تو ان باتوں کا کوئی معقول جواب

نہ دے سکا۔ بعد میں جب اس سے اس اوورکوٹ کے بارے میں دریافت کیا گیا جو قاتل نے کہر آلود رات میں جرم کا ارتکاب کرتے وقت پہن رکھا تھا تو نوجوان نے بتایا کہ اس رات اس نے نیوی بلیو رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔

بعد کی تفتیش سے معلوم ہوا کہ اس نوجوان نے دسمبر 1927ء کو پورا مہینا اپنے گھر پر جو پیٹسبرگ میں واقع تھا گزارا تھا اور حالات کے پیش نظر یہ بات قطعی ناممکن تھی کہ وہ واشنگٹن کا سفر اور واپسی کے اخراجات برداشت کر سکتا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ نوجوان کے ہاتھ قاتل کے ہاتھ کے اس چربے کے مقابلے میں بہت چھوٹے تھے جو پولیس نے پلاسٹر پر محفوظ کر لیا تھا۔

پولیس کے ایک ماہر نے جب اس شخص کا نفسیاتی جائزہ لیا تو محض یہی نتیجہ اخذ کرنا پڑا کہ وہ "خود نمائی" کے مرض میں مبتلا ہے اور کسی بھی حیرت انگیز واقعے کو محض اس لیے اپنی ذات سے منسوب کرنے کے لئے آمادہ ہو سکتا ہے جو لوگوں کی توجہ اس کی شخصیت کی طرف مبذول کرا سکے۔ ماہر کی اس رپورٹ کے بعد یہ بات پائیہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ اس شخص نے اب تک جو باتیں بتائی تھیں وہ "وقتاً فوقتاً" اخبارات میں شائع ہو چکی تھیں دیگر باتوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا چنانچہ اسے اداہیو کے ذمے دار افسران کے پاس واپس بھیج دیا گیا اور پولیس اور سراغرساں اس کی طرف سے مایوس ہو کر ایک بار پھر تھیلما کے قاتل کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔

آنے والے برسوں میں بھی پولیس کو کچھ الٹی سیدھی اطلاعات ملتی رہیں اور کچھ ذہنی مریضوں نے تھیلما کے قتل کو اپنے سر لینے کی کوشش کی لیکن یہ تمام باتیں بیکار ثابت ہوئیں اور پولیس اور سراغرساں کسی آخری نتیجے پر نہ پہنچ سکے ———— تھیلما کا کیس فائل بدستور ان کے لیے ایک الجھن بنا رہا۔ اس عرصے میں کچھ افسران کا بھی تبادلہ ہو گیا جو تھیلما کے قاتل کو تلاش کرنے پر معمور کیے گئے تھے۔ پولیس اور سراغرساں اب اس کیس کی طرف سے بڑی حد تک مایوس ہوتے جا رہے تھے تاہم کانسٹیبل ملر ابھی تک پر امید تھا۔ آٹھ سال گزر جانے کے باوجود وہ بدستور صوبہ "کالوراما" میں تعینات رہا۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ تھیلما کے پر اسرار

قتل کے راز کو ضرور پالے گا۔ اسی غرض سے اس نے اپنے علاقے کے افراد سے بے تکلفی پیدا کر لی اور بیشتر عوام کو اپنے اعتماد میں لے لیا تھا۔

جنوری 1936ء میں کہیں ملر کی کوششیں بار آور ہونی شروع ہو گئیں۔ اب اسے اپنے ذرائع سے اس بات کی اطلاعات ملنی شروع ہو گئی تھیں کہ آئے دن رات کی تاریکی میں کوئی شخص کمسن لڑکیوں اور جوان عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتا رہتا ہے۔ اسے یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ مجرم لانبے قد اور بھاری تن و توش کا مالک ہے۔ اس کی اطلاع کے مطابق کچھ ایسی خوش قسمت لڑکیاں بھی اس علاقے میں موجود تھیں جو حسن اتفاق سے مجرم کے ہاتھوں سے بچ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھیں جبکہ دوسری لڑکیوں کو اس کی خواہشات کی تکمیل کرنی پڑی تھی لیکن ایسی لڑکیاں شرم کے مارے کھل کر سامنے آنے سے گریز کرتی تھیں۔ انہیں خطرہ تھا کہ انہوں نے مجرم کے بارے میں پولیس کو کوئی اطلاع بہم پہنچائی تو وہ نہیں قتل کر دے گا۔

بہر حال، ملر ایسی دو لڑکیوں کو تلاش کر کے اپنے اعتماد میں لینے میں کامیاب ہو گیا جنہوں نے مجرم کو اس مقام پر مشتبہ حالت میں گھومتے پھرتے دیکھا تھا جہاں تھیلما کو قتل کیا گیا تھا۔ ان لڑکیوں نے بھی یہی بتایا تھا کہ مجرم لانبے قد اور مضبوط قوی کا مالک ہے لیکن وہ اس کی شکل کو اس لئے نہ دیکھ سکی تھیں کہ مجرم نے اپنے اوورکوٹ کے کالر کو اس حد تک اوپر اٹھا رکھا تھا کہ اس کے چہرے کا بیشتر حصہ اس میں چھپ گیا تھا۔ اس کے سر پر جو ٹوپی تھی اس کا اگلا سرا بھی پیشانی پر اس قدر جھکا ہوا تھا کہ اس کی نگاہیں بمشکل نظر آ سکیں۔ ان اطلاعات کو جمع کرنے کے بعد ملر نے کچھ سراغرسانوں کو بھی مدد کی خاطر اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ طے شدہ پروگرام کے تحت تاریک راتوں میں سراغرساں عورتوں کے میک اپ میں اس علاقے میں گئے جہاں تھیلما کو قتل کیا گیا تھا لیکن وہ مجرم کو اپنے جال میں پھانسنے میں ناکام رہے۔ مجرم نے ایک بار بھی ان پر جھپٹنے کی کوشش نہیں کی جبکہ سراغرسانوں کو قوی امید تھی کہ ویران اور تاریکی رات میں کسی تنہا اور خوبصورت عورت کو دیکھ کر مجرم کی رال اس پر ضرور ٹپکے گی اور وہ اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لئے بے چین ہو کر سامنے آ جائے گا مگر ان کے تمام حربے بیکار ثابت ہوئے۔

ان ہی دنوں پولیس کو اطلاع ملی کہ ایک شخص نے پیٹسبرگ کے قریب ایک ہوٹل کی حسین ملازمہ پر حملہ کر کے اس وقت اپنی جنسی خواہش کا ہدف بنانے کی کوشش کی تھی جب وہ ہوٹل میں تنہا تھی۔ لیکن بعد میں وہ کچھ لوگوں کی آہٹ پا کر فرار ہو گیا تھا۔ ملازمہ نے بھی اس حملہ آور کو لانبے قد اور بھاری تن و توش کا مالک بتایا تھا۔ ہرچند کہ وہ گھبراہٹ کی وجہ سے اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ کسی ایسے شیڈ میں مزدوری کرتا ہے جو پنسلوانیا ریلوے لائن کے دونوں اطراف میں واقع ہیں۔

اس واقعے کی اطلاع ملنے کے کچھ دن بعد واشنگٹن میں ایک اور لڑکی پر مجرمانہ حملہ کیا گیا لیکن اس بار مجرم کی ہوس کا شکار ہونے والی لڑکی نے شرمانے اور خوفزدہ ہونے کے بجائے ملر سے مل کر اسے حالات کی مکمل تفصیل بتا دی۔

"میں رات کو ای۔ ویران اور تاریک حصے سے ہو کر جلد از جلد گھر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی جب اچانک ایک لانبے قد کا بھاری بھرکم شخص جو غالباً" وہاں پہلے ہی سے جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا لپک کر میرے قریب آیا اور مجھے گلے سے دبوچ لیا پھر وہ بڑی بے دردی سے گھسیٹتا ہوا مجھے ٹیلیفون کے ایک کھمبے تک لے گیا اور دیوانگی کی حالت میں اس نے میرے سر کو کھمبے سے ٹکرا دیا جس کے بعد میں غالباً" بے ہوش ہو گئی تھی ———" لڑکی نے ایک ثانئے خاموش رہ کر دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"جب میں ہوش میں آئی تو میں نے خود کو زمین پر برہنہ پڑا پایا اور مجرم کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھا جو غالباً" دوسری بار اپنی خواہش پوری کرنا چاہتا تھا ——— اس نے جب مجھے آنکھ کھولتے دیکھا تو بڑی خطرناک آواز میں اس بات کی تنبیہہ کی کہ اگر میں نے اس کے بارے میں کسی کو کچھ بتایا تو وہ مجھے بڑی بے دردی سے قتل کر دے گا ——— مجھے ڈرانے دھمکانے کے بعد اس نے اپنی خواہشات کی تکمیل کی پھر مجھے خونخوار نظروں سے گھورتا ہوا چلا گیا ——— اس کے جانے کے خاصی دیر بعد تک میں خوفزدہ انداز میں دم سادھے پڑی رہی پھر میں نے اٹھ کر ڈرتے ڈرتے اپنے کپڑے پہنے اور لرزتے کانپتے قدموں سے گھر کی طرف دوڑنا شروع

کر دیا۔"

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ پوری طرح سے تمہاری حفاظت کی جائے گی۔" ملر نے اس لڑکی کو جو ایک ادارے میں میٹرن کے فرائض انجام دیتی تھی پولیس کے مکمل تحفظ کا یقین دلاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم اس شخص کو دوبارہ دیکھنے پر بہ آسانی پہچان سکتی ہو ———"

"ہاں ———" میٹرن نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں اسے پہلے بھی دیکھ چکی ہوں۔ وہ اسی علاقے میں ایک مدت سے رہتا ہے۔ اس کے نام کا پہلا لفظ غالباً" بوب یا پھر رابرٹ ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ریلوے یارڈ میں ملازمت بھی کرتا ہے ——— اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں جانتی۔ لیکن کیا میں اس بات کا یقین رکھوں کہ میرا نام پوشیدہ رکھا جائے گا۔"

"میں تمہیں اس کا مکمل یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا نام کبھی درمیان میں نہ لایا جائے گا۔"

میٹرن کے لئے باقاعدہ باڈی گارڈ مقرر کر دینے کے بعد ملر نے خاموشی سے ان اطلاعات پر کام کرنا شروع کر دیا جو اسے ملی تھیں۔ اسے پولیس کے اعلیٰ افسران اور چوٹی کے سراغرسانوں کی مدد حاصل تھی۔ یہ میٹرن کی دی ہوئی اطلاع کے بعد چیف ڈلسمور کو بھی جو ریٹائر ہو چکا تھا دوبارہ بلا لیا گیا اور اس سے درخواست کی گئی کہ وہ بھی تھیلما کے قاتل کی گرفتاری کے سلسلے میں دوسرے افسران کا ہاتھ بٹائے۔ چنانچہ ملر نے ان تمام افسران کے ساتھ مل کر بڑے محتاط انداز میں میٹرن سے ملی ہوئی اطلاعات کی چھان بین شروع کر دی اور جلد ہی اس بات کا پتا چلا لیا کہ وہ خطرناک آدمی جس کا نام اور حلیہ میٹرن نے بتایا تھا وہ سوائے "رابرٹ ڈریمر" کے اور کوئی نہیں تھا۔

رابرٹ ڈریمر ایک بھاری بھرکم اور لانبے قد کا آدمی تھا۔ اس کی عمر اڑتیس سال کی تھی اور وہ ریلوے یارڈ میں ملازمت بھی کرتا تھا۔ اس کا قیام واشنگٹن میں تھا لیکن وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں روزانہ اس علاقے تک آتا جاتا تھا جہاں تھیلما کو قتل کیا گیا تھا۔ رابرٹ ڈریمر کو تلاش کر لینے کے بعد پولیس اور سراغرسانوں نے اس

کی بیوی سے گفت و شنید کی جسے رابرٹ نے تقریباً دو سال سے چھوڑ رکھا تھا یہ ملاقات سراغرسانوں کے لئے بے حد سودمند اور مفید ثابت ہوئی۔

"ہماری زندگی ایک ایسے مقام پر پہنچ چکی تھی ہاں میں کسی طرح اس مکان میں نہیں رہ سکتی تھی جس میں میرا شوہر بھی موجود ہو۔" رابرٹ کی بیوی نے سراغرسانوں کو بتایا۔ "دراصل میرے ڈاکٹر نے مجھے یہ مشورہ دیا تھا کہ اگر میں چاہتی ہوں کہ میری صحت ٹھیک رہے تو مجھے اپنے شوہر سے دور رہنا پڑے گا۔ اس مشورے کی وجہ معقول ہی تھی۔ جنسی معاملات میں میرا شوہر دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ کبھی کبھی تو میرے انکار پر وہ مشتعل ہو کر مجھے قتل کر ڈالنے کی دھمکی تک دے بیٹھتا تھا چنانچہ جب تک میری صحت ٹھیک رہی میں روزانہ اس کی خواہشات کی تکمیل کرتی رہی پھر ڈاکٹر کے مشورے پر مجھے علیحدہ ہونا پڑا۔ اکثر وہ میرے انکار پر رات رات بھر گھر سے غائب رہتا تھا اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ عورت کی طلب میں کیا کچھ کیا کرتا تھا۔ ممکن ہے اپنی جنسی دیوانگی سے مجبور ہو کر اس نے کچھ لڑکیوں کو بھی اپنی درندگی کا نشانہ بنایا ہو۔"

سراغرسانوں کے سوالات کے جواب میں اس نے مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

"ڈریمر کے افسران نے اس کا تبادلہ 1933ء میں کارنج کے مقام پر کر دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ دسمبر 1927ء کے دوران وہ واشنگٹن کے ریلوے یارڈ میں تعینات تھا۔ اس کے پاس آٹھ سال قبل بھورے رنگ کا ایک اوورکوٹ بھی تھا۔ لیکن تھیلما ینگ کی موت کی اطلاعات اخبارات میں شائع ہوتے ہی اس نے وہ اوورکوٹ نہ جانے کیا کیا ——— ہاں مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ بھورے رنگ کے اوورکوٹ سے نجات حاصل ہوتے ہی اس نے دوسرا اوورکوٹ خرید لیا تھا۔"

ان تمام اطلاعات کے بعد سراغرسانوں کی ٹیم اس گھر پر پہنچی جہاں ڈریمر اپنے ایک عزیز کے ساتھ مقیم تھا۔ ڈریمر کے عزیز نے بتایا کہ وہ حسب معمول آج بھی اپنے کام پر کارنج گیا ہوا ہے اور چھ بجے والی ٹرین سے واپس آئیگا۔ چنانچہ سراغرسانوں نے پہلے ڈریمر کے عزیز کی نگرانی پر چند افسران کو معمور کیا پھر وہ پولیس

کی ایک مسلح جماعت لے کر واشنگٹن کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تاکہ ڈریمر کو گرفتار کیا جا سکے۔

ٹھیک چھ بجے کارنج سے آنے والی ٹرین اسٹیشن پر پہنچی پھر جیسے ہی ڈریمر نے پلیٹ فارم پر قدم رکھا سادہ لباس میں گھومنے والے افسران نے اسے اپنے گھیرے میں لے کر کہا۔

"مسٹر ڈریمر ——— تم اپنے آپ کو گرفتار سمجھو۔"

ڈریمر نے پولیس کے اس اقدام پر نہ تو کسی مزاحمت کا مظاہرہ کیا نہ ہی اس نے کسی بوکھلاہٹ کا ثبوت دیا۔ اس نے عجیب انداز میں اپنے شانے اچکاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ میری بیوی میرے لئے کچھ دشواریاں پیدا کر رہی ہے اور مجھے کسی مصیبت میں پھنسانا چاہتی ہے ——— لیکن ...... کیا کبھی میں نے اسے اخراجات دینے کے سلسلے میں پریشان کیا ہے۔"

سراغرسانوں نے اس کی بات کا کوئی جواب دینے کے بجائے سب سے پہلے اسے ہتھکڑی پہنائی پھر اسے لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔ اس بات کو انہوں نے خاص طور پر نوٹ کیا تھا کہ ڈریمر کا قد چھ فٹ دو انچ سے کم نہیں تھا اور اس کا وزن دو سو پونڈ سے کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتا تھا وہ بھاری بھرکم تن و توش کا مالک تھا۔

ڈریمر کو حوالات میں بند کرنے کے بعد ایسی بے شمار لڑکیوں اور نوجوان عورتوں کو وہاں لایا گیا جنہوں نے ابھی تک خوف کے مارے اس کے بارے میں پولیس کو کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ سب سے پہلے میٹرن نے ڈریمر کو شناخت کیا پھر ہوٹل کی ویٹرس نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ ڈریمر ہی وہ شخص ہے جس نے اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی ان دونوں کے علاوہ اور بھی بہت ساری لڑکیوں اور عورتوں نے ڈریمر کو پہچان لیا تھا۔

رابرٹ ڈریمر اس شناختی پریڈ سے بوکھلا گیا تھا۔ لیکن جب اسے پوچھ گچھ کے لئے علیحدہ کمرے میں لے جایا گیا تو اس نے اقبال جرم کرنے کے بجائے جرم کی صحت کو ماننے سے انکار کر دیا۔

"میں اس رات اپنے مکان سے ایک لمحے کے لئے بھی باہر نہیں نکلا تھا۔" اس نے کہا۔ "دھند اور کہر اس قدر زیادہ تھی کہ میرے باہر جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔"

"بہت خوب مسٹر ڈریمر۔" چیف ڈلسمور نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "ہرچند کہ اس حادثے کو آٹھ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے پھر بھی تمہیں یہ بات یاد ہے کہ وہ رات دھند اور کہر میں ڈوبی ہوئی تھی جس رات تھیلما کو قتل کیا گیا تھا ——— میں واقعی تمہاری یادداشت کی داد دیتا ہوں۔"

پوچھ گچھ کا یہ سلسلہ کئی گھنٹوں تک جاری رہا ——— ڈریمر بار بار اپنے بے گناہ ہونے کا یقین دلاتا رہا لیکن جب سراغرسانوں نے اس پر سوالات کی بھرمار کر دی تو اس کی قوت مدافعت رفتہ رفتہ جواب دینے لگی۔ بعد میں اس کے ہاتھ کو جب اس نشان سے ملایا گیا جو پلاسٹر پر محفوظ تھا تو دونوں ہاتھ ایک ہی جیسے ثابت ہوئے۔

"یہ کوئی ثبوت نہیں ہے۔" ڈریمر جذباتی انداز میں چلا کر بولا۔ "تم محض اس نشان کے ثبوت پر مجھے قاتل نہیں ٹھہرا سکتے۔"

"مسٹر ڈریمر ——— ہمارے پاس ایک ثبوت اور بھی ہے۔" کانسٹیبل ملر نے سامنے آتے ہوئے کہا پھر اس نے وہ بٹن جو اسے تھیلما کی لاش کے قریب سے ملا تھا جیب سے نکال کر ڈریمر کی نگاہوں کے سامنے رکھ دیا جس میں تھوڑا سا دھاگا بھی نظر آ رہا تھا۔

ڈریمر اس بٹن پر نظر پڑتے ہی گنگ ہو گیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے یوں گھورنے لگا جیسے بٹن کے سامنے آ جانے سے اس پر عمل تنویم کا اثر ہو گیا ہو۔ کچھ دیر تک بٹن کو گھورتے رہنے کے بعد بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا۔

"تو آخر یہ بٹن تم لوگوں کے ہاتھ لگ گیا تھا .... آہ! میں محض اسی کو تلاش کرنے کی خاطر متعدد بار اس مقام پر گیا تھا اور گھنٹوں اسے ڈھونڈنے کی خاطر ادھر ادھر بھٹکتا رہتا ——— مجھے شبہ تھا کہ یہی گمشدہ بٹن تھیلما کے قتل کو میری ذات سے منسوب کر سکتا ہے۔ اس بٹن نے مجھے بڑی اذیتیں پہنچائی ہیں۔ میں اب اپنے تعاقب سے تھک چکا ہوں میرے اعصاب جواب دے گئے ہیں اور اب میں مز

حیل و حجت کے بغیر اقبال جرم کر لیتا ہوں۔

بٹن کو دیکھنے کے بعد ڈریمر نے ڈرامائی طور پر اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ سراغرسانوں کو بتایا کہ کس طرح وہ اس کہر آلود رات میں جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا اور پھر کس طرح اس نے تھیلما کو ادھر سے گزرتا دیکھ کر اس پر حملہ کیا اور اپنی جنسی درندگی کا نشانہ بنایا تھا۔

نئے سال کی رات میں باڑے میں لگنے والی آگ کے بارے میں جب ڈریمر سے سوال کیا گیا تو اس نے کہا۔

"باڑے میں آگ لگانے کا جرم بھی مجھ سے ہی سرزد ہوا ہے میں نے اپنے بھورے رنگ کے اوورکوٹ کو اور ان تمام کپڑوں کو جو تھیلما کے خون کے دھبوں کی وجہ سے کسی وقت بھی مجھے قاتل ثابت کر سکتے تھے وہاں لے جا کر انہیں پٹرول سے تر کیا پھر ان میں آگ لگا دی۔ میں نے یہ اقدام محض اس لیے کیا تھا کہ میرے خلاف گواہی دینے والے تمام ثبوت ضائع ہو جائیں ——— لیکن .... دو چیزیں ایسی باقی رہ گئیں جنہوں نے آخرکار مجھے مجرم ثابت کرا دیا ——— ایک میرے ہاتھ کا نشان جسے میں جلدی کی وجہ سے دیکھنا اور مٹانا بھول گیا تھا۔ اور دوسرا میرے اوورکوٹ کا بٹن جو تلاش بسیار کے باوجود مجھے نہیں مل سکا تھا ———"

"ڈریمر کے اقبال جرم کر لینے کے بعد اسے عدالت کے سپرد کر دیا گیا جہاں آٹھ ممبران پر مشتمل جیوری نے اسے قتل عمد کا مجرم گردانتے ہوئے موت کی سزا سنا دی۔ چنانچہ رابرٹ ڈریمر کو اس کی گرفتاری کے صرف چار ماہ بعد یکم فروری 1937ء کو پھانسی دے دی گئی ——— اور اس طرح آٹھ سال کی طویل مدت تک پولیس اور سراغرسانوں کی غیر معمولی تگ و دو اپنے انجام کو پہنچی۔ تمام قومی اخبارات نے کانسٹیبل ملر کی مساعی کو بطور خاص خراج تحسین پیش کیا۔

○

اندر کا انسان

شہباز گڈس ٹرانسپورٹ کا ڈیوہیکل لوڈنگ ٹرک پختہ اور بل کھاتی سڑک پر بڑی تیزی سے اپنی منزل مقصود کی سمت فراٹے بھر رہا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب یا تو چٹیل میدان تھے یا پھر اونچی نیچی سنگلاخ پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ دور دور تک کسی آبادی کا نشان نہیں تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص ہر چند کہ تنہا تھا لیکن پوری طرح مستعد اور چوکس نظر آ رہا تھا۔ اس کے کھردرے اور مضبوط ہاتھ نہایت چابک دستی سے اسٹیرنگ کنٹرول کر رہے تھے۔ تیور بتا رہے تھے کہ وہ کسی بھی آنے والے خطرے سے نبرد آزما ہونے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ اس کی چمک دار عقابی نظریں بار بار عقبی شیشے کی جانب اٹھ رہی تھیں جس میں سڑک تیزی کے ساتھ پیچھے بھاگتی نظر آ رہی تھی۔

اسے دولت نگر سے روانہ ہوئے پورے دو گھنٹے گزر چکے تھے اور رام گڑھ تک پہنچنے کے لیے ابھی تین گھنٹے درکار تھے۔ اس کا اندازہ تھا کہ اگر راستے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی تو وہ سورج ڈھلنے سے کافی پہلے اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔ جہاں اسے ٹرک میں لدے ہوئے مال کی ڈلیوری استاد پیڈرو کو دینا تھی۔ وہ پہلے بھی متعدد بار اس روٹ پر سفر کر چکا تھا لیکن آج خلاف توقع کچھ زیادہ ہی محتاط نظر آ رہا تھا۔ اگلا ایک گھنٹا تو خیریت سے گزر گیا پھر ایک موڑ کاٹتے ہوئے اسے ٹرک کی رفتار کم کر دینا پڑی۔ تقریباً" پچاس گز کے فاصلے پر ایک پولیس جیپ سڑک کے بیچوں بیچ راستہ روکے کھڑی تھی۔ جیپ کے آگے ایک باوردی آفیسر ہاتھ میں بید لیے موجود تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو سپاہی رائفل تانے کھڑے تھے۔ رحمت دین نے جسے لوگ رحیمو کے نام سے پکارتے تھے۔ پہلی ہی نظر میں اس آفیسر کو پہچان لیا جو ترپاٹھی کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ رحیمو اور ترپاٹھی دونوں ایک دوسرے سے بخوبی واقف تھے۔ کاروباری سمجھوتے کے مطابق ترپاٹھی اور دوسرے افسروں کو چونکہ باقاعدہ بھتا ملتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے فرائض کی انجام دہی سے ہمیشہ نظریں چرا لینے کے عادی بن چکے تھے لیکن آج ترپاٹھی کے تیور کچھ اور ہی تھے۔ بات یقیناً" اہم تھی۔ ورنہ وہ اس طرح راستہ روک کر کبھی نہ کھڑا ہوتا۔ رحیمو نے ایک خاص انداز میں دوبار ہارن بجایا پھر اسے ترپاٹھی سے کچھ فاصلے پر ٹرک روک دینا پڑا لیکن وہ نیچے نہیں اترا۔ اپنی سیٹ پر ہی جما بیٹھا رہا۔ اس نے انجن بند کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ ترپاٹھی ٹرک رکتا دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھا لیکن دونوں سپاہی بدستور جیپ کے قریب ہی کھڑے رہے۔

"کیا بات ہے ترپاٹھی جی؟" ترپاٹھی کے قریب آنے پر رحیمو نے گردن باہر نکالتے ہوئے پوچھا "راستہ روکے کھڑے ہو' کوئی خاص معاملہ جان پڑتا ہے۔ کس کی تلاش ہے؟"

"ہے ایک شکار" ترپاٹھی نے رحیمو کو بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"شکار اور یہاں روڈ پر ...." رحیمو نے بھونڈے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ "شکار تو جنگل میں ہوتے ہیں۔ تم شاید مسکری کر رہے ہو ...."

"میں پوری طرح سنجیدہ ہوں .... ہمیں جس شکار کی تلاش ہے۔ وہ روڈ پر ہی ملے گا ...."

"ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

"نیچے اتر کر ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔" ترپاٹھی نے افسرانہ شان کا اظہار کیا۔ "ہم ٹرک کی تلاشی لیں گے۔"

"کیوں؟" رحیمو نے رازداری سے دریافت کیا "کیا بھتا نہیں پہنچا ٹیم پر۔"

"بکومت۔" ترپاٹھی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا "ہم تمہارے مال کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔"

"مال کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے تو تلاشی کس بات کی لو گے؟" رحیمو نے حیرت سے

پوچھا۔

”ہمیں ایک آدمی کی تلاش ہے۔“

”آدمی کی“ رحیمو نے پلکیں جھپکائیں ”جرور کوئی کھترناک مجرم ہو گا۔“

”تم شاید اسے جانتے بھی ہو۔“ ترپاٹھی نے رحیمو کو معنی خیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا ”میں بختاور کی بات کر رہا ہوں۔ تمہارے ہی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ کچھ لوگ اسے نیل کنٹھ کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔“

”نیل کنٹھ“ رحیمو بولا ”میں خوب جانتے ہوں اسے .... پر آج کل تو وہ جیل کاٹ رہا ہے۔ استاد بتا رہا تھا کہ اس کی سزا بہت جلد ختم ہونے والی ہے۔“

”بیس روز باقی تھے اس کی رہائی میں لیکن ....“

”لیکن کیا؟“ رحیمو نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”وہ جیل سے فرار ہو گیا ہے۔ پولیس کو اسی کی تلاش ہے۔“

”پھرار ہو گیا!“ رحیمو نے تعجب کا اظہار کیا پھر تعریفی انداز میں کہا ”تمہارا کانون چاہے کچھ بھی کہے پر بختاور ہے بڑا جی دار بندہ .... سنا ہے اس نے گاؤں کے کھیا کی ناک استرے سے اڑا دی تھی۔“

”جیل سے فرار ہونا کوئی چھوٹا موٹا جرم نہیں ہے‘ پکڑا گیا تو قانون اس کی ساری جی داری دوسرے راستے سے نکال دے گا۔“ ترپاٹھی نے بید ہلاتے ہوئے جواب دیا پھر تیزی سے بولا۔ ”چلو نیچے اترو ہمیں ٹرک کی تلاشی لینا ہے۔ اوپر سے بڑے سخت احکامات صادر ہوئے ہیں۔“

”صبح ہو جائے گی ترپاٹھی جی تلاشی لیتے لیتے“ رحیمو بولا ”میرا مطلب یہ ہے کہ ٹرک لبالب حلق تک بھرا ہے۔ تمہارے دو تین بندے سامان اتارنے چیں بول دیں گے۔“

”بکواس مت کرو۔ ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ کہیں مال کے اندر بختاور تو نہیں چھپا بیٹھا۔ چلو اتر کر پچھلا حصہ کھولو۔ ہمیں اور بھی کام بھگتانے ہیں۔“

”استاد کو یہ بات پسند نہیں آئے گی“ اس بار رحیمو نے بھی قدرے خشک لہجہ اختیار کیا ”ترپال کے نیچے کیا دبا ہے‘ اسے دبا ہی رہنے دو۔ بھتا بھی اسی بات کا دیا جاتا

ہے۔ تمہارے کارندے بھیتر (اندر) کا راج جان گئے تو ان کی رال جیادہ ٹپکنے لگے گی اور پھر بختاور سے ہمارا کیا کام؟ استاد کھرا کام کرنے کا عادی ہے۔ دوسرے کے پھڈے میں پیر نہیں پھنساوے ہے۔“

”میں جانتا ہوں شہباز خان کو لیکن ہمیں اوپر بھی جواب دہی کرنا پڑتی ہے۔“ ترپاٹھی نے سپاٹ آواز میں کہا۔ رحیمو نے جو بات کہی تھی وہ بھی اسے سمجھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کل دو سپاہی تھے جو ٹرک میں لدے مال کو نہیں اتار سکتے تھے۔ وہ تو بس خانہ پری کرنا چاہتا تھا اور خانہ پری کی آڑ میں اپنی جیب گرم کرنے کا خواہش مند بھی تھا۔

”یہاں تو بس تم ہی تم ہو۔ اوپر والا کون بیٹھا ہے روک ٹوک کرنے کو ———“ رحیمو نے کہا ”اگر سورج ڈھلنے سے پہلے ٹرک رام گڑھ تک نہ پہنچا تو استاد اوپر سے نیچے تک سب کو کھنگال کر رکھ دے گا۔“

”تم نہیں سمجھتے رحیمو۔“ ترپاٹھی نے چارا ڈالتے ہوئے کہا ”میں اکیلا ہوتا تو اور بات تھی لیکن نچلے عملے کے لوگ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔“

”تم شاید ان کا منہ بند کرنے کی بات کر رہے ہو۔“

”ہر شخص کو اپنی اپنی مجبوری ہوتی ہے لیکن تم نہیں سمجھ رہے۔“

”رحیمو سب سمجھے ہے ترپاٹھی جی۔“ رحیمو نے حقارت سے کہا پھر جیب سے تین بڑے بڑے اور کرارے نوٹ نکال کر ترپاٹھی کی سمت بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اپنے آدمیوں سے بولو کہ ٹرک کا راستہ صاف کر دیں پر ایک بات کا خیال رکھنا۔ استاد حساب کتاب کے معاملے میں کسی سے لحاظ مروت نہیں کرتا۔“

”میں شہباز خان کو سمجھا دوں گا۔“ ترپاٹھی نے نوٹ لے کر جلدی سے جیب میں اڑستے ہوئے کہا ”ہر معاملے میں اونچ نیچ کی گنجائش بھی رکھنی پڑتی ہے اور پھر دوستوں کا حساب کتاب تو دل میں ہوتا ہے۔“

رحیمو نے جواب دینے کے بجائے یوں اثبات میں سر کو جنبش دی جیسے وہ ترپاٹھی کی بات سمجھ گیا تھا لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اگر اسے وقت کی نزاکت کا احساس نہ ہوتا تو شاید وہ ایک دمڑی بھی جیب سے نہ نکالتا لیکن حالات کے پیش نظر

وہ خون کے گھونٹ پینے پر مجبور تھا پھر ترپاٹھی کے اشارے پر جیپ ٹرک کے درمیان سے ہٹی تو اس نے گیئر تبدیل کیا اور دل ہی دل میں موٹی سے گالی دیتا ہوا اپنے راستے پر ہو لیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے عقبی شیشے پر نظر ڈالی' پولیس جیپ دوسرا شکار پھانسنے کے لیے دوبارہ سڑک کے درمیان کھڑی کر دی گئی تھی۔

رحیمو آہستہ آہستہ ٹرک کی رفتار تیز کرتا جا رہا تھا۔ اس کی عقابی نظریں ایک بار پھر سامنے سڑک پر جم کر رہ گئی تھیں لیکن پشت سے ہلکے سے کھٹکے کی آواز سن کر وہ چونک اٹھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ چوبی تختے کی وہ مختصر سی خلا کھلی ہوئی تھی جس کے ذریعے رحیمو اکثر پشت کے حصے کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ اس خلا کو کھولنے کے لیے دونوں طرف ایک ایسا نظام موجود تھا جس کے ذریعے لکڑی کا ایک چوکور حصہ اپنی جگہ سے ہٹ کر خلا پیدا کر دیتا تھا۔ دوسری جانب نظر آنے والے انسانی چہرے کو دیکھ کر رحیمو کی پیشانی پر بل نمایاں ہو گئے لیکن اس نے زبان سے اظہار نہیں کیا۔

"کیا خطرہ ٹل گیا؟" خلا کی دوسری جانب سے سپاٹ لہجے میں سوال کیا گیا۔

"رام گڑھ کے حدود میں داخل ہونے سے پیشتر ہمیں چنگی کی چوکی سے بھی گزرنا ہو گا۔" رحیمو نے نہایت شستہ زبان اور بدلے ہوئے انداز میں جواب دیا "ممکن ہے وہاں بھی پولیس کے افراد موجود ہوں۔"

"ٹرک کس نے رکوایا تھا۔"

"پولیس سب انسپکٹر ترپاٹھی نے۔" رحیمو نے مختصراً" کہا۔

"وجہ؟"

"پولیس کو تمہاری تلاش ہے۔"

"حیرت ہے۔"

"اس میں حیرت اور تعجب کی کیا بات ہے؟" رحیمو بولا "تم نے جیل سے فرار ہو کر بہرحال قانون شکنی کی ہے۔ جیل کے حکام کی عزت کا معاملہ ہے۔ اس لیے پولیس کو چوکس کر دیا گیا۔"

"کیا سب انسپکٹر نے میرا نام لیا تھا؟"

"ہاں ...... پولیس کو تمہارے نام کے علاوہ یہ بھی معلوم ہے کہ نیل کنٹھ اور

بختاور ایک ہی شخص کے دو روپ ہیں۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو ......"

"کیا تم میری وجہ سے خوفزدہ ہو۔" بختاور نے روکھے لہجے میں سوال لیا۔

"جو لوگ غیر قانونی دھندے کرتے ہیں۔ وہ خطرات سے کھیلنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اگر میں خوفزدہ ہوتا تو اس کاروبار میں کبھی شامل نہ ہوتا۔"

"شہباز خان نے بھی یہی بتایا تھا کہ تم نڈر اور بے خوف آدمی ہو۔"

"استاد نے بتایا تھا کہ بیس روز بعد تم جیل سے رہا ہونے والے تھے۔" رحیمو نے بختاور کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ——— میری سزا پوری ہونے میں صرف بیس دن اور باقی تھے۔"

"پھر تمہیں فرار کا راستہ اختیار کرنے کی کیا جلدی تھی؟"

"میں نے جیلر سے دو روز کی چھٹی مانگی تھی۔" بختاور نے پرسکون آواز میں جواب دیا "اگر وہ میری درخواست نامنظور نہ کرتا تو مجھے فرار ہونے کی ضرورت پیش نہ آتی۔"

"کیا کوئی بہت اہم کام درپیش تھا؟"

"ہاں ...... ہے کچھ ایسی ہی بات۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟" رحیمو نے بل کھاتی سڑک کی مناسبت سے آہستہ سے اسٹیرنگ کو بائیں جانب گھماتے ہوئے دریافت کیا۔

"اگر پولیس اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تو اور بات ہے ورنہ دو روز بعد میں خود جیلر کے سامنے پیش ہو جاؤں گا۔"

"کیا مطلب؟" رحیمو چونکا "کیا تمہارا خیال ہے کہ جیلر کے روبرو پیش ہو جانے کے بعد قانون تمہیں جیل سے فرار ہونے کی سزا نہیں دے گا؟"

"یہ سوچنا میرا نہیں پولیس کا کام ہے۔" بختاور نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"میرا ایک مشورہ مانو گے؟"

"کہو۔"

"اب تم جیل سے فرار ہو گئے ہو تو کچھ دنوں کے لیے روپوش ہی رہو۔ پکڑے جانے کی صورت میں پولیس تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرے گی۔"

"نیل کنٹھ کسے کہتے ہیں؟" جانتے ہو؟"

"ایک پرندہ ہوتا ہے۔"

"ہاں .... اور ہندو اسے گرڑ بھگوان بھی کہتے ہیں۔ بڑا متبرک خیال کرتے ہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ نیل کنٹھ بڑا انسان دوست پرندہ ہوتا ہے پھر میں انسانوں سے دشمنی کسی طرح کر سکتا ہوں؟"

"میں نے سنا تھا کہ تمہیں گاؤں کے مکھیا کی ناک کاٹنے کے جرم میں سزا ہوئی تھی۔"

"ٹھیک سنا ہے تم نے۔"

"اور اس کے باوجود تم انسان دوست ہونے کا دعویٰ کرتے ہو۔"

"وہ چکر بھی کچھ انسان دوستی ہی کا تھا۔" بختاور نے لمبی سانس لیتے ہوئے پوچھا "چنگی کی چوکی آنے میں کتنی دیر ہے۔"

"اگر ہم اسی رفتار سے چلتے رہے تو ایک گھنٹا اور لگے گا۔"

"ٹھیک ہے، جب تک میں آرام کرتا ہوں۔ تم پریشان مت ہونا۔ میں نیند کی حالت میں بھی پوری طرح محتاط رہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ جیل میں بھانت بھانت کے قیدی ہوتے ہیں۔ مین نے ان کے تجربوں کی ان گنت داستانیں سنی ہیں اور بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ کبھی کوئی وقت آیا تو تم مجھے اس قدر بے پروا اور پرسکون نہیں پاؤ گے جتنا شاید اس وقت محسوس کر رہے ہو۔"

"کوئی ہتھیار بھی ہے پاس؟" رحیمو نے اسے کریدنے کی خاطر دریافت کیا۔

"وقت پر جو کار آمد تدبیر سوجھ جائے وہی انسان کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتی ہے۔"

"آدمی عقل مند اور ہوشیار معلوم ہوتے ہو۔"

بختاور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ درمیانی خلا کو کھٹکے کے ساتھ بند کرنے کے بعد نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ رحیمو ایک بار پھر پورے انہماک سے ڈرائیونگ کرنے لگا

لیکن اس کا ذہن اب بڑی سنجیدگی سے بختاور کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اس کا علم بھی اسے شہباز خان کے ذریعے ہوا تھا۔ شہباز خان چونکہ رحیمو پر مکمل اعتماد اور بھروسا کرتا تھا۔ اس لیے بختاور کو بخیر وعافیت رام گڑھ پہنچانے کی ذمے داری بھی اسے سونپی گئی تھی۔ شہباز خان نے اسے ایک معقول رقم بھی دی تھی اور ٹکراؤ کی صورت میں کچھ ازمودہ مشورے بھی۔

رحیمو جو ایک طویل عرصے سے شہباز خان کے لیے کام کر رہا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ شہباز خان ناجائز کاروبار کرنے کے باوجود بڑے سخت اصولوں کا آدمی تھا۔ لین دین کے معاملے میں وہ نہایت ایماندار اور کھرا واقع ہوا تھا۔ جو وعدہ کرتا اس پر خسارہ اٹھانے کی صورت میں بھی بڑی سختی سے عمل کرتا تھا۔ ناجائز تجارت کے کاروبار میں ملوث ہونے کے باوجود اس نے اپنے ہاتھ انسانی خون سے ہمیشہ صاف رکھے تھے۔ ایک حد تک وہ قانون کا احترام کرنا بھی اپنے اوپر فرض سمجھتا۔ اس نے اپنے کارندوں کو بڑی سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ کسی ایماندار پولیس یا کسٹم پارٹی سے ٹکراؤ کی صورت میں کسی کے خون سے ہاتھ رنگنے کے بجائے فرار ہونے کو ترجیح دی جائے۔ آدمی اثر و رسوخ والا تھا۔ اس لیے نقصان اٹھانے کی صورت میں وہ جلد ہی اپنا سارا خسارہ پورا کرلیا کرتا تھا۔ کسی مجرم کی پشت پناہی کرنا اس کے اصول کے خلاف تھا۔

"پھر وہ بختاور یا نیل کنٹھ کو پولیس کی نظروں سے بچانے کی کوشش کیوں کر رہا ہے۔ جب کہ وہ جیل سے مفرور قیدی ہے۔" رحیمو نے سوچا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ شہباز خان نے سے جیل سے فرار ہونے میں مدد دی ہو .... مگر کیوں؟ .... ایسا کون سا اہم اور ضروری کام تھا جسے نمٹانے کے لیے اسے جیل سے بھاگنا پڑا جبکہ بیس روز بعد وہ سزا پوری کر کے عزت کے ساتھ باہر آ سکتا تھا۔"

رحیمو بڑی دیر تک بختاور کے بارے میں سوچتا رہا پھر اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ اسے ضرورت بھی کیا تھی بلاوجہ ذہنی الجھن کا شکار ہونے کی۔ اسے تو صرف رام گڑھ تک بختاور کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ اس کے بعد اس کا کام ختم ہو جاتا۔

چنگی کی چوکی دور سے نظر آئی تو رحیمو نے ٹرک کی رفتار کم کرنا شروع کر دی۔

حسب معمول وہ چوکی سے تھوڑے فاصلے پر ٹرک ایک جانب کھڑا کر کے نیچے اترا پھر لگی بندھی رقم جیب سے نکال کر فضل دین تک پہنچ گیا جو گزشتہ کئی برسوں سے چنگی کا انچارج تھا اور اپنے فرائض منصبی نظریں نیچی کر کے بھگتا رہا تھا۔ خلاف توقع آج فضل دین تنہا ہی بیٹھا تھا ورنہ عام طور پر دو چار آدمی اس کے ارد گرد ضرور ہوتے تھے۔

"اور سناؤ رحیمو کیسے ہو؟ فضل دین نے حسب دستور اس کی خیریت دریافت کی۔

"سب رب کا کرم ہے فضل دین۔" رحیمو نے وہی انداز اختیار کیا جو پولیس آفیسر کے روبرو اختیار کیا تھا" اس نیلی چھتری والے نے عجت بنا رکھی ہے۔"

"راستے میں آج کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟" فضل دین نے چنگی کی رقم گن کر تجوری میں مقفل کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"ترپاٹھی جی سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی پر آج تو وہ بڑی لاٹ صاحبی دکھاوے تھے' ایسا جان پڑتا ہے۔ جیسے صبح اٹھ کر پہلے پہل اپنا ہی منہ شیشے میں دیکھ لیا ہو یا پھر کسی نے اس کی پاکٹ مار دی ہو شاید۔ جرا جرا سی بات پر گرگٹ کی طرح رنگ بدلے تھا۔

"ٹرک کی تلاشی تو نہیں لی؟" فضل دین نے رسید کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"لی تھی ......" رحیمو نے دیدہ و دانستہ بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔ "اس کے گرگے بندر کی طرح اچک اچک کر ٹرک کو چاروں طرف سے یوں دیکھ رہے تھے جیسے سالوں نے پہلی بار ٹرک دیکھا ہو۔ اسی بات پر ہمارا مچٹیا بھی ہو گیا۔ سالا مال بھی گن کر پکڑے ہے اوپر سے رباب بھی ایسا جھاڑے ہے جیسے سب ہی چور ہیں۔ استاد کو بولوں گا جا کر ...... وہی کرے گا پولیس والوں سے اپنی رستے داری کی کھری کھری باتیں۔"

"کیا ترپاٹھی نے تمہیں ٹرک کی تلاشی لینے کی وجہ نہیں بتائی تھی؟"

""نہیں ...... کیوں؟" رحیموں نے انجان بن کر پوچھا۔

"پولیس کو بختاور نامی ایک مفرور مجرم کی تلاش ہے۔ جیل سے نکل کر بھاگا ہے" فضل دین نے بتایا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب کی گاڑی بھی صبح سے دوبار پھیرا لگا چکی ہے۔

اوپر سے نیچے تک بڑی لے دی ہو رہی ہے۔ ترپاٹھی بھی بولایا بولایا گھوم رہا ہے۔"

"بختاور!" رحیمو نے بڑی خوبصورت اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "نام کچھ سناسنا لگے ہے۔"

"لوگ اسے نیل کنٹھ کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔" فضل دین نے رحیمو کو اپنی معلومات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا "اس کے باپ دادا سب کھیتی باڑی کرتے تھے لیکن بختاور کو پڑھ لکھ کر بڑا بابو بننے کا شوق تھا۔ چھ جماعتیں بھی پاس کر لی تھیں اس نے لیکن غریب کے مقدر میں بڑا بابو بننے کے بجائے جیل کی ہوا کھانی لکھی تھی۔ میں اسے بہت قریب سے جانتا ہوں۔ گاؤں کا مکھیا یوں تو سب ہی کسانوں کو اپنے باپ کا غلام سمجھتا تھا لیکن بختاور کے بزرگوں سے تو اسے جیسے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ بات بے بات بھری محفل میں ان کی عزت کی دھجیاں اڑا دینا اس کی عادت بن گئی تھی۔ دوسروں کے مقابلے میں وہ ان سے لگان بھی زیادہ وصول کرتا تھا اور اسی حساب سے تنگ بھی کرتا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسے بختاور کی تعلیم حاصل کرنے سے بیر تھا۔ مکھیا نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سامنے سر جھکا کر چلنے والوں میں کوئی پڑھ لکھ کر اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرے۔ ایک دو بار اس نے براہ راست بختاور کو بھی اپنی چکنی چپڑی باتوں میں الجھا کر کھیتی باڑی کی طرف راغب ہونے کی ترغیب دی تھی لیکن بختاور نے اسے جھڑک دیا۔ اس نے کھرے کھرے لہجے میں مکھیا کو بتا دیا تھا کہ وہ اس کے معاملے میں دخل دینے کی کوشش نہ کرے۔ اس کے بعد سے تو مکھیا اور بختاور کے بزرگوں کے درمیان باقاعدہ ٹھن گئی تھی۔ ایک بات تو مکھیا کے اشارے پر اس کے گرگوں نے بیچاروں کی کھڑی فصل کو آگ بھی لگا دی تھی پھر کاغذات میں ہیر پھیر کر کے ان سے زمین کا کچھ حصہ بھی ہتھیا لیا۔ بختاور مکھیا کی حرکتوں کو دیکھتا اور خون کے گھونٹ پی کر صبر کر جاتا۔ شاید وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مکھیا کے کس بل ڈھیلے کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا لیکن پھر اچانک حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ غریب کے سارے خواب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ بات بڑی معمولی سی تھی۔ اس روز دوپہر کے وقت بختاور اپنے کھیتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا کہ اس نے کسی عورت کی سسکیوں کی آواز سنی۔ قریب جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ مکھیا بختاور کے کھیت

میں کام کرنے والی رام کلی نامی ایک کمسن لڑکی کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رام کلی ہاتھ باندھ کر اسے ایشور اور بھگوان کا واسطہ دے رہی تھی لیکن کھیا کے سر پر تو بھگوان کے بجائے شیطان سوار تھا۔ رام کلی سے پہلے بھی وہ کئی بھولی بھالی معصوم کلیوں کو اپنی عزت اور طاقت کے بل بوتے پر پھول بنا چکا تھا۔ بختاور موقع پر نہ پہنچتا تو شاید رام کلی بھی اس کی درندگی کا نشانہ بن جاتی۔

بختاور نے اس موقع پر بھی کھیا سے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ رام کلی کا ہاتھ چھوڑ دے لیکن کھیا پر ہوس کا بھوت سوار تھا۔ اس نے بختاور کو بہن کی گالی دے کر دفع ہو جانے کو کہا۔ بختاور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خونخوار نظروں سے اسے گھورتا ہوا وہاں سے وقتی طور دفعان ہو گیا لیکن جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سرجونائی سے زبردستی چھینا ہوا استرا موجود تھا۔ کھیا اس وقت تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تھا پھر بختاور کو دیکھ کر اس سے پہلے کہ وہ اپنے بچنے کی کوئی تدبیر کرتا۔ بختاور نے پل بھر میں اسے دھوبی پاٹ مار کر زمین پر چت کیا پھر اس کی چھاتی پر بیٹھا اور پلک جھپکتے میں کھیا کی ناک کاٹ کر رکھ دی۔

بختاور اگر چاہتا تو سزا سے بچ سکتا تھا لیکن ایک تو سرجونائی کی گواہی اس کے خلاف تھی پھر خود اس نے عدالت کے روبرو اپنا جرم تسلیم کر لیا تھا۔ عدالت کی کاروائی کے دوران میں بختاور نے ایک بار بھی رام کلی پر کھیا اور اس کے درمیان کھیت میں ہونے والی دھینگا مشتی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کھیا سے اپنے جھگڑے کی وجہ اس نے دیرینہ عداوت بیان کی تھی۔ چنانچہ اعتراف جرم کے عوض انصاف کے دیوتا نے اسے پورے ایک سال اور تین ماہ کی سزا سنا دی۔

"بختاور نے انسان دوستی کی جو اعلیٰ مثال قائم کی تھی۔ اس نے اسکی عرفیت یعنی نیل کنٹھ کے نام پر مہر صداقت لگا دی۔ ایک کم ذات ہندو لڑکی کی عزت بچانے کی خاطر اس نے اپنا مستقبل داؤ پر لگا دیا تھا۔ آج کل تو کوئی اپنے سگوں کے لیے بھی اتنی بڑی قربانی نہیں دیتا۔"

"کیا رام کلی کے گھر والوں اور گاؤں کے لوگوں کی جبان پر بھی تالے پڑ گئے تھے؟" رحیمو نے فضل دین کی بات ختم ہونے کے بعد کہا۔ "کوئی مائی کا لال بھری

عدالت میں تو بختاور کے حق میں گواہی دے سکے تھا۔"

"بہت سارے لوگوں نے یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ عدالت کے روبرو اصل واقعہ بیان کر دے۔ گواہی دینے والوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی لیکن بختاور نے سب کو منع کر دیا۔"

"منع کر دیا .... بھلا کیوں؟"

"اس کا خیال تھا کہ لڑکی کی عزت کانچ کی چوڑی کی طرح ہوتی ہے جو ایک بار چٹخ جائے تو اس کا عیب ہمیشہ باقی رہتا ہے۔" فضل دین نے ہاتھ میں دبی ہوئی رسید رحیمو کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"استاد بھی بتاوے تھا کہ بختاور ایک نمبر کا مرد ہونے کے باوجود لنگوٹ کا بڑا پکا ہے۔"

"اور کیا بتایا تھا شہباز خان نے؟" فضل دین نے سرگوشی میں دریافت کیا تو رحیمو کو احساس ہوا کہ شاید اس نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے چنانچہ جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا۔ "ادھر دولت نگر میں بھی نیل کنٹھ کے پھرار کی باتیں ہو رہی تھیں۔ استاد نے بختاور کے بارے میں بس اپنا کھیال جاہر کیا تھا۔"

"بات صرف خیال کی نہیں ہے رحیمو!" فضل دین آہستہ سے بولا "مجھے تو دال کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔"

"دال میں کالا .... میں سمجھا نہیں تمہارا مطلب۔" رحیمو نے اسے کریدنا چاہا" جو کچھ کہنا ہے کھل کر کاہے نہیں کہتے ہو۔"

"شہباز خان اور بختاور ایک دوسرے کے لنگوٹیا ہیں۔" فضل دین نے کہا "میں جانتا ہوں رام کلی والے کیس میں جب پولیس اسے گرفتار کر کے لے گئی تو شہباز خان نے ہی اس کی ضمانت کرائی تھی۔ وہ اس کے لیے بڑے سے بڑا وکیل کھڑا کرنا چاہتا تھا لیکن بختاور نے اسے منع کر دیا۔ سچ پوچھو تو اسی کیس کے بعد سے تمہارے استاد اور بختاور کے درمیان گاڑھی چھننی شروع ہوئی تھی۔"

"کیوں؟ کیا اس سے پہلے دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے؟"

"واقف تو تھے لیکن اتنی گہری یاری دوستی نہیں تھی۔"

"بات کیا ہی ....؟"

"دراصل شہباز خان بھی کسی وجہ سے کھیا سے خار کھاتا ہے لیکن وہ کھل کر سامنے نہیں آنا چاہتا۔ رام کلی والا معاملہ ہوا تو اس نے کھیا کے خلاف اپنا محاذ پختہ کرنے کے لیے بختاور کی طرف داری کر کے اسے بھی اپنا ہم خیال بنا لیا۔"

"کیا مطلب؟ کیا استاد بختاور کے ذریعے کھیا سے اپنا کوئی پچھلا حساب چکتا کرنا چاہے ہے؟"

"سو فیصد یہی بات ہے اور اب تو مجھے ایک شبہ اور بھی ہو رہا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہو سکتا ہے کہ نیل کنٹھ کو جیل سے فرار کر کے اڑانے میں بھی تمہارے استاد کا ہاتھ ہو۔"

"جبان سنبھال کر منسی فجل دین! جانتا ہے تو کس کے آگے استاد پر شبہ کرے ہے۔"

"ارے جا جا .... اپنا کام کر جا کر' تو ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔"

"رحیمو نے کوئی جواب نہیں دیا' چنگی کی رسید جیب میں اڑس کر فضل دین کو گھورتا ہوا ٹرک کی سمت لوٹ گیا۔ ابھی تک اسے حالات کی سنگینی کا احساس نہیں تھا لیکن فضل دین کی زبانی تمام باتوں کا علم ہو جانے کے بعد اس نے وہاں زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ شبہ تو اسے پہلے بھی تھا کہ بختاور کے فرار میں کسی نہ کسی طور۔ استاد کا ہاتھ ضرور شامل ہے لیکن اب اسے یقین سا ہو چلا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو شہباز خان ایک مفرور مجرم کی خاطر اتنا بڑا رسک کبھی نہ لیتا۔ بختاور کے پکڑے جانے کی صورت میں ٹرک بھی تھانے کی حدود تک ضرور جاتا اور پھر وہ مال بھی برآمد ہو سکتا تھا جو ٹرک کے اندر ایک خاص پیٹی میں محفوظ تھا۔

ترپاٹھی اور چنگی چوکی کا خطرہ تو ٹل چکا تھا لیکن ہو سکتا تھا آگے اس سے زیادہ کوئی خطرہ موجود ہو۔ رحیمو کو پہلی بار اپنی عافیت بھی خطرے میں محسوس ہوئی۔ بختاور اور مال کے ساتھ وہ خود بھی سفر کر رہا تھا۔ پکڑے جانے کی صورت میں وہ بھی جرم میں برابر کا شریک سمجھا جاسکتا تھا۔

ٹرک اسٹارٹ کر کے وہ تیزی سے سڑک پر لایا پھر اس کی رفتار بتدریج تیز کرنے لگا۔ ٹرک کی پشت پر کم و بیش چالیس پیٹیاں لدی ہوئی تھیں جن میں صرف ایک پیٹی ایسی تھی جس میں ناجائز تجارت کا ذخیرہ موجود تھا۔ باقی پیٹیوں میں ضروریات زندگی کی عام چیزیں پیک تھیں۔ پولیس یا کسٹم کے حکام کو اصل پیٹی تک پہنچنے میں خاصے پاپڑ بیلنے پڑتے لیکن بختاور تو کھلی کتاب کی طرح سامنے موجود تھا۔ ناجائز کام کے لیے شہباز خان نے چیکنگ کرنے والوں کو باقاعدہ باندھ رکھا تھا لیکن ایک مفرور مجرم کی نقل و حرکت کے لیے ان کے درمیان ایسا کوئی معاہدہ طے نہیں تھا جو پولیس کو بختاور کی گردن پکڑ کر حوالات کے اندر بند کرنے سے باز رکھ سکتا۔

رحیمو کا ذہن اب بڑی تیزی سے کام رہا تھا۔ خود بختاور نے اپنی زبان سے اقرار کیا تھا کہ اس نے جیلر سے دو روز کی رخصت طلب کی تھی۔ درخواست نامنظور ہو جانے کے بعد اس نے فرار کا منصوبہ بنا ڈالا اور اب فضل دین کا بھی یہی خیال تھا کہ بختاور کو جیل سے چھو منتر کرانے میں شہباز خان کا ہاتھ ہے۔ اگر ان دونوں باتوں کا ایک دوسرے سے تعلق درست تسلیم کر لیا جاتا تو پھر یقیناً وہ کوئی خطرناک اور سنگین ہی مہم تھی جسے سر کرنے کی خاطر بختاور نے جیل سے فرار ہو کر خود کو قانون کی نظروں میں بدترین مجرم ثابت کیا تھا۔

بختاور نے ایسا کیوں کیا؟ شہباز خان جیسے اصول پسند آدمی نے ایک مجرم کی پشت پناہی کا بیڑا کیوں اٹھایا؟ وہ ایسی کون سی ضرورت تھی یا کام تھا جسے بیس روز کے لیے ملتوی نہیں کیا جا سکتا تھا؟ کیا وقت کی پابندی اتنی ہی اہم تھی کہ بختاور نے بیس روز بعد ملنے والی مکمل آزادی کو بھی داؤ پر لگا دیا؟ اور کیا وہ اتنا ہی شریف ہے کہ اگر پولیس کی دسترس سے دو روز تک آزاد رہا تو از خود جیلر کے روبرو پیش ہو جائے گا؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر اس نے قانون شکنی کیوں کی تھی۔ یہ ایسے سوال تھے جو رحیمو کے ذہن میں گڈمڈ ہو کر اس کی پریشانی میں اضافہ کر رہے تھے۔

فضل دین نے رام کلی والی جو کہانی سنائی تھی۔ اب وہ بھی اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ اس کا ذہن اس کہانی کو ایک نئے زاویے سے پرکھنے کی کوشش کر رہا تھا ممکن ہے بختاور نے انسانیت کے ناتے نہیں بلکہ رقابت کے جوش

میں آ کر کھیا کی ناک کاٹ دی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ رام کلی کے ساتھ پہلے ملوث رہا ہو۔ ان کی ملاقات چھپ چھپ کر کھیت کھلیان میں ہوئی ہو۔ کیا عجب ہے کہ اس روز بھی رام کلی وہاں کھیتوں میں بختاور کی راہ دیکھ رہی ہو۔ اتفاقاً کھیا وہاں پہنچ گیا ہو اور ایک جوان لڑکی کو کھیتوں میں تنہا دیکھ کر کھیا کی رال ٹپک پڑی ہو۔ بختاور وہاں بعد میں پہنچا اور پھر اس منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے کھیا کی ناک کاٹنے کا ارادہ کر ڈالا۔ عدالت کی کارروائی سے رام کلی کا نام دور رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ بات اگر اچھلتی تو بختاور کے اپنے کردار کا دوسرا رخ بھی عیاں ہو جاتا۔ یہ امکان بھی خارج از بحث نہیں تھا کہ بختاور نے ہوشیاری اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کی ہو۔ انسانیت کا علمبردار بن کر وہ نیل کنٹھ کا خطاب حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا اور اپنے کردار کے گھناؤنے پہلو کو بھی گاؤں والوں کی نظروں سے صاف بچا گیا۔

رحیمو اپنے خیالات میں اس قدر محو تھا کہ اسے وقت کا اندازہ نہیں ہو سکا پھر وہ اس وقت چونکا جب ٹرک استاد پیڈرو کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا۔ استاد پیڈرو اور اس کے کارندے اس کے منتظر تھے۔ رحیمو کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے پیڈرو کے احاطے میں داخل ہونے سے پیشتر بختاور کو اتار دینا چاہئے تھا۔ شہباز خان نے بھی سختی سے اس بات کی تاکید کی تھی لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ سوائے صبر کرنے کے اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

"خیریت تو رہی؟" رحیمو ٹرک روک کر نیچے اترا تو پیڈرو نے اس کے قریب آتے ہوئے دریافت کیا "میں بڑی دیر سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر اور نہ آتے تو مجھے اپنے خاص آدمیوں کو روانہ کرنا پڑتا۔"

"پولیس کو اپنے شکار کی تلاش ہے۔" رحیمو نے کہا "راستے میں بڑی چیکنگ ہو رہی ہے۔"

"تمہارے ساتھ تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی؟"

"استاد نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔" رحیمو بولا "وہ ہر بار اپنا طریقہ کار بدلتا رہتا ہے۔"

"کون سا نمبر ہے استاد" پیڈرو کے ایک آدمی نے رحیمو سے دریافت کیا۔ بقیہ دو آدمی اوپر چڑھ کر ترپال ہٹانے کا کام انجام دے رہے تھے۔

"سیدھے ہاتھ کی تیسری قطار میں نیچے دو نمبر" رحیمو نے دھڑکتے ہوئے دل سے جواب دیا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے بختاور کے بارے میں غور کرنے لگا۔ پیڈرو اور اس کے کارندوں کی نظروں میں آجانے کے بعد اسے ٹرک میں بختاور کی موجودگی کا کوئی نہ کوئی بہانہ تو بنانا تھا۔

"کیا بات ہے دلبر؟" پیڈرو نے رحیمو کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے کہا "آج تم موڈ میں نہیں ہو۔"

"چیکنگ کرنے والوں نے سارے موڈ کی ایسی تیسی کر کے رکھ دی۔" رحیمو نے گردن جھٹک کر جواب دیا۔ اس کی نظریں بدستور پیڈرو کے کارندوں پر جمی تھیں جو ٹرک پر چڑھے پیٹیاں ادھر سے ادھر کرنے میں مصروف تھے پھر جب انہوں نے اپنی مطلوبہ پیٹی اتار کر ترپال کو دوبارہ بقیہ سامان پر تان دیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا لیکن اسے اس بات پر حیرت تھی کہ بختاور ان کی نظروں میں کیوں نہیں آیا؟"

پیڈرو سے پیٹی کی رقم وصول کرنے کے بعد وہ ٹرک اسٹارٹ کر کے احاطے سے باہر آ گیا۔ باقی تجارتی سامان اسے ایک اور آدمی کو ڈلیور کرنا تھا لیکن اس سے پیشتر وہ بختاور سے گلو خلاصی کرنے کا خواہش مند تھا۔ چنانچہ پیڈرو کے اڈے سے دور جا کر اس نے ٹرک ایک دوسرے سنسان علاقے میں روکا اور کھٹکے کو دبا کر درمیانی خلا سے دوسری جانب دیکھا لیکن بختاور وہاں موجود نہیں تھا۔ اپنے خیال کی مزید تصدیق کی خاطر وہ انجن بند کر کے نیچے اترا اور اوپر چڑھ کر اس نے باری باری چاروں کونوں سے ترپال ہٹا کر اچھی طرح ٹرک کا جائزہ لیا لیکن بختاور کہیں بھی نہیں نظر نہیں آیا۔

"ہو سکتا ہے وہ چنگی چوکی کے پاس ٹرک سے اتر گیا ہو۔" رحیمو نے سوچا ممکن ہے اس نے خطرے کی بو پالی ہو اور ٹرک میں سفر کرنے کے بجائے ان کھیتوں کو اپنے لیے بہتر پناہ گاہ تصور کیا ہو جو چنگی چوکی کے عقب میں میلوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ اچھا ہی ہوا۔ خس کم جہاں پاک" رحیمو نے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہا پھر اطمینان سے نیچے آ کر ٹرک اسٹارٹ کیا اور اپنی دوسری منزل کی سمت روانہ ہو گیا۔

○

شام کے سائے پھیل کر لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ نیلے آسمان پر بگلوں کی ڈار اپنے بسیرے کی جانب محو پرواز تھی۔ ہوا کی خنکی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ لیکن بختاور ان تمام باتوں سے بے نیاز کھیتوں کے درمیان بل کھاتی پگڈنڈی پر قدم جمائے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر گہرے سلیٹی رنگ کی شلوار قمیض موجود تھی جو اسے شہباز خان نے دی تھی۔ جیل کے کپڑے اس نے احتیاط سے سنبھال کر شہباز خان کے ایک آدمی کے گھر بطور امانت رکھ دیے تھے۔

اس کے چہرے پر اس وقت بھی سنجیدگی اور بردباری کے ملے جلے تاثرات موجود تھے۔ آنکھوں میں وہی مخصوص چمک نظر آتی تھی جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ سینہ تانے گردن اٹھائے اوپر تلے قدم اٹھاتا وہ رواں دواں تھا جیسے وہ جیل سے مفرور قیدی کے بجائے کوئی فاتح جرنیل ہو جو میدان جنگ میں دشمنوں کو شکست فاش دینے کے بعد تھکا ماندہ گھر کی جانب لوٹ رہا ہو۔ وہ کسی طور سے پریشان یا گھبرایا ہوا نہیں تھا البتہ محتاط ضرور تھا۔ دائیں بائیں ایک ذرا سی آہٹ بھی اسے چوکنا کر دیتی تھی۔ چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی اور بھری بھری مونچھوں نے اس کی اصلیت کی پردہ پوشی کر رکھی تھی۔ پہلی نظر میں وہ خود بھی اپنی آپ کو بختاور کی حیثیت سے نہیں شناخت کر سکا تھا پھر بھی احتیاط کے طور پر اس نے اپنا ہیر اسٹائل تبدیل کر لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جس مقصد کی خاطر اس نے جیل کے محافظوں کی نظروں میں دھول جھونک کر راہ فرار اختیار کی تھی۔ اس کی تکمیل سے پیشتر وہ بختاور کی حیثیت سے پہچانا جاتا۔ اسی خیال کے پیش نظر اس نے چنگی چوکی پر اچانک ٹرک کے ذریعے اپنا سفر جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

رحیمو کی گفتگو سے اندازہ ہو گیا تھا کہ پولیس اس کی تلاش میں چوکس ہے۔ ٹرک کی تلاشی کا مرحلہ ایک بار ٹل گیا تھا لیکن کسی دوسرے مرحلے پر وہ پولیس کی نگاہوں میں آ سکتا تھا چنانچہ اس نے کھیتوں کے ذریعے اپنی منزل تک پہنچنے کا فیصلہ کیا تھا۔ راستے اس کے دیکھے بھالے تھے۔ وہ ایک ایک چپے سے واقف تھا۔ ان ہی

راستوں کی اونچی نیچی ناہموار پگڈنڈیوں پر کھیل کود کر تو وہ جوان ہوا تھا پھر وہ ان راستوں کے پیچ و خم کس طرح بھول سکتا تھا۔

اچانک بائیں جانب جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی تو وہ کسی چیتے کی سی پھرتی سے پگڈنڈی سے اتر کر جھاڑیوں کی آڑ میں دبک گیا۔ اس کا سیدھا ہاتھ برق رفتاری کے ساتھ جیب میں رینگ گیا۔ جہاں کھٹکے سے کھلنے والا چاقو موجود تھا۔ جیل سے فرار ہونے سے کوئی دو ہفتے پیشتر وہ چاقو اسے کرم داد نامی ایک قیدی نے بطور انعام دیا تھا اور اسے استعمال کرنے کے دو چار گر بھی سکھا دیئے تھے۔ کرم داد چاقو زنی کے فن میں مہارت رکھتا تھا اور خاص طور پر اسے پھینک کر ٹھیک نشانے پر مارنے میں تو اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ کرم داد اور بختاور کچھ دنوں کے لیے ایک ہی کوٹھری میں ساتھ رہے تھے۔ ان ہی دنوں ایک ذرا سی بات پر دونوں کے درمیان ٹھن گئی۔ کرم داد نے حسب عادت چاقو کا سہارا لینا چاہا لیکن بختاور نے پلک جھپکتے میں اسے نہ صرف زیر کر دیا بلکہ چاقو بھی چھین لیا۔ بختاور کی اسی مردانگی پر خوش ہو کر کرم داد نے اسے اپنا چاقو بطور انعام دے دیا تھا۔ اس دن کے بعد دونوں نے دوستی کا ہاتھ ملا لیا تھا۔

جیب سے چاقو نکالنے کے بعد بختاور نے اس کے کھٹکے پر انگوٹھے کا دباؤ ڈالا تو چھ انچ کا تیز دھار پھل دستے سے نکل کر باہر آ گیا۔ اس کی نگاہیں جھاڑیوں میں اسی سمت مرکوز تھیں جہاں سرسراہٹ کی آواز ابھر کر تھم گئی تھی۔ بختاور نے نہایت آہستگی سے پینترا بدلا پھر چاقو کو پھل کی طرف سے تھام لیا۔ دشمن کے سامنے آنے کی صورت میں وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے اپنا نشانہ بنا سکتا تھا لیکن یکلخت ایک خرگوش اچھل کر جھاڑیوں سے باہر آیا تو بختاور کو ہنسی آ گئی۔ اس نے ایک لمبی سانس لے کر اپنے اعصاب کی وقتی تکان کو دور کیا پھر چاقو کو جیب میں رکھتا ہوا اٹھا اور پگڈنڈی پر ہو لیا۔ ماحول پر طاری ملگجا اندھیرا رفتہ رفتہ تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔

بختاور کے ذہن میں اب مریم کا تصور بیدا ہو رہا تھا۔ مریم اور وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ ایک ساتھ کھیلے کودے تھے۔ ایک ساتھ پل کر جوان ہوئے تھے۔ مریم گاؤں کے مولوی سراج دین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ مولوی سراج دین اور بختاور کے والدین میں بھی برسوں کی پرانی دوستی تھی۔ دونوں کے گھر بہت

قریب تھے۔ سگے رشتے داروں کی طرح آپس میں ملنا جلنا تھا۔ بختاور کی پڑھائی کی حمایت مولوی سراج دین ہمیشہ کھل کر کرتے تھے پھر جب بزرگوں نے بچوں کا پیار دیکھا اور بچپنے نے بڑھ کر جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھا تو بختاور اور مریم کی منگنی ہو گئی۔ مولوی سراج دین کا خیال تھا کہ بختاور کے مڈل پاس کرتے ہی دونوں کی شادی کی رسم بھی فراغت حاصل کر لی جائے گی لیکن رام کلی اور مکھیا والے حادثے نے ان کے خواب چکنا چور کر دیئے مگر بختاور کو اس حادثے پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ اس نے رام کلی کی عزت بچا کر نیکی کا کام کیا تھا۔ بھری عدالت میں جب انصاف کے اندھے دیوتا نے اسے مجرم اور سزا وار قرار دے کر ایک سال تین ماہ کی سزا کا حکم سنایا تو اس کے چہرے پر کوئی ملال، افسوس یا تردد نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے عدالت کے فیصلے کو سزا نہیں بلکہ انعام کے طور پر قبول کیا۔ اس کے ضمیر نے اسے ملامت نہیں کی۔ ایک بھوکے درندے سے ایک بھولی بھالی معصوم اور کمزور لڑکی کی عزت محفوظ کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک سال تین ماہ مریم کے حسین تصور سے کھیلتے کھیلتے چٹکی بجاتے گزر جائیں گے لیکن جب اچانک ایک نئے قیدی کی زبانی اسے خبر ملی کہ مولوی سراج دین نے پنچائت کے فیصلے کے آگے مجبور ہو کر اس کی اور مریم کی منگنی توڑ دی ہے تو اس روز بختاور کے دل کو پہلی بار دھچکا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے زندگی میں اچانک کوئی خلا پیدا ہو گیا ہو۔ جیسے اس کی کوئی بہت ہی عزیز شے اس سے زبردستی چھین لی گئی ہو۔ اس رات وہ ایک پل بھی نہ سو سکا۔ مریم سے جدائی کا احساس اسے تڑپاتا رہا۔ اس کی پلکوں سے آنسو کا کوئی قطرہ نہیں ٹپکا لیکن وہ اندر ہی اندر سلگتا رہا، سسکتا رہا۔ اپنی مجبوری، بے کسی اور بے بسی پر ماتم کرتا رہا۔ کسی خاموش آتش فشاں کے مانند اپنے وجود کی گہرائیوں میں مچلتا رہا۔ وہ تمام رات اس نے پلکوں کے نیچے گزار دی لیکن جب صبح کا اجالا بیدار ہوا اور دور سے موذن کی آواز اس کے کانوں میں گونجی تو اس کے دل کو یکلخت قرار آ گیا۔ مریم سے جدائی کے فیصلے کو اس نے قدرت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ اس کے خیالوں کے دھارے بدلے تو اس نے سوچا کہ جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ اس نے مریم سے محبت کی تھی، اسے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ شب و روز دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر اس کی پرستش کرتا رہا تھ

پھر وہ اپنی محبت کو رسوا ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا تھا؟ وہ اپنی نظروں میں نہ سہی لیکن قانون کی نگاہوں میں مجرم تھا۔ شادی کے بعد گاؤں کی عورتیں اور مریم کی ہم جولیاں اسے ایک سزا یافتہ مجرم کی بیوی ہونے کا طعنہ دیتیں تو بھلا وہ اسے کس طرح برداشت کر سکتا تھا؟

بختاور نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لی کہ جو ہوا مریم کے حق میں بہتر ہوا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اب وہ مریم کی یاد کو اپنے دل کے نہاں خانوں میں دفن کر دے گا۔ کبھی اس کا نام زبان تک لا کر اپنے پیار کو رسوا نہیں ہونے دے گا۔ گزرتے وقت کا مرہم لگا کر دل کے زخموں کو مندمل کرنے کی کوشش کرے گا۔

آہستہ آہستہ وہ خود کو سنبھالتا رہا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جیل سے رہائی پانے کے بعد وہ گاؤں کے بجائے شہر کی طرف نکل جائے گا۔ نئے سرے سے اپنی زندگی کے بکھرے اوراق کو سمیٹ کر ترتیب دینے کی کوشش کرے گا۔ زندگی میں کوئی مقام حاصل کر لینے کے بعد وہ بوڑھے والدین کو بھی اپنے پاس بلا لے گا۔ ماضی کے تمام دریچوں کو یکسر بند کر دے گا۔ نئی زمین پر نئے گھروندے تعمیر کرے گا اور مستقبل کو سنوارنے سجانے کی خاطر شب روز ایک کر دے گا لیکن جب ایک روز اسے یہ خبر ملی کہ مریم کو اس کے سب سے عزیز دوست شرفو کے ساتھ منسوب کر دیا گیا ہے تو اس کے زخم پھر سے ہرے ہونے لگے۔ بیتی باتوں کی کسک اسے پھر سے تڑپانے لگی۔ راکھ میں دبی چنگاریاں ابھرنے لگیں۔ شرفو اس کا دوست ہی نہیں ہم راز بھی تھا۔ سب سے پہلے مریم سے اپنی منگنی کی خبر بختاور نے اسی کو سنائی تھی اور شرفو نے یہ خبر سن کر اسے پوری شدت سے گلے لگا کر اور دل کھول کر مبارک باد دی تھی اور اب، وہی شرفو مریم سے منسوب کر دیا گیا تھا۔

بختاور نے ایک بار پھر اپنے ڈگمگاتے وجود کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس نے خود کو بہلانے کے لیے سوچا کہ اچھا ہوا مریم کی قسمت کا فیصلہ شرفو کے حق میں ہو گیا۔ وہ مریم کے لیے نہ صرف موزوں تھا بلکہ کسی اور کے مقابلے میں اس کا زیادہ خیال رکھ سکتا تھا۔ ممکن تھا اگر قرعہ کسی اور کے حق میں نکلتا تو وہ مریم کو شادی کے بعد بختاور سے محبت کرنے کے جرم میں کچوکے لگاتا رہتا۔ اس کی معصوم زندگی کو

اجیرن کر دیتا' اس کی پاکیزگی کو داغدار کرنے کی خاطر اس کے تقدس کی دھجیاں بکھیرتا رہتا۔ اس پر گھناؤنے اور بے بنیاد الزامات تراشتا لیکن شرفو سب کچھ جانتا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ بختاور اور مریم کا پیار بہتے دریاؤں کے اجلے پانی کے مانند پاک ہے۔ وہ کم از کم مریم کے ماضی کو کریدنے کی کوشش کبھی نہ کرے گا۔

بختاور اپنے کرب کو تسلیاں دیتا رہا۔ خود کو بہلاتا رہا مگر پھر جب اسے ایک نئی اطلاع ملی تو اس کا سارا وجود بارود کے ڈھیر کے مانند بھک سے اڑ گیا۔ اس روز وہ حسب معمول لنگر سے اپنے حصے کی خوراک لے کر الگ تھلگ بیٹھا پیٹ کے جہنم کو بھر رہا تھا جب بلرام نامی ایک سنتری نے جو اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ قریب آکر اسے مخاطب کیا "اور سناؤ نیل کنٹھ مہاراج' کیسی گزر رہی ہے۔" بلرام کے لہجے میں طنز تھا۔ وہ ذات کا ہندو ہونے کے علاوہ گاؤں کے مکھیا کا پرانا واقف کار بھی تھا۔ اس لیے بختاور کو اکثر بیشتر پریشان کرتا رہتا تھا۔ بختاور اس کی باتوں کو ہمیشہ نظرانداز کر دیا کرتا۔ اس وقت بھی اس نے جواب میں بلرام کے چہرے پر ایک نظر ڈالی پھر کھانے میں مصروف ہو گیا۔

"کس وچار میں گم ہو مہاراج؟" بلرام نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا" کیا بھوجن میں اتنا سواد (ذائقہ) ہے کہ ہماری آواز بھی نہیں سنائی دے رہی۔"

"بہت دنوں سے تمہارے درشن نہیں ہوئے بلرام جی" بختاور نے سپاٹ آواز میں پوچھا "کیا چھٹی پر تھے؟"

"ہاں ......" بلرام الفاظ چباتے ہوئے بولا "ذرا گاؤں والوں کی خیر خبر لینے گیا تھا۔ تمہارے لیے بھی ایک گرما گرم خبر لایا ہوں۔"

"کیا؟" بختاور نے نوالہ چباتے ہوئے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

"پہلے ذرا چین سے پیٹ پوجا کر لو' خبر سنو گے تو بھوک نو دو گیارہ ہو جائے گی۔"

"کیا مکھیا جی کے بارے میں کوئی نیا سماچار ہے؟" بختاور نے زہر خند سے دریافت کیا پھر بلرام کو چھیڑنے کی خاطر بولا "تم کیوں تکلیف کرتے ہو۔ ایک مہینہ باقی رہ گیا ہے میری آزادی میں۔ گاؤں جا کر ساری گرما گرمی خود ہی معلوم کر لوں گا۔"

"ایک مہینے بعد تو ٹھنڈی ہو جائے گی مہاراج" بلرام نے نہایت بیہودہ انداز میں جواب دیا "گرمی تو خیر اب بھی نکل چکی ہے ...... ہاں تھوڑی بہت بھاپ باقی ہے کچھ دنوں میں وہ بھی ہوا میں چھومنتر ہو جائے گی۔"

"تمہارے پیٹ میں درد ہو رہا ہے تو پھر سنا ہی ڈالو بلرام جی' چنتا کس بات کی کر رہے ہو۔"

"اپنی نہیں' تمہاری چنتا ہے' خبر سنو گے تو دھرتی پیروں تلے سے سرک جائے گی۔"

"بات کیا ہے؟" بختاور نے پہلی بار سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ جو تمہارے متر (دوست) تھے نا ...... شرفو مہاراج' انہوں نے بھی مولوی صاحب کی سندری کو ہری جھنڈی دکھا دی۔"

"کیا مطلب ......" بختاور کا نوالہ حلق میں جیسے اٹک کر رہ گیا۔

"دس روز بعد تمہارے متر اور مریم کا جو لگن منڈپ سجنے والا تھا اس میں گھٹالا پڑ گیا ہے۔ مولوی صاحب غریب کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا ہے۔"

"کیا ......" بختاور کھانے کا برتن ایک طرف رکھ کر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بلرام نے اسے جو خبر سنائی تھی۔ وہ اس کے دل و دماغ پر کسی بم کی طرح پھٹی تھی۔ اس نے وضاحت طلب لہجے میں پوچھا۔ "تم ...... بلرام تم کہیں میرے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہے؟"

"تم مذاق سمجھ رہے ہو اور وہاں پورے گاؤں میں تھو تھو ہو رہی ہے" بلرام نے سنجیدگی اور حقارت سے جواب دیا۔

"کھل کر بتاؤ بلرام۔" بختاور نے بے چینی سے سوال کیا "اصل بات کیا ہے؟"

"اصل بات تو تم ہی بتا سکتے ہو مہاراج" بلرام نے اسے سر سے پیر تک عجیب معنی خیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا" شرفو کو تو صرف بھنک ملی ہے کہ مکھیا جی کی ناک کاٹنے کا اصل چکر کیا تھا۔"

"مم ...... میں سمجھا نہیں ......"

"میں سمجھاتا ہوں۔" بلرام سپاٹ آواز میں بولا "سچی بات کیا ہے بھگوان جانے پر

گاؤں میں یہی مشہور ہو رہا ہے کہ تم اور مریم کھیتوں میں چوری چھپے ملا کرتے تھے۔ مکھیا جی نے تم دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور تم نے غصے میں آ کر بیچارے کی ناک کاٹ ڈالی۔ رام کلی اور مکھیا جی والی بات تو اصل کہانی چھپانے کے کارن گھڑی گئی تھی۔"

بختاور کی رگوں میں دوڑنے والے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہ اتنا بچہ نہیں تھا۔ سمجھ گیا کہ مکھیا اب اپنی بے عزتی اور بدنامی کا انتقام لینے کی خاطر مریم کی زندگی برباد کرنے کی گھناؤنی سازش کر رہا ہے۔ ایک لمحے کو بختاور کے ذہن میں خیال گزرا کہ اس زبان ہی کو کاٹ کر پھینک دے جس نے اسے مریم کے تقدس پر کیچڑ اچھالنے کی خبر سنائی تھی لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔ بلرام نے تو صرف اس کے رستے زخموں پر نمک چھڑکا تھا۔ اصل آگ تو مکھیا اور اس کے گرگوں نے لگائی تھی۔

"سرک گئی نا پیروں تلے سے دھرتی" بلرام نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا پھر تیزی سے بولا "پر تجھے کس بات کی چنتا ...... تیرا اور مریم کا لگن تو پہلے ہی پنچایت کے فیصلے سے ٹوٹ چکا ہے۔ اب تیرا اور اس کا کیا سمبندھ ...... تو کیوں بیاکل (بے چین) ہو رہا ہے۔"

"کیا شرفو کو بھی اس کہانی کا یقین آ گیا جو میرے دشمنوں نے مشہور کی ہے۔"

"دل کا بھید تو اوپر والا جانے۔ میں نے صرف اتنا سنا ہے کہ شرفو بھی اب مریم کے ساتھ اپنا رشتہ ختم کرنے کے بارے میں غور کر رہا ہے۔"

"رام کلی کیا کہتی ہے؟" بختاور نے دھڑکتے دل سے جاننے کی کوشش کی "کیا وہ بھی ......"

"وہ غریب کیا کہے گی" بلرام نے حقارت سے اس کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا "تو نے ڈرا دھمکا کر جو کہا اس نے وہ بات مان لی تھی لیکن اب اسے کس بات کا خوف ...... اب تو تو سزا بھگت رہا ہے۔"

بلرام اس کے زخموں پر نمک پاشی کر کے چلا گیا تو بختاور نے ٹھنڈے دل سے حالات کا جائزہ لیا۔ لوگوں نے مکھیا کے ورغلانے پر گاؤں میں مریم کے بارے میں الٹی سیدھی خبریں مشہور کی ہوں گی۔ شرفو بھی انسان تھا۔ اسے گاؤں میں لوگوں کے ساتھ

مل جل کر چلنا تھا۔ اسے بھی اپنے مستقبل کے بارے میں غور و فکر کرنے کا اختیار تھا لیکن وہ تو بختاور کا عزیز ترین دوست تھا۔ ہم نوالہ ہم پیالہ ہونے کے علاوہ اس کا ہم راز بھی تھا۔ پھر اس نے ان بے سروپا باتوں پر یقین کیسے کر لیا؟"

بختاور شب و روز مریم کے بارے میں سوچتا رہا' مریم جو اس کا پیار تھی۔ اس کے حسین خوابوں کا تاج محل تھی۔ کیا وہ اس تاج محل کو ریزہ ریزہ اور مسمار ہوتے دیکھ سکے گا؟ ...... اور ...... کیا مریم اس بدنامی کے داغ کو ہنستے کھیلتے برداشت کر لے گی؟ اگر اس نے حالات کی ستم ظریفی کے ہاتھوں تنگ آ کر خودکشی کا فیصلہ کر لیا تو ...... تو کیا ہو گا؟ مکھیا اور اس کے گرگے تو مرنے کے بعد مریم کی روح کو بھی سکون سے نہیں رہنے دیں گے۔ اس کی بدنامی کی من گھڑت کہانی دہراتے رہیں گے۔ کیا وہ ان باتوں کو سن سکے گا؟ بختاور کا ذہن الجھتا رہا پھر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ شرفو سے کسی طرح خود مل کر اسے ایک بار سمجھانے کی کوشش کرے گا۔ اسے یقین تھا کہ شرفو اس کی بات ضرور مان لے گا ...... آخر وہ اس کا دوست تھا! اگر شرفو نے اسکی بات مان لی اور مریم سے شادی کر لی تو نہ صرف مولوی سراج دین کی عزت برقرار رہے گی بلکہ اس کے دشمنوں کو بھی اپنی شکست تسلیم کرنا پڑے گی اور مریم کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کا سہاگ بھی برقرار رہے گا ...... لیکن ......

مریم کی شادی کی تاریخ میں صرف دس دن باقی تھے اور اس کی رہائی میں پورے تیس دن۔ وقت اگر ایک بار ہاتھ سے نکل گیا تو کبھی واپس نہیں آ سکے گا۔

بختاور کے ذہن میں یہی ایک سوال صدائے بازگشت بن کر بار بار گونجتا رہا پھر ایک روز بعد جیلر راؤنڈ پر آیا تو بختاور کے معصوم ذہن میں ایک سہل سی ترکیب آ گئی۔ ابھی اس نے جیل کے ماحول کو پوری طرح قبول نہیں کیا تھا۔ مجرمانہ ذہنیت کو اپنے وجود کی گہرائیوں میں سرایت ہو جانے سے باز رکھا تھا۔ چنانچہ وہ موقع دیکھ کر جیلر کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کسی تمہید کے بغیر بڑی سادگی سے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

"سرکار! مجھے دو دن کی چھٹی چاہئے۔"

"چھٹی چاہئے ......" جیلر نے ایک ثانئے کو اسے نفرت سے گھورا پھر کچھ سوچ کر بولا "جانا کہاں ہے تمہیں؟"

"بہت ضروری کام پیش آ گیا ہے سرکار!" اس نے جیلر کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے لجاجت سے کہا "میں آپ کو زبان دیتا ہوں۔ دو دن بعد میں ہر قیمت پر واپس آ جاؤں گا۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ ایک ماہ بعد تم کو جیل سے رہائی ملنے والی ہے۔" جیلر نے بڑے رعب سے پوچھا۔

"معلوم ہے سرکار!"

"پھر وقت کا انتظار کرو"

"وقت ہی کی تو بات ہے سرکار' اگر میں نے اپنا فرض پورا نہ کیا اور وقت نکل گیا تو......"

"بکو مت" جیلر نے کڑک کر کہا "یہ جیل ہے' سرکاری یا درباری ملازمت نہیں جہاں چھٹیوں کا حساب کتاب ہوتا ہے۔"

"میں ہاتھ جوڑتا ہوں سرکار!" اس نے التجا کی "میری درخواست رد نہ کیجئے آپ چاہیں تو دو روز کی چھٹی کے عوض میری سزا میں دو ماہ کا اضافہ کر دیں لیکن اس وقت مجھے مایوس نہ کریں۔"

"نام کیا ہے تمہارا؟" جیلر نے اسے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

"بختاور۔"

"لوگ اسے نیل کنٹھ کے شبھ نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔" بلرام نے جو ج
کے ساتھ ہی محافظوں میں شامل تھا۔ اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے بولا۔

"نیل کنٹھ!" جیلر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی "اگر تم نیل کنٹھ ہو تو
چھٹی کی اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ چپ چاپ پھر سے اڑ کر جیل سے باہر نکل
کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

جیلر کی اس بات پر قریب موجود سنتریوں اور افسران کے علاوہ قیدیوں نے
دل کھول کر قہقہہ لگایا۔ بختاور مایوسی کے عالم میں بت بنا کھڑا رہا لیکن پھر سے اڑ جا
والی بات اس کے ذہن میں جیسے بیٹھ کر رہ گئی تھی۔ وہ اسی منصوبے کے بارے
غور کرنے لگا پھر کرم داد نے اس کی یہ مشکل بھی حل کر دی۔ کرم داد چاقو زنی

علاوہ نقب لگانے اور جیل سے بار بار فرار ہونے میں بھی خاصی مہارت رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جیل کا بیشتر نچلا عملہ اور ایک دو افسران بھی اس سے خاصے بے تکلف تھے۔ شاید اس لیے کہ ان کی بے تکلفی اور دوستی کے عوض کرم داد ہمیشہ ان کی مٹھیاں گرم کرنے میں بڑی فیاضی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ بختاور نے جیل سے فرار ہوتے وقت بھی یہی وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ پکڑا نہ گیا تو اپنا کام نمٹاتے ہی واپس آ جائے گا اور جواب میں کرم داد نے مسکرا کر محض اس کی پیٹھ تھپ تھپانے پر اکتفا کی تھی۔ منہ سے کچھ نہیں کہا تھا۔

تین گھنٹے تک متواتر چلنے کے بعد وہ کھیتوں کی حدود سے نکل کر آبادی کی سرحدوں تک پہنچ گیا۔ گھپ اندھیرا پھیل جانے کے بعد اسے اپنے شناخت کر لیے جانے کا دھڑکا بھی کم ہو گیا۔ کچی سڑک پر رک کر اس نے دائیں بائیں غور سے دیکھا۔ پہلے اس کا ارادہ براہ راست شرفو سے ملنے کا تھا لیکن پھر کسی فوری خیال کے تحت اس نے اپنا رخ مکھیا کے حویلی نما مکان کی طرف موڑ دیا جو تقریباً" ایک کوس کے فاصلے پر واقع تھی۔

رات کے تقریباً" آٹھ کا عمل تھا۔ گاؤں کا مکھیا جگن لال اپنے منشی کے ساتھ بیٹھا حساب کتاب میں مگن تھا۔ نوٹوں کی گڈیاں اس کے سامنے رکھی تھیں۔ وہ ایک ایک گڈی کو اٹھا کر گنتا پھر دوسری طرف رکھتا جاتا تھا۔ روپے پیسوں کے معاملے میں وہ اپنے باپ پر بھی اعتبار کرنے کا عادی نہیں تھا۔ پانچویں گڈی گن کر اس نے پہلے سے گنی ہوئی ڈھیری کی طرف دیکھا پھر نظر اٹھا کر منشی سے پوچھا۔

"منوہر داس کے بیاج کا کیا بنا۔"

منشی نے کوئی جواب نہیں دیا' اس نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کی سمت دیکھا جہاں ایک دراز قد تنومند اجنبی منہ پر ڈھاٹا باندھے ہاتھ میں کھلا چاقو لیے سینہ تانے کھڑا تھا۔ اس کی خونخوار نظریں کسی آدم خور درندے کے مانند چمک رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے منشی کو زبان بند رکھنے کی ہدایت کی۔ جگن لال کی پشت دروازے کی سمت تھی۔ اس لیے وہ سر پر منڈلاتی موت کو نہیں دیکھ سکا تھا۔

"کیا بات ہے منشی' کیا تجھے سانپ سونگھ گیا ہے جو میری بات کا جواب نہیں دے

رہا؟" جگن لال نے منشی کو گھورتے ہوئے اپنا سوال دہرایا "منوہر داس کے بیاج کا کیا بنا۔"

"اب .... ابھی من .... من نو .... ہرداس نے .... اصل ر تق .... تق .... رقم دی ہے .... بب .... بب .... بیاج .... بب بب .... بعد .... مم مم ...."

جگن لال حیرت بھری نظروں سے منشی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بار بار منشی کی نظریں دروازے کی جانب اٹھتی دیکھیں تو اس کا ماتھا بھی ٹھنکا۔ ضرور کوئی ان ہونی بات تھی جس نے منشی کو اس طرح ہکلانے پر مجبور کر دیا تھا پھر جگن لال نے پلٹ کر پیچھے کی سمت نظر ڈالی تو خود اس کا بھی اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

"تت .... تم کون ہو؟" جگن لال نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا "اندر .... کک کیسے آ گئے؟"

"رگھو بیر کو بیہوش کرنے کے بعد آیا ہوں جسے تم نے اپنے پہرے پر بٹھا رکھا تھا۔" اجنبی نے جو بختاور کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ چہرے سے ڈھاٹا ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔ گھنی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھیں دیکھ کر منشی کے علاوہ جگن لال بھی اسے ڈاکو ہی سمجھ رہا تھا لیکن اسے حیرت تھی کہ بندوق کے بجائے اس نے ہاتھ میں محض ایک چاقو کیوں تھام رکھا ہے؟ لیکن یہ وقت ان باتوں کو سوچنے کا نہیں تھا۔ سب سے پہلا سوال جان بچانے کا تھا اور جگن لال خوب جانتا تھا کہ ڈاکو کسی کے دروازے پر کیوں جاتے ہیں چنانچہ اس نے جلدی سے کہا۔

"اس سمے میرے پاس جو کچھ ہے یہیں تمہارے سامنے دھرا ہے۔ جتنا جی میں آئے اٹھا لو لیکن جان سے مت مارنا۔"

"تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں مکھیا جی۔"

"جان پہچان بھی ہوتی رہے گی۔" جگن لال نے یہ سوچ کر کہ ممکن ہے اس کے دوسرے ساتھی اسلحہ لیے باہر موجود ہوں۔ ایک بار پھر اسے دولت کا لالچ دیتے ہوئے کہا "لکشمی کو ٹھکرانا بری بات ہے۔ پہلے تم اسے سوئیکار (قبول) کر لو پھر آرام سے بیٹھ کر بوجن پانی کرو، اس کے بعد ...."

"میں تمہاری لکشمی کو نہیں۔ تمہیں ساتھ لے جانے کی خاطر یہاں آیا ہوں۔" بختاور خشک آواز میں بولا "اگر زندگی عزیز ہے تو چپ چاپ اٹھ کر میرے ساتھ چلو ورنہ مجھے زبردستی کرنی پڑے گی۔"

"مم .... مجھ .... مجھے کہاں لے جاؤ گے۔" جگن لال نے خوف زدہ انداز میں ہاتھ باندھ دیئے، مجھے کہیں نہ لے جاؤ۔ میں وچن دیتا ہوں کہ تمہارے جانے کے بعد میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔"

"تمہیں میرے ساتھ ہر قیمت پر چلنا ہو گا جگن لال" بختاور نے چاقو انگلیوں کے درمیان گھماتے ہوئے سرد آواز میں کہا "میں بھی وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے بلا کسی چون و چرا کے میرے کہنے پر عمل کیا تو خیریت سے گھر واپس آ جاؤ گے ------ دوسری صورت میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

جگن لال سمجھ رہا تھا کہ اگر اس نے ڈاکو کا کہا مان لیا تو پھر اس کی واپسی اتنی آسان ہی ہو گی۔ اس نے حیل و حجت سے کام لینے کی کوشش کی لیکن جب بختاور نے اس کے سامنے منشی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے بے بس کر دیا اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر کھڑا ہوا تو جگن لال کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ موت کا تصور اس کے وجود کو لرزا رہا تھا۔ چارو ناچار اسے بختاور کے ساتھ جسے وہ بدستور ڈاکو سمجھ رہا تھا، جانے کے لیے اٹھنا پڑا۔ اسے حیرت ہوئی کہ کمرے سے نکلتے وقت بختاور نے نوٹوں کی گڈیوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔

باہر نکلنے سے پیشتر بختاور نے مکھیا کو سختی سے تاکید کر دی تھی کہ اگر اس نے راستے میں منہ سے کوئی آواز نکالی یا چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو اسے پل بھر میں جہنم رسید کر دے گا چنانچہ جگن لال چپ چاپ اس کے ساتھ چلتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ گھر سے باہر نکلتے ہی ڈاکو کے دوسرے ساتھی اسے اٹھا کر کسی گاڑی میں ڈال لیں گے پھر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے کسی خفیہ ٹھکانے پر لے جائیں گے۔ اس کے بعد ایک لمبی رقم کا مطالبہ کریں گے۔ ادائیگی کی صورت میں وہ دوبارہ گھر کی صورت دیکھ پائے گا ورنہ پھر اس کی لاش کے ٹکڑے کسی بوری میں بند کر کے رات کے اندھیرے میں میونسپلٹی کے سامنے پھینک دیے جائیں گے۔ ایک دوبار پہلے بھی

ڈاکوؤں نے ایسی ہی بربریت اور درندگی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن جگن لال کی توقع کے خلاف ابھی تک وہ کھلی فضا میں سانس لے رہا تھا۔

بہت دیر تک وہ خاموشی سے آگے پیچھے چلتے رہے پھر جب شرفو کے دروازے کے قریب پہنچ کر جگن لال کو رکنے کا حکم دیا گیا تو اس کا ماتھا دوبارہ ٹھنکا۔ اس نے ایک بار پھر بڑے غور سے بختاور کو دیکھا جو آگے بڑھ کر شرفو کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ کچھ وقفے کے بعد شرفو دروازہ کھول کر باہر نکلا تو وہ بھی گاؤں کے کھیا اور ایک اجنبی کو رات گئے اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟" شرفو نے جگن لال سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

"مم ...... میں یہاں اپنی مرضی ......"

"ہم اندر بیٹھ کر آرام سے بات کریں گے۔"

بختاور نے کھیا کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے شرفو کو مخاطب کیا پھر شرفو کی اجازت ملے بغیر ہی وہ جگن لال کا ہاتھ تھام کر اسے اندر گھسیٹ لے گیا۔ دو منٹ کے بعد وہ بیٹھک میں تھا جہاں شرفو ہمیشہ سے اکیلا سونے کا عادی تھا۔ بیٹھک میں لالٹین کی مدھم روشنی ہو رہی تھی۔

"تم ...... تم کون ہو؟" شرفو نے اندر پہنچ کر بختاور کو مخاطب کیا۔

جواب میں بختاور نے جیب سے کھٹکے والا چاقو نکال کر کھولا اور اس کے چمکدار پھل کی دھار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جگن لال کو یوں گھورنے لگا جیسے وہ کسی بھی لمحے اس پر ٹوٹ پڑنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ شرفو کی نظریں بدستور بختاور پر مرکوز تھیں۔ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"جگن لال!" کچھ توقف کے بعد بختاور نے نہایت سرد اور سفاک لہجے میں کھیا کو مخاطب کیا "اب اپنے بھگوان کی سوگند کھا کر سچ سچ بتاؤ کہ اس روز کھیتوں میں کیا ہوا تھا جس روز تمہاری ناک کاٹی گئی تھی۔"

شرفو کا دل یکلخت بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا‘ وہ داڑھی مونچھ کے باوجود بختاور کو اس کی آواز کے ذریعے شناخت کر چکا تھا لیکن جگن لال اسے پھٹی پھٹی نظروں سے

دیکھ رہا تھا۔

"میرے پاس وقت بہت کم ہے کھیا جی! اپنی زبان کے سارے بریک کھول دو ورنہ" بختاور نے چاقو کے دستے پر اپنی گرفت جما کر ایک ذرا ہاتھ بلند کیا تو جگن لال ساری جان سے کانپ اٹھا۔ کپکپاتی ہوئی آواز میں تھوک نگل کر بولا۔ "تت ...... تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"سچی بات جگن لال" بختاور نے حقارت سے کہا "شرفو کو بتاؤ کہ اس روز کھیتوں پر تم رام کلی کے ساتھ کون سا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب بختاور نے تمہاری ناک کاٹی تھی اور یہ بھی بتاؤ کہ تم نے مولوی سراج دین کی معصوم بیٹی کے بارے میں جو کچھ مشہور کیا ہے۔ اس میں کتنا کھوٹ اور کتنا کھرا ہے؟"

جگن لال کے بوکھلائے ہوئے ذہن میں پہلی بار بختاور کا نام گونجا‘ اس نے تصدیق کی خاطر کچھ کہنا چاہا لیکن بختاور کا الٹا ہاتھ پوری شدت سے اچانک اس کے منہ پر پڑا تو وہ چکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ خون کی ایک ہلکی سی لکیر اس کے ہونٹوں کے بائیں گوشے سے پھوٹ پڑی۔ وہ ہڑبڑا کر دھوتی سنبھالتا ہوا کھڑا ہوا تو بختاور چاقو لہراتے ہوئے گرجا۔

"میرے پاس وقت کم ہے جگن لال! بھگوان کا نام لے کر شروع ہو جا ورنہ تیری بوٹیاں کر ڈالوں گا۔"

بختاور کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ لہجے میں کچھ ایسی سفاکی اور درندگی تھی کہ جگن لال ساری جان سے لرز اٹھا اور پھر وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر رام کلی کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے حقائق دہراتا چلا گیا۔ اس نے تسلیم کیا کہ اگر بختاور کو وہاں پہنچنے میں دیر لگتی تو وہ اس معصوم لڑکی سے اپنی ہوس کی پیاس بجھا چکا ہوتا۔

جگن لال اس قدر خوف زدہ تھا کہ رام کلی کے علاوہ بھی اپنے کردار کے مختلف گھناؤنے پہلوؤں سے پردہ ہٹاتا چلا گیا پھر اس نے کانپتی ہوئی آواز میں یہ بھی تسلیم کر لیا کہ اس نے محض بختاور سے انتقام لینے کی خاطر مولوی سراج دین کی بے گناہ بیٹی کے اجلے کردار پر اس لیے گندگی اچھالنے کی کوشش کی تھی کہ شرفو اس سے بدظن ہو

کر شادی سے انکار کر دے۔

شرفو کسی بے جان بت کے مانند خاموش کھڑا جگن لال کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتدریج بدل رہے تھے۔ جگن لال کسی مجرم کی طرح ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بختاور کی قہر آلود نظریں بدستور اس کے چہرے پر مرکوز تھیں پھر جب جگن لال اپنی بات پوری کر چکا تو شرفو نے پوچھا۔ "کیا! تو نے کہا تھا کہ کھیتوں میں تو اپنی آنکھوں سے مریم اور بختاور کو گل چھرے اڑاتے دیکھا تھا؟" شرفو کی آواز میں کسی آنے والے بھیانک طوفان کی سنسناہٹ شامل تھی۔

"وہ جج ...... جھوٹ تھا ...... بھگوان کی سوگند وہ سب کچھ من گھڑت باتیں تھیں" جگن لال نے گڑگڑاتے ہوئے کہا "مم ...... مجھے شما کر دے شرفو ...... میں وچن دیتا ہوں کہ صبح ہوتے ہی گاؤں والوں کے سامنے سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔"

"بختو" شرفو نے کھیا کی بات کا جواب دینے کی بجائے بختاور کو مخاطب کیا "میں تجھ سے شرمندہ ہوں میرے یار! میں نے تیری دوستی پر شبہ کر کے دوستی کے مقدس رشتے کو بدنام کر دیا۔ میں تیرا مجرم ہوں۔ تیرے سامنے کھڑا ہوں۔ تیری مرضی' جو چاہے سزا دے لے مجھے' پر ایک بار سچے دل سے معاف کر دے' ورنہ میں خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاؤں گا۔"

بختاور نے شرفو کو بہت غور سے دیکھا۔ چند ثانئے تک تو پلکیں جھپکائے بغیر اسے تکتا رہا پھر آگے بڑھ کر بے اختیار گلے سے لگا لیا۔ بڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ بختاور کی پلکوں پر خوشی کے آنسو جھلملا رہے تھے اور شرفو کی نظریں بار بار قریب کھڑے' جگن لال کی سمت اٹھ رہی تھیں جس کے چہرے پر ابھی تک موت کے سائے لرز رہے تھے۔

"مجھے یقین تھا شرفو' میرے یار تو میری دوستی کا بھرم رکھ لے گا۔ اسی لیے تو میں خیل کی اونچی اونچی دیواریں پھلانگ کر یہاں تک پہنچا ہوں۔" بختاور نے بڑی اپنایت سے کہا پھر شرفو سے الگ ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "تیری اور بختاور کی شادی کب ہو رہی ہے؟"

"شادی ...... شادی ضرور ہو گی بختو لیکن اس سے پیشتر مجھے اپنی غلطی کا کفارہ

بھی ادا کرنا ہے۔" شرفو نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر اس سے پہلے کہ بختاور اس کی بات کا مفہوم سمجھ پاتا شرفو نے اس کے ہاتھ سے چاقو جھپٹ لیا۔ اس کے سر پر جنون سوار تھا۔ پل بھر میں اس نے کھٹکا دبا کر چاقو کھولا پھر آندھی طوفان کی طرح جگن لال پر ٹوٹ پڑا۔ جگن لال نے مریم کو بدنام کر کے اس کی خوشیوں کی بربادی کا جو کھیل کھیلا تھا۔ شرفو اسے آخری انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔

بختاور کو امید نہیں تھی کہ شرفو اس قدر اچانک آپے سے باہر ہو جائے گا۔ ایک لمحے کو کیسے وہ گنگ سا رہ گیا پھر اس نے لپک کر دونوں ہاتھوں سے شرفو کو پشت سے جکڑ لیا۔ اس وقت تک شرفو جگن لال سے اپنا حساب چکتا کر چکا تھا۔ جگن لال کی آنتیں اس کے جسم سے باہر آ چکی تھیں۔ وہ کچے فرش پر پڑا تڑپ کر زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہا تھا۔

"شرفو! پاگل دیوانے' تو نے یہ کیا کر ڈالا۔" بختاور نے پہلی فرصت میں اس کے ہاتھ سے خون آلود چاقو چھینتے ہوئے کہا۔

"آج میں نے اپنے دل کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا" شرفو پرسکون آواز میں بولا "میں نے جو کچھ کیا۔ وہی میرا فرض تھا۔ اب میں کسی گھٹن کے بغیر مریم سے شادی کر سکوں گا' مجھے سزا کا کوئی خوف نہیں۔"

"اگر تجھے سزا ہو گئی تو پھر مریم سے شادی کون رچائے گا؟" بختاور نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا "بول شرفو' اگر تجھے سزا ہو گئی تو مولوی صاحب کس کس کو اپنی شرافت کا یقین دلاتے پھریں گے؟ تو پھانسی چڑھ گیا تو پھر گاؤں کے سیدھے سادے معصوم اور شریف لوگوں کی عزت کی رکھوالی کون کرے گا؟ ...... نہیں' میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ تجھے زندہ رہنا ہو گا۔ میری بات دھیان سے سن شرفو' جگن لال کا خون میرے ہاتھوں ہوا ہے۔ ہاں' اسی لیے تو میں جیل سے فرار ہوا تھا۔ جگن لال کے منشی کا بیان بھی میرے خلاف گواہی دے گا جسے میں پیچھے ہاتھ پیر باندھ کر ڈال آیا ہوں۔ قانون کو تیری نہیں میری تلاش ہے' تو تو بس یونہی میرے اور قانون کے درمیان چکر میں آ گیا تھا' تو سمجھ رہا ہے نا شرفو میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"میں برداشت نہیں کروں گا میرے یار کہ جرم میں ...... کیا اور سزا تجھے بھگتنی

پڑے ......" شرفو نے کہا "کھیا کا خون میرے ہاتھوں ......"

"زبان بند رکھ شرفو' دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" بختاور فیصلہ کن لہجے میں بولا "تجھے ہر قیمت پر زندہ رہنا ہو گا۔ مریم کی خاطر' میری اور اپنی دوستی کی خاطر' تجھے میری قسم شرفو' اپنی زبان بند ہی رکھنا' میں تجھے خدا اور رسول کا واسطہ دیتا ہوں۔"

پھر بختاور تیزی سے پلٹا' خون آلود چاقو بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ حقارت بھری نظروں سے اس نے جگن لال کو دیکھا جس کا جسم موت اور زندگی کے دوراہے پر پڑا ابھی تک پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس نے جھک کر جگن لال کے گندے وجود کے بوجھ کو اٹھا کر کاندھوں پر لادا' شرفو کی بیٹھک سے نکل اس نے بڑی پھرتی سے دروازے کی کنڈی باہر سے لگائی پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا' مکان سے نکل کر رات کے گھپ اندھیرے اور سناٹے میں تیزی سے دوڑنے لگا۔

بختاور کو علم تھا کہ وہ جس راستے پر بھاگ رہا تھا۔ اس کا اختتام جیل کی کال کوٹھری اور انجام پھانسی کے پھندے پر ہو گا لیکن اس کے پیروں میں کوئی لڑکھڑاہٹ' کوئی لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ شاید اس نے طے کر لیا تھا کہ خود دفن ہو جائے گا لیکن اپنے اندر کے انسان کو کبھی مرنے نہیں دے گا۔"

○

گبرو

جب ماں کا انتقال ہوا۔ میری عمر یہی کوئی بارہ چودہ سال ہو گی میرا تعلق گجرات کے ایک نواحی گاؤں سے ہے جہاں زیادہ تر مزدور پیشہ یا پھر جاہل طبقے کے لوگ رہتے ہیں۔ اس لئے وہاں کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ عمروں کا حساب کتاب رکھا جائے وہ تو بس اس بات کے قائل تھے کہ جب تک زندہ رہو پیٹ کا تندور بھرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے رہو اور جب موت آئے تو قبر میں ٹانگیں پسار کر ابدی نیند سو رہو۔ رہا جنت اور جہنم کا تصور تو وہ اسے خدا کی مرضی پر چھوڑ دیتے تھے۔ اچھے برے اعمال کے سلسلے میں بھی ان کی سوچیں اس حد تک محدود تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی کے فرشتے دونوں کاندھوں پر بٹھا رکھے ہیں جو گناہ اور ثواب کا حساب لکھتے رہتے ہیں پھر انسانوں کو ان جھمیلوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟

بہر حال' میری عمر بارہ چودہ سال تھی۔ لیکن صحت اور کاٹھ ایسی تھی کہ میرے ساتھی مجھے "گبرو" کہا کرتے تھے۔ قد کے اعتبار سے بھی میں اپنے تمام دوستوں سے نکلتا ہوا تھا۔ ایک وجہ تو یہ تھی جو سب لڑکے مجھے اپنا لیڈر سمجھتے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میرا باپ عمردین گاؤں کا واحد پنساری تھا جس کی دکان سب سے بڑی تھی۔ گاؤں کے بیشتر لوگ میرے والد کی دکان سے ادھار لیتے تھے۔ اس لئے پورا گاؤں میری عزت کرتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس عزت کے پس پردہ ان کی اپنی اپنی غرض بھی وابستہ تھی۔

میرا نام رحمت علی تھا شاید اس لئے کہ میں ماں باپ کی شادی کے کم و بیش دس سال بعد بڑی منتوں' مرادوں اور بزرگوں کی قبروں پر چڑھاوے کے بعد پیدا ہوا تھا۔

میری ماں مجھے پیار سے رحیمو کہا کرتی تھی۔ میرے سنگی ساتھی اور ہم عمر لڑکے مجھے میرے قد و قیامت کی وجہ سے "گبرو" کہا کرتے تھے۔ جبکہ بڑے بوڑھے رحیمو کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔

یوں تو میری تمام لڑکوں سے واقفیت اور شناسائی تھی لیکن مراد سے کچھ زیادہ ہی گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے چھ سات سال بڑا تھا۔ لیکن اس نے اتنی عمر میں ہی جو تجربہ حاصل کر لیا تھا وہ کم از کم میرے لئے یقیناً حیرت انگیز تھا۔ اکثر وہ تنہائی میں مجھے اپنی نجی زندگی کے قصے اور کہانیاں سنایا کرتا وہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ لیکن اس کی پیار و محبت کی باتیں سن کر میرے جسم پر جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگتی تھیں۔ ایسا کیوں ہوتا تھا یہ بات میری سمجھ میں اس وقت تک نہیں آئی جب تک میں اٹھارہ سال کا نہیں ہوگیا۔

مراد بڑا جی دار اور نڈر لڑکا تھا۔ ذہنی طور پر بھی ہم سب پر حاوی تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بہت دور کی کوڑی لایا کرتا تھا۔ پڑھائی میں بھی ہمیشہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتا۔ ایک دن وہ مجھے گاؤں کے چوہدری علی بخش کی نوجوان لڑکی کے ساتھ اپنے چکر کی بات بتاتے ہوئے بولا۔

"یار رحیمو ...... یہ خرانٹ چوہدری کی لڑکی حمیدن ہے نا ...... اس کے تو مزاج ہی نہیں ملتے۔"

میں حمیدن کے نام پر چونکا۔ وہ پورے گاؤں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور تیز طرار مشہور تھی۔ جب مٹک مٹک کر چلتی تھی تو گاؤں کے عاقل اور بالغ سبھی نہ جانے کیوں اسے کن اکھیوں سے دیکھتے اور بھوکے کتوں کی طرح زبان نکال کر لپ لپ کرنے لگتے۔ ایک بار حمیدن کو منشی چراغ دین کے بیٹے نے کوئی ایسی ہی بات کہہ دی جسے سن کر وہ چراغ پا ہوگئی اس نے نہ صرف یہ کہ کھیتوں کے بیچوں بیچ منشی کے جوان بیٹے کی لاتوں اور گھونسوں سے اچھی خاصی خاطر تواضع کر دی بلکہ اس کی شکایت باپ سے بھی لگا دی۔ دوسرے روز پنچایت بیٹھ گئی۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے سر جوڑ کر غریب' منشی کو مجرم قرار دیا اسے ایک ہفتے کے اندر اندر بیوی بچوں سمیت گاؤں چھوڑ دینے کا حکم سنا دیا گیا۔ چراغ دین بہت رویا تھا لیکن اس کی فریاد کی کوئی

شنوائی نہیں ہوئی چنانچہ مراد کی زبان سے حمیدن کا نام سن کر میں نے اسے اپنی عمر اور بساط کے مطابق سمجھانے کی کوشش کی۔

"کیا منشی کے بیٹے والی بات بھول گیا۔ میری مان تو اس راستے سے بھی کترا کر گزر جایا کر جس پر حمیدن کے قدم پڑتے ہوں۔"

"اس کی اور بات تھی میرے یار۔ اس نے گرم گرم ہنڈیا میں منہ مارنے کی حماقت کی تھی۔ بزرگوں نے اسی لئے کہا ہے کہ ہمیشہ ٹھنڈا کر کے کھاؤ اس سے بدہضمی بھی نہیں ہوتی اور آدمی پیٹ بھر کر کھا بھی سکتا ہے۔" مراد نے ہری ہری گھاس کو جھلا کر اکھاڑتے ہوئے کہا۔ "تاڑی کا نشہ تمام نشوں کا بادشاہ ہوتا ہے لیکن تاڑی کا نکالنا کسی ایرے غیرے یا نتھو خیرے کے بس کی بات نہیں' پچیس تیس فٹ اونچے درخت پر چڑھنے کے لئے مہارت کی ضرورت ہوتی ہے سانجھ کے وقت ہانڈی لٹکائی جاتی ہے تب کہیں جا کر سویرے تک قطرہ قطرہ جمع ہونے سے کچھ حاصل ہوتا ہے۔ ایک ہی جست میں تیس فٹ اونچی چھلانگ لگانے والا ہمیشہ منہ کے بل گرتا ہے ...... منشی کے چھوکرے سے بھی یہی غلطی ہوئی تھی۔"

"میں حمیدن کی بات کر رہا ہوں اور تو تاڑی کا نشہ لے بیٹھا۔" میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

"ایک ہی بات ہے مگر ابھی تو تیری مسیں بھی نہیں پھوٹیں ...... تو کیا سمجھے گا۔" مراد نے مسکرا کر جواب دیا تو میں خفگی سے بولا۔

"پھر تو مجھ سے ایسی باتیں ہی کیوں کرتا ہے؟"

"دھیان سے سنا کر میری باتیں ...... کام آئیں گی کبھی زندگی میں۔" مراد نے دانشوروں جیسا انداز اختیار کیا۔

"اچھا چھوڑ ان باتوں کو ......" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "یہ بتا تو حمیدن کے نخرے والی کیا بات کر رہا تھا۔"

"کیا کرے گا سن کر ...... چل چھوڑ فٹ بال کھیلنے چلتے ہیں۔"

"تیری یہی بات مجھے ہمیشہ زہر لگتی ہے۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "پہلے تو خود مزے لے لے کر بات شروع کرتا ہے اور پھر چل چھوڑ یار کہہ کر سارا مزہ کرکرا کر دیتا

ہے۔"

"بات ہی ایسی ہے میرے یار .... تو سنے گا تو' تو بھی میرا مذاق اڑائے گا۔" مراد نے کڑوا سا منہ کر کے جواب دیا' پھر بولا۔ "تجھے یاد ہے نا' پچھلے دنوں جب ہم گاؤں کے میلے میں گئے تھے تو میں ڈھیر ساری چیزیں بناؤ سنگھار کی لایا تھا۔ آئینہ' کنگن' کنگھی' گلے کا سیپیوں والا سفید ہار' سرمہ اور مسی کی دھڑی تک لایا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے .... پھر........"

"پھر کیا ...." مراد نے ایک بار پھر بے زبان گھاس پر اپنا غصہ اتارا پھر برا سا منہ بنا کر بولا۔ "ذرا سوچ تو سہی' چڑیا سارا دانہ چگ کر پھر سے اڑ جائے اور جال میں نہ پھنسے تو شکاری کے دل پر کیا گزرتی ہے۔"

"کیا مطلب ...." میں نے حیرت سے کہا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ ساری چیزیں تو اپنی ماں کے لئے اتنے چاؤ سے لایا ہے۔"

"دماغ چل گیا ہے تیرا .... ماں اب کیا بڑھاپے میں سرخی پاؤڈر سے بناؤ سنگھار کرے گی۔" مراد نے بھنا کر جواب دیا پھر سرد آہ بھر کر کہا۔ "وہ سب تو میں اپنی حمیدن کے لئے لایا تھا۔"

"پھر........ کیا حمیدن نے لینے سے انکار کر دیا؟"

"نہیں .... چہرے پر مسکراہٹ بکھیر کر سالی نے سب چیزیں اپنی اوڑھنی میں سمیٹ لیں اور کولھے مٹکا نو دو گیارہ ہو گئی۔" مراد نے تنک کر کہا "بس' ایک شکریے پر ٹال گئی ظالم۔"

"اور تو کیا چاہتا تھا؟" میں نے معصومیت سے کہا۔ "جب تو وہ سب کچھ اسی کے لئے لایا تھا اور اس نے ہنسی خوشی تیرا تحفہ قبول کر لیا تو اب تو منہ کیوں بنا رہا ہے۔"

"لعنت ہے ان لوگوں پر جنھوں نے تیرا نام گبرو رکھ دیا .... صورت شکل اور قد کاٹھ سے پورا مرد لگتا ہے لیکن عقل سے بالکل کورے کا کورا ہی ہے۔" مراد نے جھلا کر جواب دیا پھر میں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی' میں اس سے چڑیا اور شکار والی کہانی سننا چاہتا تھا مگر وہ میرا ہاتھ جھٹک کر چلا گیا۔

○

میرے گاؤں میں صرف ایک ہی مڈل اسکول تھا مجھے پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننے کا شوق تھا۔ میری تعلیمی قابلیت مراد سے زیادہ نہ سہی لیکن ہم جماعتوں میں بہتوں سے بہتر تھی کبھی کسی کلاس میں فیل نہیں ہوا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد میرا باپ چالیس روز تک اس کا سوگ مناتا رہا پھر ایک دن اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا۔

"بس اب یہ قلم دوات کا کھیل ختم کر میرے ساتھ دکان پر بیٹھا کر جب بڑا ہو کر تجھے یہی کام کرنا ہے تو پھر پڑھ لکھ کر کیا کرے گا؟"

میں ان دنوں ساتویں جماعت میں تھا میرا ارادہ دو سال میں نویں جماعت پاس کرنے کے بعد گاؤں سے شہر جا کر اور محنت مزدوری کر کے تعلیمی شوق پورا کرنے کا تھا میری ماں جب تک زندہ رہی میرے حوصلے بڑھاتی رہی لیکن اس کا سایہ اٹھ جانے کے بعد کون تھا جو میرے باپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا پھر بھی میں نے ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا۔ "اسکول سے تو دو بجے چھٹی ہو جاتی ہے اس کے بعد میں دکان پر بھی بیٹھا کروں گا۔"

"پر پڑھائی میں وقت ضائع کرنے سے باز نہیں آئے گا .... کیوں؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"سمجھنے کی کوشش کر ابا" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اگر میں پڑھ لکھ گیا تو میرا پڑھا لکھا تیرے ہی کام آئے گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں پڑھنے پڑھانے کی۔" باپ نے گویا اپنا آخری فیصلہ صادر کرتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس حرام کی کمائی نہیں آتی جو تیری کتابوں اور کاغذ پنسل پر پھونکتا رہوں۔ سات جماعتیں پڑھ لی ہیں۔ وہی بہت ہیں کل سے میرے ساتھ دکان پر بیٹھ' اور اپنے دماغ سے یہ لاٹ گورنر کا خیال نکال دے .... کیا سمجھا۔"

میری سمجھ میں خاک نہیں آیا' ماں کہا کرتی تھی کہ علم وہ روشنی ہے جو دل و دماغ کو روشن کرتی ہے اور باپ اس روشنی کو اندھیروں میں بدلنے کا فیصلہ کر رہا تھا۔ میں نے کوئی احتجاج نہیں کیا دوسرے دن سے دکان جانے لگا لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ سچ ہی کہا ہے۔ انسان کسی کام کو کرنے کی دل میں ٹھان لے تو راستے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں نے مراد

سے آگے پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے اسکول کے بڑے ماسٹر سے بات کی اور مجھے اس بات کی اجازت مل گئی کہ میں اسکول کی فیس بھرتا رہوں تو سالانہ امتحان میں شریک ہو سکتا ہوں۔ میرے لئے یہ امید بھی تاریکی میں ٹمٹماتے ہوئے کسی دیے سے کم نہ تھی۔ میں نے اپنی کتابیں مراد کے پاس رکھوا دیں۔ دن بھر میں باپ کے ساتھ بیٹھا سودا سلف کرتا اور شام کو کھیلنے کے بہانے میدان کی طرف جانے کے بجائے مراد کے گھر چلا جاتا جو مجھے بڑی لگن اور چاؤ سے پڑھا دیا کرتا تھا۔ فیس کے سلسلے میں البتہ مجھے خدا سے شرمندہ ہونے کے باوجود دکان کے گلے سے چھوٹی چھوٹی رقمیں باپ کی نظر بچا کر پار کرنا پڑتی تھیں۔

ایک سال کسی نہ کسی طرح بیت گیا میں ساتویں جماعت پاس کر کے آٹھویں میں آگیا۔ مراد ایک سچے دوست کی طرح پڑھنے لکھنے میں میری مدد کرتا اور حوصلے بڑھاتا رہتا۔ یوں تو میں نے ساتویں جماعت پاس کر لی لیکن مجھ دکھ اس بات کا تھا کہ کلاس میں میری وہ پوزیشن نہیں آ سکی جو پہلے آیا کرتی تھی۔ بہرحال میں خدا کا شکر گزار تھا کہ اس نے مجھے ناکامی کی اذیت سے بچا لیا۔

آٹھویں جماعت کے ششماہی امتحان قریب آنے لگے تو میں نے پڑھائی پر زیادہ توجہ دینی شروع کر دی۔ شام کو مراد کے گھر پر پڑھتا اور رات کو جب باپ کے خراٹے ابھرنے لگتے تو باہر کھلے سائبان میں جا کر آہستہ سے دروازہ بند کر لیا کرتا اور دیا جلا کر سبق یاد کیا کرتا۔ مجھے امید تھی کہ میری محنت رائیگاں نہیں جائے گی اور ساتویں جماعت میں جن لڑکوں نے مجھ سے سبقت حاصل کی تھی انہیں سالانہ امتحان میں دوبارہ چت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

ان ہی دنوں نہ جانے خدا نے میرے باپ کے دل میں کیا بات ڈال دی کہ وہ مجھ پر مہربان ہو گیا۔ ایک دن خلاف توقع مجھے پاس بٹھا کر بڑے لاڈ سے بولا۔

"یہ تیری صحت روز بروز گرتی کیوں جا رہی ہے۔ کیا پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھاتا۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے ابا۔" میں نے سینہ پھلا کر بڑے فخر سے کہا "اب بھی منہ اندھیرے اٹھ کر بلاناغہ ڈنڈ لگاتا ہوں پھر بھلا میری صحت کیوں خراب ہونے

گئی؟"

"بس رہنے دے اپنی یہ طرم خانی۔" باپ نے پھر فیصلہ صادر کرتے ہوئے کہا۔ "کل سے تو روز دوپہر کو دو گھنٹے کی چھٹی کیا کر' آرام کرنے سے فائدہ ہو گا۔"

میں نے باپ کا فیصلہ سن کر بظاہر برا سا منہ بنایا لیکن دل ہی دل میں خوش تھا کہ چلو اس بہانے پڑھائی کے لئے دو گھنٹے کی مہلت اور مل گئی پھر نتیجہ وہی نکلا جسے عرف عام میں محنت کا پھل کہتے ہیں۔ میں آٹھویں جماعت میں تیسری پوزیشن حاصل کر لی جبکہ اس سے پہلے میری ساتویں یا آٹھویں پوزیشن آیا کرتی تھی۔ میرے پاس ہونے کی بھنک اڑتی اڑتی کسی طرح میرے باپ کے کانوں تک جا پہنچی۔ اس نے ایک دن مجھ سے اصلیت معلوم کی تو میں کوشش کے باوجود جھوٹ نہ بول سکا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ پر سخت برہم ہو گا اور حسب معمول بھویں سکیڑ کر اور پیشانی پر آڑی ترچھی لکیریں بنا کر مجھے بے نقط سنانا شروع کر دے گا ایسی موٹی موٹی گالیوں سے نوازے گا جس کا مطلب (اس زمانے میں) میری سمجھ میں خاک نہیں آتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اس نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھرا' میں بری طرح سہما کھڑا تھا میرا خیال تھا کہ اس کے پیار کے بعد ایک زناٹے دار تھپڑ میرے گال پر پانچ نہیں تو کم از کم چار انگلیوں کے نشان چھوڑ جائے گا لیکن تھپڑ کے بجائے باپ نے ٹھوڑی پر ہاتھ جما کر میرا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تجھے چوری چوری پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر اتنا ہی شوق ہے تو پڑھ میری طرف سے پوری پوری اجازت ہے۔" اس کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔ "تیرے اسکول کی فیس اور کاپی پنسل کا خرچ بھی اب میں اٹھاؤں گا۔ تو خوب دل لگا کر پڑھا کر' رہا دکان کا معاملہ تو سورج ڈھلتے وقت حساب کتاب دیکھنے کی خاطر گھنٹہ دو گھنٹے کو آ جایا کر۔"

باپ کی مغلظات گالیوں اور لاتوں جوتوں کے بجائے مجھے ایک عرصے بعد پیار ملا تو میری آنکھیں خوشی سے چھلک اٹھیں بے اختیار اس کی چھاتی سے لپٹ گیا۔ دوسرے دن میں نے مراد کو خوشخبری سنائی تو اس کی جہاندیدہ آنکھوں میں ایک مخصوص سی چمک ابھر آئی' مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"مجھے پتا تھا اب یہی کچھ ہونے والے ہے۔"

"کیا مطلب ......"

"پہلے تو نویں جماعت میں داخلہ لے لے پھر اطمینان سے بات کروں گا۔"

"ابھی کیوں نہی۔" میں نے اصرار کیا۔

"کچھ دن اور ٹھہر جا ...... اس کے بعد سارا چکر تیری کھوپڑی میں آ جائے گا۔"

"مراد ......" میں نے اسے شکایتی انداز میں گھورا تو نے پھر شروع کر دیں وہی بقراط جیسی باتیں۔ میں نے کتنی بار کہا ہے کہ تیری یہ لچھے دار باتیں میرے پلے نہیں پڑتیں کھل کر بات کیا کر مجھ سے۔"

"ابھی کھل کر بات کرنے کا وقت نہیں آیا میری جان ...... دو چار گھڑیاں اور مل جانے دے اس کے بعد میں تجھے پوری رام کہانی سنا دوں گا۔"

"اچھا یہ بتا ...... تیری حمیدن کا کیا حال احوال ہے۔" میں نے حمیدن کا ذکر چھیڑ دیا۔

"وہ برف کی سل کی طرح اب آہستہ آہستہ پگھلنے لگی ہے لیکن چوہدری علی بخش کو کون راضی کرے گا۔"

"کون راضی کرے گا سے تیرا مطلب؟" میں نے چونکتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں پہلے کچھ اور سوچ رہا تھا لیکن حمیدن دوسرے ٹائپ کی چھوکری ہے اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ چوری چھپے آنکھ مچولی کا کھیل اسے پسند نہیں اگر مرد ہوں تو جا کر اس کے باپ سے بات کر لوں۔"

پھر کر لے باتیں ...... تجھے کس بات کا ڈر ...... کیا تو مرد نہیں ہے؟" میں نے معصومیت سے کہا تو مراد کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھر کر پھسلتی چلی گئی۔" بڑی راز داری سے بولا۔ "اگر چوہدری کے باڑے میں گھس کر ڈنگر چوری کرنے کا معاملہ ہوتا تو میں جان پر کھیل کر وہ بھی کر گزرتا لیکن حمیدن کی اور بات ہے۔ مجھے خوف ہے کہ اگر میں نے چوہدری علی بخش کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بھی حمیدن کا ہاتھ تھامنے والی بات کی تو وہ میری کھال کھینچ کر بھس بھروا دے گا۔"

"کیا ...... کیا کہا تو نے؟" میں نے بات کو سمجھتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔ "کیا حمیدن کے ساتھ شادی کرنے کی سوچ رہا ہے۔"

"یہ دل لگی نہیں، دل کی لگی ہے پیارے۔" مراد سنجیدہ ہو گیا۔ "اس جنگلی ہرنی کے گلے میں پٹہ ڈالنے کی خاطر کوئی نہ کوئی ٹپس تو لڑانی پڑے گی۔"

"ایک کام کر ......" میں نے اپنے گاؤں کے ایک پرانے قصے کو یاد کرتے ہوئے مراد کو مشورہ دیا۔ "تو حمیدن کو ساتھ لے کر گاؤں سے چمپت ہو جا ...... چوہدری کچھ دنوں تک اڑیل گھوڑے کی طرح منہ سے جھاگ اڑائے گا پھر آپ ہی آپ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"یہ بات بھی کی تھی میں نے حمیدن سے ...... پر وہ آمادہ نہیں ہوئی۔"

"کیا کہتی ہے ......" "کہتی ہے کہ وہ میری خاطر باؤلی میں آنکھ بند کر کے چھلانگ تو لگا سکتی ہے لیکن حرام کاری نہیں کر سکتی۔"

"حرام کاری کی کیا بات ہے۔" میں نے کہا "گاؤں کی سرحد پار کرنے کے بعد تو اس سے شادی بھی کر سکتا ہے۔"

"اسے اطمینان نہیں ہے میری زبان کا۔"

"وہ کیوں ......"

"بد اچھا بدنام برا والی مثل اڑے آ گئی ہے۔" مراد نے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا۔ "اس کا خیال ہے کہ میں کچی کیری کی طرح دو چار بار دانت مار کر اسے بھی کسی پگڈنڈی پر پھینک دوں گا۔ ویسے بھی وہ اپنے باپ کے منہ پر کالک لگانے سے ڈرتی ہے۔"

"پھر بنے گا کیا ......"

"تو فکر نہ کر ...... جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو پھر موسل سے کیا ڈرنا۔" مراد لاپرواہی سے بولا۔ "کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا ...... ابھی تو میں یہی کوشش کروں گا کہ سیدھی انگلی سے گھی نکل آئے ورنہ دوسرا راستہ اختیار کرنا بھی آتا ہے مجھے۔"

"تو جان اور تیرا کام۔ پر اتنا دھیان رکھنا کہ چوہدری کے لئے دو چار بندوں کو گاجر مولی کی طرح کٹوا دینا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔"

"میں تو پہلے ہی قتل ہو چکا ہوں اس کی بیٹی کی کٹیلی نظروں سے .... اب چوہدری کیا مروائے گا۔" مراد نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا پھر بات بدل کر سنجیدگی سے بولا۔ "کل ٹھیک وقت پر اسکول آجانا اپنے باپ سے فیس لے کر' داخلے کی آخری تاریخ میں صرف دو دن رہ گئے ہیں۔"

○

نویں جماعت میں داخلہ لینے کے بعد میں پورے تن من دھن سے پڑھائی میں لگ گیا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ نویں جماعت میں اول پوزیشن لانے کی کوشش کروں گا تاکہ شہر جاؤں تو وہاں اچھے سے اچھے اسکول میں آسانی سے داخلہ مل سکے۔ پڑھائی کی شب و روز مشغولیت کی وجہ سے نہ تو میں مراد سے حمیدن کے بارے میں کچھ پوچھ سکا نہ ہی مراد نے اس کا ذکر کیا' میں اپنی دھن میں لگا ہوا تھا۔ ابا نے اب پوری طرح میری پڑھائی میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی ایک روز وہ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر سونے کے لئے لیٹا لیکن نہ جانے کیوں آنکھ بند کرنے کے بجائے پرانی چھت کے ادھڑے ہوئے پلاسٹر سے جھانکتے شہتیروں کو ٹکٹکی باندھے گھورتا رہا۔

"کیا بات ہے ابا" میں نے پڑھتے پڑھتے پوچھ ہی لیا۔ "کیا آج نیند نہیں آ رہی .... میں سر دبا دوں۔"

"رحیمو ...." اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کیا۔ "ایک بات تو بتا .... کیا تجھے تیری ماں یاد آتی ہے۔"

"کیوں نہیں ...." میں ملول ہو کر کہا۔ "ماں تو ہر حال میں ماں ہوتی ہے۔ کھلونا تو نہیں ہوتی جو ٹوٹ جائے تو دو چار روز بعد صبر آ جاتا ہے۔"

"مجھے بھی اس کی کمی کا خیال اندر ہی اندر چٹکیاں بھرتا رہتا ہے .... تو نے تو آٹھ جماعتیں پڑھ ڈالی ہیں۔ تجھے تو معلوم ہو گا کہ جب انسان تنہا ہوتا ہے تو سونے پن کا احساس اسے زنگ کی طرح چاٹتا رہتا ہے .... کوئی سنگی ساتھی نہ ہو تو زندگی اس زردے کی طرح پھیکی اور بدمزہ ہو جاتی ہے جس میں دیگ پکانے والا غلطی سے شکر ڈالنا بھول گیا ہو۔"

"تو کیوں پریشان ہوتا ہے ابا .... میں جو ہوں تیرے ساتھ۔" میں نے بڑے لاڈ سے کہا پھر اٹھ کر اس کا سر دبانے بیٹھ گیا کچھ دیر تک وہ مجھے تکتا رہا پھر کروٹ لے کر آنکھیں موند لیں۔ میں اس وقت تک سرہانے بیٹھا ہولے ہولے اس کا سر دباتا رہا جب تک اس کے خراٹے بلند ہونے نہیں شروع ہو گئے۔

اس رات میں بڑی دیر باپ کی اداسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ میری طرح شاید اسے بھی بچھڑ جانے والی ہستی کا احساس ستاتا رہتا تھا۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی میری ماں کی یاد اس کے سینے کی گہرائیوں میں زندہ تھی۔ میں نے طے کر لیا کہ اب اسے تنہائی کا احساس نہیں ہونے دوں گا زیادہ تر وقت اس کی رفاقت میں صرف کروں گا۔ دوسرے دن میں نے سرسری طور پر مراد سے ابا کی اداسی کا ذکر کیا تو وہ میرے غم میں شریک ہونے کے بجائے عجیب انداز میں مسکرانے لگا۔ مجھے اس وقت اس کی ہنسی زہر لگ رہی تھی۔

"شرم نہیں آتی تجھے۔" میں نے خفگی کا اظہار کیا۔ "دوسرے کی غمی پر اس طرح ہنسنا بھلا کہاں کی شرافت ہے۔"

"گرمی کیوں کھا رہا ہے میرے یار۔ پہلے میری ہنسی کا مطلب تو پوچھ لے۔" مراد نے جواب دیا پھر خود ہی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "تجھے یاد ہے جب تیرے باپ نے تجھے دو گھنٹے آرام کرنے کی چھٹی دی تھی پھر آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد خوشی خوشی آگے پڑھنے کی اجازت بھی دے دی تھی اور میں نے کہا تھا کہ تو نویں جماعت میں داخلہ لے لے پھر وقت آنے پر تجھے پوری کہانی سنا دوں گا۔"

"یہ کون سا وقت ہے قصہ کہانی سنانے کا" میں نے اسے تلخی سے گھورا۔

"یہی تو وہ وقت ہے پیارے جب ساری کڑیاں مل سکتی ہیں۔"

"کیا مطلب ...."

"شبراتی دھوبی کی چھوکری گلابو کو کبھی دیکھا ہے غور سے۔" مراد کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

"یہاں گلابو کا ذکر درمیان میں کیوں آ گیا۔" میں نے الجھتے ہوئے سوال کیا۔

"سارا چکر تو اسی کا ہے میرے بھولے بادشاہ۔" مراد نے رازداری سے کہا۔

"اسی کی نگاہوں نے دھوبی پاٹ لگا کر تیرے باپ کو گھائل کر دیا ہے اب شاید گلابو ہی تیری نئی ماں بننے والی ہے۔"

"نئی ماں ...." میں حیرت سے اچھل پڑا۔ "یہ کیا بکواس کر رہا ہے تو ....؟"

"یہ بکواس نہیں حقیقت ہے۔" مراد سنجیدگی سے بولا۔ "مجھے تو یہاں تک خبر ہے کہ تیرے باپ نے شبراتی کا سارا ادھار بھی معاف کر دیا ہے اور گلابو کے سلسلے میں سارا معاملہ فٹ کرلیا ہے بس شہنائی بجنے کی دیر باقی رہ گئی ہے۔"

"لیکن گلابو تو بیوہ ہے پھرابا اور اس کی عمروں میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"نقد نارائن بیچ میں آجائیں تو سارا فرق دم توڑ دیتا ہے گلابو نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی تیرے باپ پر ہاتھ مارا ہو گا۔ اس کا تو خیر کچھ نہیں بگڑے گا لیکن تیرا باپ کام آجائے گا اس فری اسٹائل دنگل میں۔"

"میں سمجھا نہیں ...."

"گلابو کی پہلی شادی ایک ادھیڑ عمر کے حکیم سے ہوئی تھی۔" مراد نے کہا۔ "کہنے کو تو حکیم نے کشتہ کھا کھا کر بڑی جان بنا رکھی تھی بڑا دم نظر آتا تھا اس کی چال ڈھال میں لیکن گلابو کے آگے اس کے سارے داؤ پیچ اور خمیرے وخیرے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ شادی کے ایک سال کے اندر اندر گلابو نے حکیم کا سارا کلف نکال دیا کپڑے کی طرح نچوڑ کر الگنی پر لٹکا دیا۔ جب تک سانس چلتی رہی غریب اسی الگنی پر جھولتا رہا جب رسی ٹوٹ گئی تو سب کچھ خاک میں مل گیا .... اور گلابو .... وہ ابھی تک بند گوبھی کی طرح ہری بھری دکھائی دیتی ہے۔"

"بینگن کیوں نہیں کہتا اسے۔" میں نے جل کر کہا "صورت شکل کی اور بات ہے لیکن رنگ تو اوپر سے نیچے تک کالا ہی کالا ہے۔"

"ہیرے کی قدر صرف جوہری ہی پرکھ سکتا ہے میری جان۔" مراد نے ترنگ میں آکر جواب دیا۔ "کپڑا ریشمی ہو اور رنگ کالا ہو تو اس کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ پھٹتے پھٹ جاتا ہے پر چمک دمک آخر دم تک برقرار رہتی ہے۔ اس پر کسی کی نظر بھی نہیں لگتی۔"

"تو نے پھر وہی الٹا سیدھا فلسفہ بگھارنا شروع کر دیا۔" میں چڑ کر بولا۔ "کوئی ایسی ترکیب سوچ کہ یہ شادی نہ ہونے پائے۔"

"کیوں ....؟ تیرا کیا بگڑے جائے گا اگر گلابو کالے گلاب کی طرح تیرے باپ کے سونے آنگن میں مہکنے آجائے گی۔"

"مجھے تیری الگنی والی بات سے خوف آ رہا ہے اگر کہیں گلابو نے میرا ابا کو بھی ...."

"پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔" مراد نے دیدے نچاتے ہوئے کہا۔ "تیرا باپ پورے گاؤں کا سب سے پرانا اور تجربے کار پنساری ہے اس نے پوری طرح ناپ تول کر اور ٹھونک بجا کر دیکھنے کے بعد ہی گلابو سے شادی کا فیصلہ کیا ہو گا۔"

"کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہو گی نا۔" میں نے اپنے اطمینان کی خاطر دریافت کیا۔

"کل کیا ہو گا یہ اوپر والے کے سوا کسے معلوم، مگر تو کیوں دبلا ہوا جا رہا ہے۔" مراد نے مجھے سمجھاتے ہوئے جواب دیا۔ "ہو جانے دے شادی تیرا باپ ادھر مصروف ہو جائے گا۔ تجھے پوری پوری آزادی حاصل ہو جائے گی۔ خوب دل لگا کر پڑھنا اور پھر تجھے کون سا مستقل گاؤں میں رہنا ہے۔ نویں پاس کرتے ہی شہر سدھار جانا، پڑھ لکھ کر بڑا صاحب بن جانا .... اس کے بعد تو، شاید بھولے سے تجھے میری یاد بھی نہیں آئے گی۔"

"کیسی باتیں کرتا ہے مراد .... تو کوئی بھولنے کی چیز ہے۔" میں نے مراد کو گلے لگاتے ہوئے کہا اس کے بعد ہم بہت دیر تک ادھرادھر کی باتیں کرتے رہے۔

○

مراد نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میرے ششماہی امتحان ابھی ختم ہی ہوئے تھے کہ گلابو سرخ جوڑے اور زیورات میں لدی پھندی چھم چھم کرتی میرے گھر آگئی۔ میرے باپ نے اس شادی کے موقع پر پورے گاؤں والوں کی دعوت کی تھی۔ اس روز مجھے

پہلی بار احساس ہوا کہ میرے باپ نے کوڑی کوڑی کما کر کتنی بڑی رقم جمع کر رکھی تھی۔

مراد کی دوسری بات بھی سچ ثابت ہوئی۔ نئی ماں کے آ جانے کے بعد میرا باپ اس کے ناز نخرے اٹھانے میں لگ گیا' اور میں اس بے جوڑ شادی پر لعنت بھیج کر پوری طرح اپنی پڑھائی میں جت گیا۔ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ سالانہ امتحان کے نتیجے کا اعلان ہوا تو خوشی سے میری باچھیں کھل اٹھیں۔ میں نے دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ مراد نے مجھے خوشی سے بھینچ بھینچ کر سینکڑوں پیار کر ڈالے' مجھے یقین تھا کہ اب شہر کے بڑے سے بڑے اسکول میں بھی مجھے آسانی سے داخلہ مل جائے گا۔

میں خوشی میں سرشار باپ کو خوش خبری سنانے دکان گیا تو نہ جانے کیوں وہ پہلے ہی غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔ میری کامیابی کی خبر سن کر مسرت کا اظہار کرنے کے بجائے کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ دو چار موٹی موٹی گالیاں سنانے کے بعد بولا۔ "تو نے دوسری پوزیشن حاصل کر لی ہے تو میں کیا کروں ...... کپڑے پھاڑ کر ناچنا شروع کر دوں کیا ...... چل دفع ہو جا یہاں سے نہیں تو ابھی دھن کر رکھ دوں گا۔"

باپ کے تیور خطرناک دیکھ کر میں سہم گیا۔ الٹے قدموں واپس لوٹ آیا ...... یا تو اسے کئی دنوں سے میرے نتیجے کی فکر تھی یا اب نتیجے کا سنتے ہی یکدم آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ بات میری سمجھ میں نہیں آئی' میں سوچ بچار کرتا گھر پہنچا تو وہاں گلابو منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ میں نے ابھی تک اسے کوئی نام نہیں دیا تھا۔ بس کسی نہ کسی طرح کام چلا لیتا تھا۔ میرے دل نے ماں کی حیثیت سے اسے قبول نہیں کیا تھا لیکن اس وقت مجھے اپنی ماں یاد آ گئی اگر آج وہ زندہ ہوتی تو خوشی سے پھولی نہ سماتی' پاس پڑوس میں لڈو بانٹتی' نذر نیاز کرتی' مجھے اپنی ممتا بھری چھاتی سے لگا کر ڈھیروں دعائیں دے ڈالتی۔

میں گلابو کے سامنے سے چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا اس کے انداز میں ایک ماں والی کوئی بات بھی تو نظر نہیں آ رہی تھی بس کسی خونخوار زخمی بلی کی طرح مجھے ٹکٹکی باندھے گھورے جا رہی تھی۔

"کیا بات ہے بوڑھے کھوسٹ کے تخم ......" وہ غراتے ہوئے بولی۔ "اس

طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر میری طرف کیا دیکھ رہا ہے۔"

"وہ ...... وہ ...... میرا نتیجہ آ گیا ہے۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"جبھی تھوتھنی لٹکائے کھڑا ہے۔" اس نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔ "کیا باپ کی طرح تو بھی لڑھک گیا امتحان میں۔"

"نہیں ......" میں نے ہمت کر کے جواب دیا۔ "میں پاس ہو گیا ہوں۔ دوسری پوزیشن لایا ہوں۔"

"پھر یہ تیرے چہرے پر پھٹکار کیوں برس رہی ہے۔" وہ بدستور تنک کر بولی۔ "جا جا کے اپنے باپ کو خوشخبری سنا وہی تیرا جشن منائے گا ...... دکان پر بیٹھا حقہ گڑگڑا کر دمہ کے مریض کی طرح کھانس رہا ہو گا' میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔"

"گیا تھا ابا کے پاس اس نے بھی دھتکار دیا۔" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں جواب دیا پھر ماں کو یاد کر کے میرا دل بھر آیا' گلابو میں اپنی ماں کا چہرہ تلاش کرتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "آج اگر ماں زندہ ہوتی تو ......"

"تو کیا کرتی وہ ......" گلابو ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"وہ ...... وہ ...... مجھے خوشی سے لپٹا کر پیار کرتی اور ......" اور میں اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ میری آنکھیں بھری برسات کی طرح برسنے لگیں۔ گلابو خاموش کھڑی مجھے گھورتی رہی پھر اس کے تیور کا تناؤ آہستہ آہستہ ڈھیلا پڑنے لگا وہ مجھے سر سے پاؤں تک اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کوئی قصائی قربانی کے بکرے کے دام لگانے سے پہلے اس کے جوڑ پٹھوں کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح مجھے تکتی رہی پھر میرے قریب آ کر سپاٹ لہجے میں بولی۔

"تو مجھے کیا سمجھتا ہے؟ کون ہوں میں تیری؟ تیرے میرے درمیان کیا رشتہ ہے؟"

"تو ...... تو ابا کی پسند ہے لیکن ...... میں تجھے ماں کے نام سے نہیں پکار سکتا۔" میں نے منہ بسورتے ہوئے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"ماں نہیں کہہ سکتا تو نہ سہی" وہ نگاہوں نگاہوں میں میرے اور اپنے قد کی پیمائش کرتے ہوئے اچانک بڑے پیار سے بولی۔ "گلابو تو کہہ سکتا ہے۔"

"گلابو .... نہیں، نہیں میں بھلا گلابو کیسے کہہ سکتا ہوں۔" میں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابا کو پتا چل گیا تو وہ میری چمڑی ادھیڑ کر رکھ دے گا۔"

"تو نے بھی بھلی کہی وہ کھوسٹ تو کسی کبڑے کو بھی اپنے گھٹنے تلے نہیں دبوچ سکتا وہ بھلا تیرا کیا بگاڑ لے گا اور پھر تو، تو گبرو ہے گلابو نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرسراتے لہجے میں کہا۔ سترہ اٹھارہ کی عمر میں پورا کڑیل جوان بن گیا ہے پر ابھی تک خود کو بچہ سمجھتا تھا۔"

"تو کچھ بھی سمجھ لیکن میں ابا کے ڈر سے تجھے ...."

"کیا ابا ابا کی رٹ لگا رکھی ہے۔" گلابو کے انداز میں کوئی اندرونی کرب شامل تھا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ میرا ہاتھ تھام کر بڑی رازداری سے بولی۔ "چل ٹھیک ہے تو باپ کی موجودگی میں جو جی آئے کہہ لیا کر لیکن تنہائی میں تو گلابو کہہ سکتا ہے۔"

"لیکن ...."

"چھوڑ بھی یہ لیکن ویکن" وہ آہستہ سے میرا ہاتھ دبا کر بولی۔ "ابھی تو کہہ رہا تھا نا کہ اگر آج تیری ماں زندہ ہوتی تو تجھے لپٹا کر پیار کرتی اور تیری کامیابی کا جشن مناتی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو گلابو کی آنکھوں میں سرخی سی تیرنے لگی۔

"تو چاہے مجھے کچھ بھی سمجھ لیکن آج میں تجھے سینے سے لگا کر پیار ضرور کروں گی۔ ایسا جشن مناؤں گی کہ تو ساری زندگی نہیں بھلا سکے گا۔"

پھر گلابو نے مجھے بے اختیار اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر میرے گال چومے تو ماں کی کمی کا احساس میری نگاہوں میں آنسو بن کر ابھر آیا۔ اس نے پوری شدت سے مجھے اپنی چھاتی سے چمٹا رکھا تھا۔ اس کے انداز میں پیار تھا وارفتگی تھی لیکن جانے کیوں مجھے اس گرمی اور دھڑکن کا عشر عشیر بھی نہ مل سکا جو ماں کے سینے سے لپٹ کر ملتا تھا۔ گلابو اپنا کردار ادا کرنے میں پوری گرمجوشی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ میں اپنے سینے پر اس کی چھاتی کی دھڑکن واضح طور پر محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اس میں میری ماں کے دودھ کی وہ سوندھی سوندھی اور مانوس مہک نہیں تھی جو میری رگوں میں خون بن کر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ بے اختیار مجھے چوم رہی تھی مگر میرے اندر کا رحیموا اسے ماں سمجھنے کو آمادہ نہ ہو سکا۔ میرا دل چاہا کہ جھوٹ موٹ ہی سہی ایک بار میں بھی میں اسے اپنے آہنی ہاتھوں کے تنگ حصار میں لپٹ لوں لیکن مجھے گلابو کے قرب سے اجنبیت اور گھٹن کا احساس ہو رہا تھا وہ بدستور مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹے پیار کر رہی تھی اس کے تنفس کی رفتار بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ اپنی دانست میں وہ مجھے ہر طریقے سے خوش کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی مگر مجھے اس کی وارفتگی میں ماں کے پیار کی ایک تلچھٹ بھی نہ مل سکی ماں کے پیار کرنے کا انداز ہی کچھ اور ہوتا تھا لیکن گلابو۔"

"چھوڑ مجھے ...." میں نے کسماتے ہوئے احتجاج کیا۔ "میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

میں نے زور لگایا تو گلابو مجھ سے علیحدہ ہو گئی لیکن اس کی نگاہیں اب بھی میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں ان آنکھوں کا گلابی رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا تھا اس کا جسم ہولے ہولے یوں کپکپا رہا تھا جیسے لرزہ دے کر بخار آنے والا ہو اس کی نظر آنے والی جلد کی رنگت تپتے ہوئے لوہے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اسے بہت غور سے دیکھا، شاید میری بے اعتنائی کے دکھ نے اسے کوئی روحانی اذیت پہنچائی تھی مجھے شرمندگی تھی کہ میرے سرد رویے نے اس کا دل توڑ دیا وہ تو میری کامیابی کا جشن منانے کو تیار تھی لیکن میں ہی پیچھے ہٹ گیا۔ شاید اس لئے کہ میں اپنی مری ہوئی ماں کی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتا تھا اپنے اپنے احساس اور سمجھ کی بات ہے۔ پھر بھی میں نے سچے دل سے معذرت کرنی چاہی۔

"مم .... مجھے معاف کر دے گلابو میں نے شاید تیرے من کو ...."

"بدھو کہیں کا۔" گلابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چھوڑ اس معافی تلافی کو .... جا، بھاگ کر کرمو کی دکان سے کھوئے والی قلا قند لے آ .... میں کھلاؤں گی تجھے اپنے ہاتھوں سے۔"

"نہیں .... رہنے دے، جب ابا آ جائے گا تب دیکھا جائے گا۔"

"کب آئے گی تجھے عقل" وہ بھنا کر بولی۔ "قلا قند میں ریت شامل ہو جائے تو سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ جاتا ہے۔"

"آج نہیں .... کل لے آؤں گا" میں نے اس کی بات کا مفہوم نہ سمجھتے ہوئے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

"تیری سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔" گلابو نے اصرار کیا۔ "طبیعت آج چاہ رہی تھی اور تو کل پر ٹال رہا ہے۔"

"وہ ...... وہ ...... دراصل آج مجھے تھکن ہو رہی ہے۔" میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"تیری مرضی ......" گلابو نے برا سا منہ بنا کر کہا پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "چل آج میں تجھے تھپک تھپک کر سلاتی ہوں ...... تو مجھے چاہے کچھ ہی سمجھے لیکن میں تو تجھ سے پیار کرتی ہوں ...... یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھ لے۔"

گلابو مجھے اپنی محبت اور پیار کا یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن کوئی جذبہ تھا جو مجھے اس کے قرب سے دور بھاگ جانے کا مشورہ دے رہا تھا میرے دل کی ہر دھڑکن پکار پکار کر مجھے باور کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

نہیں ...... نہیں ...... نہیں' گلابو تجھے ایک ماں کا پیار کبھی نہیں دے سکتی ...... ماں تو ایک مقدس رشتے کا نام ہے ...... ماں وہ ہستی ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا ...... سراب کو اگر بہتی ندی سمجھ کر اس کی سمت لپکا جائے تو انسان تمام عمر ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے ...... اب بھی وقت ہے رحیمو ...... بھاگ جا ...... کہیں دور بھاگ جا ...... گلابو کا وجود اس ناگن کی مانند ہے جو اگر ایک بار کسی کو ڈس لے تو اس کے زہر کا نشہ انسان کو دیوانہ بنا دیتا ہے ...... تجھے تو ابھی بہت کچھ کرنا ہے ...... شہر جا کر پڑھنا ہے۔ بڑا آدمی بننا ہے ...... اگر تو اس زہر کے نشے میں ڈوب گیا تو ساری زندگی غوطے ہی لگاتا رہے گا ...... مراد کی بات یاد کر رحیمو' اس نے کہا تھا کہ' گلابو نے اپنے پہلے آدمی کو پرانے لباس کی طرح نچوڑ کر الگنی پر ٹانگ دیا تھا ...... کیا تو بھی ہمیشہ الگنی پر ہی لٹکا رہنا چاہتا ہے ...... ابھی تیری عمر ہی کیا ہے ...... عورت تو وہ منہ زور سمندر ہے جس کی بپھری موجوں میں الجھ کر بڑے بڑے پیراک بھی دم توڑ دیتے ہیں ...... تو کیا شے ہے۔ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ۔

میرے اندر ایک اجنبی قوت تڑپ کر بیدار ہو گئی جو مجھے گلابو سے دور بھاگنے کا مشورہ دے رہی تھی دوسری طرف گلابو صحن کے بیچوں بیچ سیاہ بلی کی طرح کھڑی مجھے

اس انداز میں گھور رہی تھی جیسے ایک ہی جست میں اپنے پنجوں میں دبوچ لینے کے بارے میں غور کر رہی ہو۔ میں کسی نادیدہ خوف سے سہما کھڑا تھا۔ مجھے پیاس نہیں تھی لیکن میرا حلق میری طرح خشک ہو رہا تھا۔ کانٹے سے چبھ رہے تھے۔

"اب دیوانوں کی طرح کھڑا کیا سوچ رہا ہے ......" گلابو نے اس بار قدرے تحکمانہ لہجہ اختیار کیا "تھکن ہو رہی ہے تو چل کر لیٹ جا میں تھپک تھپک کر سلا دیتی ہوں تجھے ......"

"وہ ...... وہ مجھے مراد سے ایک ضروری کام یاد آ گیا' ابھی مل کر آ رہا ہوں۔" میں نے تھوک نگلتے ہوئے بمشکل کہا پھر گلابو کے جواب کا انتظار کئے بغیر تیزی سے پلٹا اور لپک کر گھر سے باہر نکل گیا۔

"الو کا پٹھا ...... حرامی کا پلا ...... بڑا معصوم بنتا ہے۔" یہ وہ آخری جملے تھے جو گھر سے نکلتے وقت میری کانوں میں گرم گرم سیسے کی مانند اترتے چلے گئے لیکن میں رکا نہیں' بس بھاگتا چلا گیا۔

○

مراد نے میری رام کہانی سنی تو پیٹ پکڑے بڑی دیر تک ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتا رہا' مجھے اس کی ہنسی اس وقت زہر لگ رہی تھی۔ میں ایک دوست کی حیثیت سے مشورہ لینے آیا تھا اور وہ میری باتوں کو ہنسی میں اڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہی ہے تیری یاری۔" میں نے اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو وہ میرا ہاتھ تھام کر بولا۔

"کہاں جا رہا ہے۔"

"جہنم میں۔"

"وہیں سے تو بچ کر آ رہا ہے میری جان ...... چل بیٹھ جا' اب نہیں ہنسوں گا۔" مراد نے اپنی ہنسی بمشکل ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"تیرا کیا مشورہ ہے۔" میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔"

"تو نے کیا سوچا ہے۔" مراد نے الٹا سوال کیا۔

"ابا کو بتا دوں گا ساری باتیں ...... صاف صاف کہ دوں گا کہ مرتے مر جاؤں گا لیکن گلابو کو کبھی ماں کی حیثیت سے قبول نہیں کروں گا۔"

"وہ کب چاہتی ہے کہ تو اسے ماں سمجھے۔"

"پھر...... وہ کیا چاہتی ہے۔" میں نے جھلا کر پوچھا۔

"کب آئے گی تجھے عقل۔" مراد نے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔ "اب تو تیری مسیں بھی خاصی بھیگ رہی ہیں۔ کیا ساری عمر کورے کا کورا ہی بنا رہے گا ...... کب سمجھے گا بالغوں والی باتیں۔"

"تیرے پاس کیا جھک مارنے آیا ہوں۔" میں نے قدرے غصے سے کہا "تو تو طرم خان بنا پھرتا ہے ...... تو کیوں نہیں سمجھا دیتا؟"

"دیکھ رحیمو' یہ باتیں ایسی نہیں ہیں جو کوئی دوسرا سمجھا سکے۔ میں تجھے صرف حالات کی اونچ نیچ سے آگاہ کر سکتا ہوں۔ آخری فیصلہ تو تجھے کرنا ہے۔"

"پھر شروع کر دیں تو نے لچھے دار باتیں' کھل کر بتاتے ہوئے کیا شرم آتی ہے؟"

"بات ہی شرم کی ہے اس لئے تو گھما پھرا کر تیری موٹی عقل میں بٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" مراد نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "تو یوں سمجھ کہ اگر گرمی شدت اختیار کر لے تو پروا کا ایک ٹھنڈا جھونکا بھی نہ چلے تو حبس ہو جاتا ہے۔ سانس گھٹنے لگتی ہے ایسے میں من کے اندر ایسی بھٹی بھڑک اٹھتی ہے جو لوہے کو بھی رانگے کی طرح پل بھر میں پگھلا سکتی ہے ...... تو' تو خوش قسمت سمجھ اپنے آپ کو کہ آتش فشاں کے دہانے سے بچ کر نکل آیا۔ ورنہ لاوا جب پھٹتا ہے تو ہرے بھرے کھیت' کھڑی فصل سنہرے اور ہریالی سب کچھ جلا کر راکھ کر دیتا ہے؟ تو کس کھیت کی مولی ہے؟"

میں پھر بھی مراد کی بات کو خاک نہ سمجھ سکا اور جب میرے اصرار پر اس نے مجھے کھل کر سب صاف صاف سمجھانا شروع کیا تو میرے کانوں کی لویں تک جلنے لگیں' میں دم بخود حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے زیر اثر خاموش بیٹھا دیدے پھاڑے مراد کی شکل تکتا رہا جب اس نے پوری بات ختم کی تو میں نے حلق تر کرنے کے لئے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بڑی گناہ والی بات ہے۔"

"وہ تو ہے۔ پر جب شیطان جذبات میں گدگدی کرتا ہے تو انسان اندھا ہو جاتا ہے' اس وقت کچھ سجھائی نہیں دیتا۔"

"ایک بات پوچھوں مراد۔" میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "سچ سچ بتائے گا۔"

"پوچھ ......" اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"کیا شیطان نے تجھے بھی کبھی گدگدی کی ہے؟"

"تیرا کیا خیال ہے؟" مراد معنی خیز انداز میں مسکرایا "یہ چمپا' فیضاں' رجو اور حمیدن کیا میرے پھوپھا یا ماموں کی رشتہ دار لگتی ہیں جو میں ان کے ناز نخرے اٹھاتا ہوں۔ جھڑکیاں سنتا ہوں اس کے باوجود گرہ سے ناوا خرچ کر کے ان کے لئے سرمہ مسی اور پاؤڈر لاتا رہتا ہوں ...... کچھ دنوں کی بات اور ہے پھر تو بھی سمجھنے لگے گا کہ تتلیوں کے ساتھ سرسوں کے کھیت میں آنکھ مچولی کھیلنے میں کیا مزہ آتا ہے۔"

"بس' بس" میں نے اپنے خون کی گردش کو قابو کرتے ہوئے کہا۔ "اب یہ بتا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے ...... آگ اور پٹرول کا ساتھ کب تک چل سکے گا۔"

"اب کی ہے نا تو نے بالغوں والی بات' قسم رجو کے قلانچیں بھرتے ہوئے بکری کے بچے کی' مزہ ہی آ گیا ...... واہ" مراد نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

"تعریف کے پل پھر کسی وقت باندھ لینا' اس وقت تو بس اتنا بتا دے کہ میں وہ کون سا طریقہ اختیار کروں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے تجھے تو ایک دم ہی پکے مردوں جیسی باتیں کرنا سیکھ گیا ...... مانتا ہے نا استاد" مراد ایک بار پھر مجھے تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بڑی ترنگ میں بولا۔ "اسی طرح شاگردی کرتا رہا تو ایک دن کندن بنا دوں گا تجھے۔"

"اچھا استاد ...... اب یہ بتاؤ کہ مجھے کرنا کیا چاہئے ......"

"یہی بات میرے مغز میں بھی کلبلا رہی ہے" اس نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا پھر تھوڑی دیر تک سوچ بچار کر کے بولا۔ "میری مان تو شہر چلا جا ...... مڈل تک پڑھ لینے کے بعد اب تیرا گاؤں میں پڑے رہنا بیکار ہی ہے۔"

"شہر تو میرے لئے بالکل انجانا ہو گا میرے یار .... پھر اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے کہ قدم جمانے تک گزر بسر کر سکوں۔"

"تو بھی ٹھیک کہتا ہے" مراد بولا۔ "سو دو سو کی بات ہوتی تو ہاتھ پاؤں مار کر بھی تیری مدد کر سکتا تھا لیکن شہر جانے' وہاں جا کر کہیں سر چھپانے اور پڑھنے لکھنے کے لئے تو ہزاروں کی ضرورت پڑے گی۔"

"پھر......." میں نے مایوسی سے کہا۔ "کیا گاؤں میں ابا کی دکان پر بیٹھ کر مجھے بھی کسی گلابو کے ہاتھوں ذلیل ہونا پڑے گا۔ موٹی موٹی اور ننگی ننگی گالیاں سننی پڑیں گی .... نہیں مراد نہیں' میں کنویں میں سر کے بل چھلانگ لگا کر اپنی زندگی ختم کر سکتا ہوں۔ لیکن کوٹھے منکانے والی بے شرم ٹیاروں کے ہاتھوں اپنی عزت کو بٹہ بھی نہیں لگنے دوں گا۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر تیرے لئے بس ایک ہی راستہ ہے۔" مراد آہستہ سے بولا۔

"وہ کیا ...."

"اپنے باپ کے گلے پر ہاتھ صاف کر دے .... اگر وہ گلابو سے بڑھاپے میں شادی رچا کر پورے گاؤں کی دعوت کر سکتا ہے تو پھر تیرا بھی حق بنتا ہے اس دولت پر جو اس نے سینت سینت کر رکھ چھوڑی ہے۔ شرافت سے تو وہ تجھے دس بیس روپے دیتے ہوئے بھی وکیلوں کی طرح جرح کرنے بیٹھ جائے گا۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے استاد" میں نے اس کے مشورے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ کچھ خبر ہے کہ ابا اپنی جمع پونجی دکان اور گھر میں کہاں کہاں چھپا کر رکھتا ہے اور ہاں .... میں اپنی ماں کے تمام زیورات بھی غائب کر کے ساتھ لے جاؤں گا .... میری ماں کا گہنا اور گلابو کے گندے جسم پر سجے اب یہ بات بھی مجھے منظور نہیں .... بعد میں اب میرے خلاف پرچی کٹاتا ہے تو کٹاتا رہے۔ جو ہو گا دیکھ جائے گا۔"

"یہ کی ہے نا تو نے مردوں والی بات ...." مراد نے میری پیٹھ ٹھونک کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

ڈھلتے سورج کی روشنی میں درختوں کے سائے تیزی سے لمبے ہو رہے تھے۔ میں مراد کے ساتھ گاؤں کی آخری سرحد پر اس سڑک کے کنارے کھڑا تھا جو ریلوے اسٹیشن تک بل کھاتی چلی گئی تھی۔ مراد نے مجھے زمانے کی بہت ساری اونچ نیچ سمجھا دی تھی وہ ایک سچے دوست اور بزرگ کی طرح مجھے نصیحتیں کر رہا تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں اپنے تجربے اور بوڑھوں کی زبانی سنی ہوئی باتوں سے آگاہ کر رہا تھا۔ میں نے اس لاٹھی پر اپنی گرفت مضبوطی سے جما لی تھی جو میرے کندھے سے ٹکی ہوئی تھی۔ لاٹھی کے سرے پر ایک گٹھری بندھی ہوئی تھی اس گٹھری میں میرے دو چار جوڑے تھے۔ دس بارہ ہزار کی وہ رقم بھی تھی جو میں نے ابا کی نگاہیں بچا کر پار کی تھی۔ میری ماں کے وہ زیور بھی تھے جو اس کے سہاگ کی نشانی تھے۔ ان مقدس زیورات پر گلابو سے زیادہ میرا حق تھا۔

"اچھا مراد .... رب راکھا۔"

"رب راکھا میرے یار ...." مراد نے رندھی ہوئی آواز میں کہا پھر مجھے گلے لگا کر بولا۔ "شہر کے ہنگاموں میں گم ہو کر اپنے بچپن کے دوست کو بھول نہ جانا رحیمو .... کبھی کبھار اپنی خیریت کی چٹھی بھیجتے رہنا۔"

"تو ابا کا خیال رکھنا مراد۔" میں نے کہا "میرے جانے کی بعد تو وہ صرف گلابو کے رحم و کرم پر ہو گا۔"

"تو فکر ہی نہ کر .... میں اس کی سن گن بھی لیتا رہوں گا۔" مراد نے یقین دلایا۔

میں ہاتھ ہلا کر جانے کے لئے پلٹا پھر کچھ یاد کر کے مراد سے پوچھا۔

"تو نے بہت دنوں سے حمیدن کے بارے میں زبان نہیں کھولی .... اب تو میں بہت دور جا رہا ہوں۔ اب تو بتا دے کہ تیرا اس کا چکر کہاں تک پہنچا .... کیا اب بھی وہی دانا چگ کر پھر سے اڑ جانے والی بات ہے۔"

"نہیں .... اب ایسی بات نہیں ہے۔" مراد نے آہستہ سے جواب دیا پھر مسکرا کر بولا۔ "پھل جب پک کر تیار ہو جائے تو اسے توڑنے میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ پیڑ کو ایک ذرا سا ہلاؤ تو خود بخود ٹوٹ جاتا ہے۔"

میں مراد کا مطلب سمجھ گیا تھا اس لئے جواب میں کچھ نہیں بولا۔ آخری بار پھر اس سے گلے ملا اور بل کھاتی ہوئی کچی پکی سڑک پر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

○

زندگی کے نو دس سال یوں پلک جھپکتے میں بیت گئے جیسے ابھی کل کی بات ہو' لگن اگر سچی ہو اور حوصلے بلند ہوں تو زندگی کے دشوار گزار اور کٹھن راستے بھی منزل کے نشان کا پتہ دینے لگتے ہیں۔ میری نیت میں کوئی کھوٹ' ارادوں میں کوئی ملاوٹ نہیں تھی اس لئے قدرت بھی مجھ پر مہربان تھی۔ میں پوری توجہ کے ساتھ تعلیمی مدارج طے کرتا رہا' بی کام کرنے کے بعد مجھے ایک خدا ترس انسان کی سفارش پر بینک کی ملازمت مل گئی اور آج ....

آج میں اسی بینک میں سیکنڈ آفیسر کی حیثیت سے فرائض منصبی پوری محنت اور دیانت داری سے سرانجام دے رہا ہوں۔ میرے افسران میرے کام سے پوری طرح مطمئن ہیں۔ وہ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ میرے پاس اب تین کمروں کا ایک خوبصورت فلیٹ ہے جس میں' میں اپنی بیوی اور ایک عدد بیٹے کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارتا ہوں۔ مجھے کوئی تردد کوئی پریشانی نہیں۔ میری بیوی مجھے بے پناہ چاہتی ہے۔ میرے ایک اشارے پر اپنی جان بھی دے سکتی ہے۔ وہ ایک مالدار اور اونچے گھرانے کی لڑکی ہے لیکن میری تنخواہ میں ہنسی خوشی بسر کرتی ہے۔

گاؤں کے بارے میں اب میں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ سوچوں بھی تو کس کے لئے۔ میرے چلے آنے کے تین ماہ بعد ہی مجھے ایک اندوہناک خبر ملی' حمیدن نے نیلا تھوتھا کھا کر اپنے دامن کے داغ کو موت کی آغوش میں چھپا لیا تھا اور چوہدری کو جب اصل صورت حال کی بھنک ملی تو اس نے غیرت میں آ کر مراد کے چوڑے چکلے سینے پر گولیاں داغ داغ کر اسے چھلنی کر دیا تھا اور خود جیل کی کسی اندھیری کال کوٹھری میں پڑا چودہ سال کی قید بامشقت بھگت رہا تھا۔ چار سال بعد مجھے اپنے باپ کی موت کی اطلاع بھی ملی' اس دن میں پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔ بقول مراد کو شاید اس الگنی کی رسی ٹوٹ گئی تھی جس پر شادی کے بعد گلابو نے اس غریب کو لٹکا رکھا تھا۔

میں نے اب گاؤں کے باسیوں کے سلسلے میں اپنے دل و دماغ کے سارے کواڑ بند کر لئے ہیں لیکن ایک سوال اب بھی کبھی کبھی میرے ذہن میں نشتر بن کر چبھنے لگتا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ میں نے گلابو کی ناپاک خواہشات کی بھینٹ چڑھنے سے انکار کر دیا تو الو کا پٹھا اور حرامی کا پلا بن گیا لیکن اگر میں نے کہیں غلطی سے اس کی دعوت قبول کر لی ہوتی تو وہ مجھے کس نام سے یاد کرتی؟"

○

موت کا ڈرامہ

تنومند اور بھری بھر کم آدمی کی انگلیوں کا حلقہ اس کی نرم و نازک گردن پر ہر لمحے تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اینی کو یقین تھا کہ اب وہ موت کے چنگل سے نجات نہ حاصل کر سکے گی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گھپ اندھیرے پھیلنے لگے تھے۔ اور سانس گھٹتی جا رہی تھی۔ وہ حتی الامکان اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھنے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس قوی ہیکل آدمی کی قوت کے آگے اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے کسی آدم خور شیر کے سامنے بکری کی ہوتی ہے۔

گو اینی کا ذہن ریکیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا مگر پھر بھی وہ اپنی زندگی کو بچانے کے لئے بڑی تیزی سے سوچ رہی تھی۔ زندگی اور موت کی اس کشمکش میں اچانک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی چنانچہ اس نے بڑی بے بسی کے عالم میں اپنا سیدھا ہاتھ اونچا کیا اور اس طاقت ور آدمی کے جسم پر آہستہ آہستہ پھیرنے لگی جو کسی وحشی درندے کی مانند اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کا یہ عمل رائیگاں نہیں گیا وہ محسوس کر رہی تھی کہ اب وہ شخص رفتہ رفتہ اپنی گرفت ڈھیلی کر رہا ہے اس کی گرم گرم سانسیں وہ بدستور اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔

زندگی کی امید نے اینی کے عمل میں مزید تیزی پیدا کر دی وہ ہر قیمت پر موت سے چھٹکارا پانے کا ارادہ کر چکی تھی خواہ اس کے عوض اسے اپنی عصمت کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑتی۔ وقت کی رفتار اسے بڑی ست محسوس ہو رہی تھی اور پھر جب وہ بولنے کے قابل ہوئی تو اس نے جلدی سے کہا تھا۔

"مجھے جان سے مت مارو۔ جو کچھ تم چاہتے ہو اس کے لئے مجھے قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں بڑی خوشی سے تمہاری ہر خواہش پوری کر دوں گی۔ یقین کرو

میں .... میں خود بھی وہی چاہتی ہوں جو تم چاہتے ہو۔"

مضبوط قوی اور سیاہ فام چہرے والا جو انیس سالہ اینی کے خیال کے مطابق چالیس سال کے لگ بھگ تھا چند ثانئے تک اپنے شکار کے چہرے پر چھائی ہوئی مردنی کو تکتا رہا پھر اس کے لمبے لمبے خوبصورت بالوں کو جو زمین کو چھو رہے تھے اپنے شکنجے میں لیتا ہوا غرایا۔

"میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ تمہیں زندہ چھوڑ دوں اگر میں نے ایسا کیا تو تم یہاں سے بچ کر سیدھی پولیس اسٹیشن کی سمت جاؤ گی۔"

اینی اس کے لہجے کی سختی کو محسوس کر کے خوف اور دہشت کے مارے لرز اٹھی لیکن پھر اس نے اپنی سوچی ہوئی ترکیب پر عمل کرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر سیاہ فام درندے کا چہرہ اتنا قریب کر لیا کہ درمیان فاصلہ محض چند انچ رہ گیا۔ ایک لمحے تک وہ اس کی آنکھوں میں چھلکتی ہوئی درندگی کو دیکھتی رہی پھر اس نے اپنی بانہیں سیاہ فام کی گردن میں حمائل کر دیں اور حالات کے تحت بڑے جذباتی انداز میں سیاہ فام کے ہونٹوں کو اپنی انگلی سے سہلانا شروع کر دیا۔ وہ بے اختیار سی ہو گئی اور اس نے اس کے بھدے ہونٹ نفرت سے اپنے منہ میں لے لئے۔ اینی کی اس وارفتگی نے اس شخص کے جسم میں رعشے کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ اینی نے محسوس کیا کہ سیاہ فام کا ہاتھ اس کے لباس کو ٹٹول رہا ہے تو وہ سرتاپا لرز کر رہ گئی۔ کمال ہوشیاری سے اس نے مرد کا ہاتھ پکڑ کر اوپر اٹھایا اور اپنی گردن کے قریب رکھ دیا۔

"ہے۔" سیاہ فام چہرے والے نے لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے سرگوشی کی۔ "تم واقعی بڑی تندرست اور اچھی لڑکی ہو۔ میں نے تمہارا انتخاب ٹھیک ہی کیا تھا۔"

اینی نے ایک بار پھر اسے دبوچ لیا۔ اب اسے یقین ہونے لگا تھا کہ وہ زندہ رہ سکے گی لیکن جیسے ہی اس نے اپنا چہرہ اٹھا کر مضبوط اور تنومند آدمی کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بڑے سرد لہجے میں بولا۔

"مجھے افسوس ہے اس کے باوجود بھی میں تمہیں مار ڈالنے کے لئے مجبور ہوں۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو اے خوبصورت لڑکی۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ سچ ہے کہ مجھے تمہاری موت پر افسوس ضرور ہو گا لیکن آج رات تمہیں مرنا ہی پڑے

گا۔ تم اگر میرے ذہن سے سوچو تو یہ بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی کہ میں تم جیسی گڑیا کو مارنے پر کیوں مجبور ہوں۔"

اینی کی رہی سہی امید بھی ختم ہوگئی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ سیاہ چہرے والا اسے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے اچانک اینی کے ذہن میں کچھ گزرے ہوئے واقعات تیزی سے گزرے۔ وہ سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ کیا یہ بے حس اور ظالم شخص وہی تو نہیں جو دو نوجوان لڑکیوں کو مار چکا تھا اور پولیس کو اس کی بڑی شدت سے تلاش تھی۔

اینی کا ذہن ایک بار پھر تاریکیوں میں ڈوبنے لگا اسے اخبار کی وہ سرخیاں یاد آ گئیں جو اٹھارہ سالہ مولر اور سترہ سالہ رابرٹا کے وحشیانہ انجام کے سلسلے میں اس کی نظروں سے گزر چکی تھیں۔ ان دونوں خوبصورت اور نوجوان لڑکیوں کو اسی نہر کے کنارے بڑی درندگی اور بے دردی سے مارا گیا تھا جہاں اس وقت ظالم اور وحشی شخص اینی کو اپنے ساتھ گھسیٹ لایا تھا۔

اخبارات میں شائع ہونے والی اطلاعات کے مطابق قاتل نے ان دونوں لڑکیوں کو پہلے بری طرح زدوکوب کیا تھا پھر ان کے ساتھ برا فعل کر کے انہیں قتل کر دیا تھا۔ ان دونوں لڑکیوں کا تعلق بھی اینی کی طرح برسلز سے تھا جو بلجیم کا دارالحکومت ہے۔ پولیس نے ان دونوں معصوم لڑکیوں کے قاتل کو تلاش کرنے کی جان توڑ کوشش کی تھی لیکن وہ اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے تھے اور اب وہی درندہ اینی کو بھی اسی نہر کے کنارے لے آیا تھا جہاں سے مولر اور رابرٹا کی کچلی ہوئی لاشیں ملی تھیں۔

دسمبر 1969ء کی وہ رات انتہائی دہشت ناک تھی جب بے حس اور وحشی درندہ اینی کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ جن حالات کے پیش نظر اینی اس کے ساتھ یہاں تک آئی تھی وہ اس قدر سادہ اور معصومانہ تھے کہ اسے کسی خطرے کا شبہ تک نہ ہو سکا۔ سارے حالات، بڑی تیزی کے ساتھ اس کے سہمے ہوئے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

اس رات وہ اپنے تیئس 23 سالہ دوست راجر کے ساتھ برسلز کی رقص گاہ میں گئی جو شہر سے خاصی دور واقع تھی۔ پہلے بھی اکثر وہ سنیچر کی رات راجر کے ساتھ

یہاں آ چکی تھی اور گئی رات یہاں رقص کرنے کے بعد ان دونوں کی واپسی ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں وہ بھلا کیوں کر سوچ سکتی تھی کہ آج کی رات اس کے لئے خطرناک ہوگی اور وہ اس درندے کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس جائے گی جو اس سے قبل دو نوجوان لڑکیوں کو اپنی جنسی درندگی کا نشانہ بنا کر قتل کر چکا تھا اور پولیس کے اعلیٰ حکام ابھی تک اسے گرفتار کرنے سے قاصر تھے۔

جس وقت وہ راجر کے ساتھ رقص گاہ میں داخل ہوئی تھی وہاں خاصی گہما گہمی تھی۔ وہ اور راجر دونوں ہی خوش تھے لیکن ابھی اینی کو وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اس نے تین آدمیوں کو دیکھا جو اس کی میز سے بمشکل پندرہ قدم کے فاصلے پر بیٹھے تھے اور اینی کو گھورے جا رہے تھے۔ اینی ان کو نظرانداز کر گئی لیکن راجر نے ان تینوں کی اس حرکت کو محسوس کیا تو غصے سے لال پیلا ہوگیا۔ وہ بھلا اس بات کو کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ کوئی اور اس کی حسین و جمیل محبوبہ کو پسندیدہ نظروں سے دیکھے چنانچہ وہ بڑی غصیلی آواز میں بولا۔

"میں ان تینوں کو ضرور سزا دوں گا۔ کمینے کہیں کے پھر راجر اپنی کرسی سے اٹھنا چاہتا تھا کہ اینی نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "بیٹھے رہو راجر اور ان کو نظرانداز کر جاؤ۔ میں بھی ان تینوں کی کمینگی کو درگزر کر رہی ہوں۔ اس کے علاوہ تعداد میں وہ تین ہیں اور تم اکیلے ہو۔ ہم یہاں دو تین راؤنڈ رقص کرنے کے بعد واپس ہولیں گے۔ رہا ان کے گھورنے کا مسئلہ تو اس کو کوئی اہمیت نہ دو۔"

راجر نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا پھر کچھ دیر بعد وہ اینی کو لے کر واپس جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ان تینوں میں سے ایک اپنی نشست سے اٹھا اور راجر اور اینی کے قریب آ کر ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی زبان میں بولا۔

"میں دخل درمعقولات کے لئے معذرت خواہ ہوں لیکن جب سے آپ دونوں یہاں آئے ہیں میں آپ کے اندر دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ اب میں اپنا تعارف بھی کرا دوں۔ دراصل میں ایک فلمساز ہوں اور تجارتی فلموں کا کاروبار کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے نئے نوجوان چہروں پر بھی کڑی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ آج کل مجھے ایک ایسے جوڑے کی تلاش ہے جو اسپورٹس کار کی اشتہاری فلم میں کام کر سکے۔ میرا

انداز ہ ہے کہ آپ دونوں اس کام کے لئے بے حد مفید رہیں گے۔ بتائیے کہ آپ فلم میں کام کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں؟"

راجر نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا پھر وہ نووارد سے تفصیل دریافت کرنے لگا۔

"سب سے پہلے آپ دونوں کو ایک ہفتے تک ریہرسل کرنی پڑے گی۔ اگر آپ کامیاب ہو گئے تو تنخواہ تقریباً" 250 ڈالر فی ہفتہ ہو گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر آپ ہمارے لئے زیادہ کار آمد ثابت ہوئے تو ہم آپ دونوں سے مستقل معاہدہ کر لیں۔ ایسی صورت میں آپ کو 1000 ڈالر فی ہفتہ بھی مل سکتے ہیں۔"

راجر جو ایک بنک میں کلرک تھا اور اینی جو ایک خوبصورت ماڈل گرل تھی۔ نووارد کی پیشکش سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ دونوں طے کر چکے تھے کہ ایک دو سال بعد جب کچھ پس انداز کر لیں گے شادی کر لیں گے اور کسی علیحدہ مکان میں مسرت کے دن گزاریں گے۔ نووارد کی پیشکش نے ان دونوں کو یہ سوچنے پر آمادہ کر دیا تھا کہ اگر وہ ریہرسل میں کامیاب ہو گئے تو بہت جلد وہ شادی کر سکیں گے۔ دونوں اپنے خیالات میں اس قدر محو تھے کہ یہ بھی نہ دیکھ سکے کہ نووارد کے ساتھ اٹھ کر کب باہر گئے تھے اور کب ان میں سے ایک واپس آکر ان کی برابر والی میز پر بیٹھ گیا تھا۔

"ریہرسل سے پیشتر آپ دونوں کو ایک اور امتحان سے بھی گزرنا ہو گا۔" نووارد نے ان دونوں کو خاموش دیکھ کر بڑی نرمی سے کہنا شروع کیا۔ "ممکن ہے آپ کو ناکامی ہو اور آپ ہمارے کام کے اہل ثابت نہ ہوں اس لئے فی الحال آپ کو اپنے مستقبل سے زیادہ امیدیں وابستہ نہیں کرنی چاہئیں۔ ویسے جو کچھ میں نے آپ دونوں کے بارے میں سنا ہے اور محسوس کیا ہے اس سے کم از کم میں پرامید ہوں کہ آپ دونوں کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں بہر حال میں چاہتا ہوں کہ مزید وقت ضائع کئے بغیر ہم کسی آخری نتیجے پر پہنچ جائیں۔ میرا تجربہ شاہد ہے کہ نفسیات کا اشتہاری فلموں میں بڑا اہم کردار ہوتا ہے چنانچہ میں کسی بھی نئے اداکار یا اداکارہ کو منتخب کرنے سے پیشتر اس کا نفسیاتی امتحان ضرور لیتا ہوں۔ یہ میرا اپنا طریقہ کار ہے جو محض پندرہ منٹ کا ہوتا ہے

لیکن تم دونوں چونکہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اس لئے یہ امتحان ایک دوسرے کی موجودگی میں ممکن نہیں فلمساز نے ایک ثانئے کے لئے توقف کیا پھر راجر کو مخاطب کر کے بولا۔ "پہلے آپ میرے ساتھ آئیں ہم باہر اپنی کار میں بیٹھیں گے جہاں میں آپ کا امتحان بھی فوری طور پر لے لوں گا اور اس کے بعد ہم کسی آخری نتیجے پر باآسانی پہنچ جائیں گے۔"

راجر کے فرشتے بھی کسی خطرے کو محسوس نہ کر سکے وہ فوراً" ہی اٹھ کر فلمساز کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں ہال سے باہر جا کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ان کی واپسی میں بمشکل دس منٹ صرف ہوئے تھے۔ فلمساز نے ہال میں آکر اینی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کے دوست نے میرے امتحان میں بڑی شاندار کامیابی حاصل کی ہے۔ آپ سے بھی یہی توقع ہے۔ اب آیئے میرے ساتھ۔"

اینی مسکراتی ہوئی اٹھی اور فلمساز کے ساتھ ہو لی ان دونوں کے ہال سے باہر جاتے ہی راجر کا دوسرا ساتھی اپنی میز سے اٹھ کر راجر کی میز پر آگیا۔ اس نے راجر سے اپنا تعارف بحیثیت ہدایت کار کرایا۔ پھر اسے فلم انڈسٹری کے بارے میں بتانے لگا۔ اس نے راجر کو اپنی گفتگو میں کچھ اتنا زیادہ الجھا لیا کہ راجر یہ نہ سوچ سکا کہ وہ اسے محض باتوں میں لگا کر وقت گزار رہا ہے بہر حال پندرہ منٹ بعد وہ راجر سے معذرت طلب کر کے اٹھا اور ہال سے باہر چلا گیا۔ مزید نصف گھنٹہ گزر جانے کے بعد راجر اپنی کرسی سے اٹھا اور باہر آیا تا کہ وہ اینی کے امتحان کا نتیجہ معلوم کر سکے لیکن باہر فلمساز کو موجود نہ پا کر وہ ہال میں آگیا۔ ابھی تک وہ کسی خطرے کی بو نہیں سونگھ سکا تھا۔ اینی سے اس کے مراسم گزشتہ پانچ سال سے تھے۔ اس عرصے میں وہ اینی کو بخوبی سمجھ چکا تھا۔ اسے اینی کے کردار پر مکمل بھروسا اور اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اینی فلمساز کے ساتھ کہیں بھی گئی ہے تو اس میں بھی کوئی مصلحت ہو گی لیکن یہ بات اس کے ذہن کو چھو کر بھی نہ گزر سکی کہ اس کی محبوبہ ایک قاتل کے بچھائے ہوئے خوبصورت جال میں بڑی معصومیت سے خطرناک حد تک پھنس چکی ہے۔

فلمساز کے ساتھ جانے کے بعد اینی پر جو گزری وہ بہت دل ہلا دینے اور عبرت

انگیز داستان ہے۔ اینی کو جن حالات سے گزرنا پڑا وہ واقعی بڑے خطرناک اور صبر آزما
تھے۔ بہت کم لڑکیاں ایسے حالات میں اپنے حواس درست رکھ پائی ہوں گی۔ وہ فلمساز
کے ساتھ اٹھ کر باہر گئی تو کچھ دیر تک فلمساز اسے اپنی گاڑی میں بیٹھا کر تجارتی
فلموں کی نفسیات کے بارے میں گفتگو کرتا رہا تھا پھر اس نے اینی سے کہا۔

"کیوں نہ میں آپ کو اسی وقت اپنے ساتھ اسٹوڈیو لے چل کر اپنے چیف
ڈائریکٹر سے ملا دوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ ابھی تک اسٹوڈیو میں موجود ہو گا اور آپ
دیکھ کر وہ یقیناً" میرے انتخاب کی داد بھی دے گا۔"

"لیکن میرا دوست میرا منتظر ہو گا' کیا وہ ہمارے ساتھ نہیں چل سکتا؟" اینی نے
پوچھا۔

"اس کی فکر مت کرو' ہم دس پندرہ منٹ تک واپس آ جائیں گے پھر جب میں
آپ کے دوست کو آپ کی شاندار کامیابی کی اطلاع دوں گا تو وہ خوشی سے اچھل پڑے
گا۔" فلمساز نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

اینی نے راجر کو ساتھ لینے پر زیادہ اصرار نہیں کیا۔ وہ گاڑی میں خاموش بیٹھی
رہی۔ فلمساز کی گاڑی اس وقت شہر کے شمالی حصے کی طرف دوڑ رہی تھی لیکن ایک
موڑ پر پہنچ کر جب اس نے گاڑی کا رخ اس بڑی سڑک کی سمت موڑا جو انیٹ ورپ
کی طرف جاتی تھی تو اینی چپ نہ رہ سکی۔

"یہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔" اینی نے دریافت کیا لیکن اب بھی وہ کوئی
خطرہ نہیں محسوس کر سکی تھی۔

"ہم اسٹوڈیو چل رہے ہیں۔" فلمساز نے بڑے نرم اور مہذب آواز میں جواب
دیا۔ اسٹوڈیو اب زیادہ دور نہیں ہے۔ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں' یقین کرو میں
قطعی بے ضرر آدمی ہوں۔"

اینی نے کوئی جواب نہ دیا لیکن پانچ منٹ بعد جب فلمساز نے تین میل دور آ
کے بعد گاڑی کو سڑک سے کچی ڈھلوان کی طرف کاٹا تو اینی چونک پڑی۔ وہ جا
جانتی تھی کہ ڈھلان کی سمت نیچے وہ بڑی نہر بہتی ہے جسے برسلز اور انیٹ ورپ
درمیان سامان لے جانے کے لئے بجرے کے ذریعے استعمال کیا جاتا ہے اینی

یہ بھی معلوم تھا کہ وہ نہر خاصی گہری اور چوڑی ہے۔

اچانک یہ محسوس کر کے وہ کسی شدید خطرے سے دوچار ہونے والی ہے اینی نے
کار کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ مارا لیکن اسے یہ جان کر سخت تعجب ہوا کہ وہاں
اندر کی سمت کوئی ہینڈل نما چیز موجود نہیں ہے۔ اسی اثناء میں گاڑی ڈھلان پر نیچے اتر
کر اس مقام پر رک گئی جہاں کچھ درخت اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں جس مقام پر
گاڑی رکی تھی وہاں سے نہر کے اوپری کنارے کا فاصلہ بمشکل چھ فٹ رہا ہو گا اینی
نے اطمینان کا سانس لیا لیکن پھر اس سے پیشتر کہ وہ کچھ سوچ سکتی سیاہ چہرے والے
فلمساز نے تیزی سے گھوم کر اینی کو شانے سے پکڑ لیا اور سخت آواز میں کہا۔

"اب یہ تمہارے اوپر منحصر ہے کہ تم آسانی سے یہ کام سرانجام دیتی ہو یا شور
مچاتی ہو۔ بہر حال اگر تم شور مچانا پسند کرو تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا اس لئے کہ
یہ جگہ قطعی ویران ہے۔ کوئی بھی تمہاری چیخ و پکار نہیں سن سکے گا۔"

اتنا کہہ کر فلمساز جس کا رویہ انتہائی جارحانہ تھا تیزی سے نیچے اترا پھر اس نے
ایک سفری اونی غالیچے کو کار سے نکال کر زمین پر بچھایا اس کے بعد اینی کو گھسیٹ کر
کار سے باہر نکالا اور بڑے جوشیلے انداز میں اسے دھکا دے کر غالیچے پر گرا دیا۔

اینی جو حالات سے بری طرح خوفزدہ تھی سہم کر رہ گئی۔ اسے یقین تھا کہ اب
اس کی موت یقینی ہے اس لئے کہ اسی مقام پر اس سے پہلے دو نوجوان لڑکیوں کو بڑی
بے دردی سے مارا گیا تھا اور دونوں موقعوں پر پوسٹمارٹم کی رپورٹ نے جنسی درندگی
کی کہانی دہرائی تھی۔ بہر حال اس نے اپنے سہمے ہوئے ذہن کو قابو میں رکھنے کی جان
توڑ کوشش کی اور اپنی زندگی کو برقرار رکھنے اور اس بے حس درندے کے چنگل سے
بچ نکلنے کی ترکیب سوچنے لگی۔ جن حالات سے وہ اس وقت دوچار تھی اس کے بارے
میں اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا بہر حال وہ حالات کے سانچے میں خود کو
ڈھالنے کا فیصلہ کر چکی تھی اس نے فوری طور پر یہی سوچا کہ اگر وہ بخوشی اس ظالم
کے ساتھ منہ کالا کرنے پر اپنی آمادگی کا اظہار کر دے تو ممکن ہے اسکی زندگی بچ
جائے۔ اس نے ایک جنسی رسالے میں بھی پڑھ رکھا تھا کہ ایسے موقعوں پر عورت
اگر چیخ پکار کرنے کے بجائے خاموشی سے اپنا سب کچھ حملہ آور کو سونپ دے تو اس

کے قتل ہونے کا امکان کم ہوتے ہیں چنانچہ اس نے فوری طور پر حملہ آور کے ساتھ تعاون کا فیصلہ کرلیا۔

انکار کرنے کی صورت میں اسے یقین تھا کہ وہ اسے بڑی درندگی سے مار ڈالے گا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ چونکہ راجر اس سے مل چکا ہے اس لئے اس کی موت کے بعد اس کا بیان قاتل کو سزا ضرور دلا دے گا۔

لیکن اب کیا ہو' اب تو ہر صورت میں اس کی موت یقینی تھی جسے وہ ہر قیمت پر بچانا چاہتی تھی۔ وہ اس بات کو بخوبی جان چکی تھی کہ اس کا واسطہ ایک ایسے دیوانے شخص سے پڑا ہے جس سے رحم کی توقع فضول تھی۔

غرضیکہ اینی نے حالات کی نوعیت کو جاننے کے بعد ہی خودسپردگی کا اظہار کیا۔ وہ اس بے حس حملہ آور کو پیار کر رہی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے اینی کو شدید نفرت کا احساس ہو رہا تھا لیکن موقع کی نزاکت کے تحت وہ اس کے لئے مجبور تھی چنانچہ وہ حملہ آور کو پیار کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے جسم پر ادھرادھر ہاتھ بھی پھیرتی جا رہی تھی تاکہ اس کے جذبات کو اور برانگیختہ کرسکے اور تب ہی اینی کے ذہن میں ایک ترکیب آگئی جس پر عمل کرکے وہ اس وحشی سے جان بچا سکتی تھی۔ اپنی سوچی ہوئی ترکیب پر غور کرنے کے بعد ہی اس نے بے حس درندے سے بڑے والہانہ اور جوشیلے لہجے میں کہا۔ "اگر تم نے واقعی میرے جسم سے آسودگی حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو کیوں نہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"کیا تم بھول رہی ہو میری گڑیا کہ میں تم کو بہر صورت جان سے مار ڈالنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔" سیاہ چہرے والے نے اینی کو تعجب خیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "مجھے حیرت ہے کہ تم اپنے انجام کو جان لینے کے باوجود اس قدر مطمئن نظر آ رہی ہو۔"

جواب میں اینی زبردستی مسکرا دی پھر اس نے وحشی درندہ نما انسان کو بھینچ کر ایک طویل بوسہ اس کے غلیظ ہونٹوں پر ثبت کرتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم مجھے جان سے نہیں مار سکو گے ایک دفعہ مجھے سمجھ لینے میری جسمانی لذتوں کو پالینے کے بعد تمہیں اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا۔ تم ابھی اتنے د

نہیں ہو۔ بہرحال آؤ۔ پہلے ہم اپنی زندگی کے ان لمحوں کو پر مسرت بنائیں۔ موت مقدر ہے تو ان لمحوں کا لطف کیوں کھویا جائے۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اس وقت کی بات کرو۔"

سیاہ چہرے والا بدستور حیرت بھری نظروں سے اینی کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کی پشت نہر کی سمت تھی۔ وہ نہر کے کنارے سے بمشکل چھ فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا جس کے بعد دس فٹ نیچے نہر بہہ رہی تھی۔ اینی کو مکمل یقین تھا کہ جنسی آسودگی حاصل کر لینے کے بعد بھی وہ شخص اسے زندہ نہیں چھوڑے گا چنانچہ وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ اگر کسی طرح وہ اسے نہر میں دھکا دینے میں کامیاب ہو جائے تو اسے بھاگ نکلنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اس کو یہ بات بھی معلوم تھی کہ نہر کے دونوں کنارے پختہ اور ڈھلوان تھے اور جتنے عرصے میں وہ ظالم آدمی اوپر پہنچنے کی کوشش کرے گا وہ باآسانی وہاں سے بہت دور جا چکی ہو گی۔

اینی کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ زندگی میں اس کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی مرد کے ساتھ اتنی شرمناک حد تک سامنے آئی ہو۔ جب اس نے دیکھا کہ سیاہ فام شخص پوری طرح سرمست ہو چکا ہے تو اس نے دیر لگانی مناسب نہیں سمجھی۔ کچھ سوچ کر وہ اٹھ بیٹھی اور بڑی لگاوٹ بھرے انداز میں ہاتھ بڑھا کر اس کے پتلون کی پیٹی کھولنے لگی۔ سیاہ چہرے والا اینی کی اس حرکت پر حیرت زدہ تھا۔ شاید اسی لئے وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ اینی نے کب اپنا سیدھا پاؤں اس کے پیچھے کھسکا دیا تھا اور کب اس کا سیدھا پاؤں بلند ہو کر اس کے گھٹنے کے ذرا نیچے تک پہنچ چکا تھا۔ اینی بدستور اپنے عمل میں مصروف تھی۔ اس نے اپنی سوچی ہوئی ترکیب کو عملی جامہ پہنا دیا۔

بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اینی نے اپنی الٹی ٹانگ کو بلند کیا اور پوری قوت سے اس وحشی درندے کے پیٹ کے نچلے حصے پر مارا اور سیدھی ٹانگ کو گھٹنے کے پچھلے جوڑ پر مارا۔ اسے اپنے مقصد میں مایوسی نہیں ہوئی۔ حملہ آور جس کے لئے اینی کی کارروائی قطعی غیر متوقع تھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور کنارے سے لڑھک کر نہر میں جا گرا اینی نے اس کے پانی میں گرنے کی آواز بھی سنی تھی۔ گرتے ہوئے وہ بڑی

خونخوار آواز میں چلایا۔ وہ نیم برہنہ تھا۔ پتلون اس کے پاؤں میں الجھی ہوئی تھی۔

حملہ آور کو نہر میں گرانے کے بعد اینی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے یاد تھا کہ اس شیطان صفت شخص نے گاڑی کی چابی انجن بند کرنے کے بعد نہیں نکالی تھی چنانچہ وہ لپک کر گاڑی میں بیٹھی اور انجن اسٹارٹ کر کے اسے تیزی سے اوپر سڑک کی جانب لے گئی جس وقت وہ سڑک پر پہنچی اس وقت اس نے ایک نظر پلٹ کر نہر کی طرف دیکھا پھر گاڑی کو پوری رفتار سے قریبی پولیس اسٹیشن کی سمت دوڑانے لگی۔

پولیس اسٹیشن کے ڈیوٹی آفیسر نے تفصیلات معلوم ہوتے ہی فوری کارروائی کا بندوبست کیا۔ چنانچہ فوراً" ہی وہاں موجود چھ افسروں نے اپنے اپنے ریوالور سنبھالے اور باہر کھڑی ہوئی پولیس کار کی سمت دوڑ پڑے۔ دوسرے ہی لمحے تینوں گاڑیاں اس سمت روانہ ہو گئی جس کی نشاندہی اینی نے ڈیوٹی آفیسر سے کی تھی۔ اینی کو پولیس اسٹیشن پر ہی چھوڑ دیا گیا۔

پولیس کی گاڑیوں نے موقع پر پہنچ کر پورے علاقے کا محاصرہ کر لیا۔ ایک کار اس مقام سے دو میل آگے جا کر رکی جہاں اینی پر حملہ کیا گیا تھا۔ دوسری گاڑی اس مقا سے دو میل پہلے ہی رک گئی اور تیسری گاڑی ٹھیک اسی جگہ جا کر رکی جہاں سے ا نے حملہ آور کو نہر میں اچھالا تھا روانگی کے وقت پولیس افسران نے قرب و جوار گشتی دستوں کو بھی ریڈیو کال کے ذریعے حالات سے آگاہ کر دیا تا کہ وہ چاروں طر پھیل جائیں۔ مطلوبہ آدمی کے بارے میں گشتی دستوں کے افسران کو یہی بتایا گیا تھا وہ پوری طرح پانی میں شرابور ہو گا اس لئے اس کی شناخت مشکل نہیں ہو گی۔

پولیس کے دستوں کو مطلوبہ حملہ آور کی گرفتاری میں کوئی مشکل پیش نہیں آ انہوں نے سرچ لائٹ کے ذریعے اسے درختوں اور جھاڑیوں کے قریب سے ڈھ نکالا تھا۔ جب ایک پولیس افسر نے اس سے بھیگ جانے کی وجہ دریافت کی تو اس بڑی لاپرواہی سے کہا۔

"میں بہت زیادہ نشے میں تھا اس لئے غالباً" نہر میں گر گیا تھا۔"

جس وقت فلسماز کو جس نے اپنا نام جوزف وین ڈن ایلڈی بتایا تھا پولیس اس لایا گیا۔ اس وقت اینی کافی پی رہی تھی لیکن جیسے ہی اس کی نظر فلسماز پر پڑی کا

پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ سیاہ چہرے والے کی نظر اینی پر پڑی تو وہ ایک بار پھر بے قابو ہو کر انتہائی طیش کی حالت میں اس کی جانب لپکا۔ اگر پولیس افسران نے اسے دوڑ کر جکڑ نہ لیا ہوتا تو وہ یقیناً" اس پر خطرناک حملہ کر بیٹھتا۔

"تم ——— ذلیل اور مکار عورت، تم نے میرے ساتھ چال بازی اور دغا بازی کرنے کی کوشش کر کے اپنی موت کو دعوت دی ہے۔" وہ اینی کو خونخوار نظروں سے گھورتا ہوا غرایا۔ "تم نے مجھے دھوکا دینے اور بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے۔ مگر اچھی طرح اس بات کو یاد رکھنا کہ جس وقت بھی مجھے گرفتاری سے نجات ملی۔ میں خواہ دنیا میں اور کوئی برا کام کروں یا نہ کروں لیکن تمہیں ضرور جان سے مار ڈالوں گا چاہے مجھے پھانسی کا پھندا ہی نصیب ہو۔"

"اس خیال کو اپنے گندے ذہن سے نکال دو جوزف۔" ایک پولیس افسر نے ڈپٹ کر کہا۔ "اب ایک طویل مدت تک تمہیں کسی کو نقصان پہنچانے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ تم اپنی خیر مناؤ اس لئے کہ تم پر اینی پر حملہ آور ہونے کے علاوہ دو دوسری لڑکیوں کو قتل کرنے کا الزام بھی عائد ہوتا ہے۔" ہمیں تمہاری تلاش بہت دنوں سے تھی۔"

"یہ غلط ہے۔ میں نے کسی لڑکی کو نہیں مارا۔" جوزف چیخ پڑا۔

"اس کا ثبوت تم اب عدالت میں دینا۔" افسر نے کرخت لہجے میں کہا پھر جوزف کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

اس وقت جبکہ یہ تحریر مرتب کی گئی جوزف جیل میں ہے۔ اس نے ضمانت پر رہائی حاصل کرنے کی متعدد بار کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ عدالت میں اس کے خلاف کئی مقدمات لڑے جا رہے ہیں۔" دو لڑکیوں کے ساتھ زنا بالجبر اور وحشیانہ قتل، اینی کا اغوا وغیرہ اور اب اس کا رہا ہونا مشکل ہے۔ نہیں معلوم وہ اور کتنی لڑکیوں کو اپنی درندگی اور وحشت کا نشانہ بناتا۔ اگر ایک نازک اور خطرناک لمحے میں اینی نے اعلیٰ درجے کی ذہانت اور چالاکی کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا۔ بلجیم کی پولیس نے اینی کو انعامات سے نوازا اور دنیا کے تقریباً" تمام بڑے اخبارات نے اس کی آپ بیتی پر اداریے نوٹ اور تبصرے شائع کئے اور شائع کر رہے ہیں۔ اس کہانی کی سرخیاں دنیا

کے مختلف اخبارات نے اپنے اپنے طور پر جمائی ہیں "بے شرمی کا انعام' جنس کا دو رخ' جنس کا معجزہ زندگی کے لئے' جرم و سزا کی کہانی' آخری حربہ وغیرہ بتائیے اگر آپ ایڈیٹر ہوتے تو اس واقعے کا کیا عنوان تجویز کرتے۔

پراسرار مخبر

براڈوے اسٹریٹ پر واقع پوسٹ آفس کا سارا عملہ شام کے ٹھیک چار بجتے ہی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گیا۔ لیکن دو افراد ایسے تھے جو ابھی تک کاموں میں مشغول تھے۔ ان میں سے ایک پوسٹ ماسٹر تھا جو دن بھر کی کارکردگی کی رپورٹ تیار کر رہا تھا اور دوسرا چالیس سالہ خزانچی تھا۔ جو جالیوں کے کٹہرے کے اندر بیٹھا دن بھر کی جمع پونجی کا حساب چیک کر رہا تھا۔

گہرے سرخ رنگ کی اسپورٹ کار براڈوے اسٹریٹ کے بڑے چورستے سے تیزی سے بائیں جانب گھومی پھر پوسٹ آفس کے صدر دروازے کے سامنے پہنچ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اسپورٹ کار سے جو شخص نیچے اترا وہ کسی اعلیٰ گھرانے کا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے جسم پر تھری پیس سوٹ تھا۔ سر پر سوٹ سے میچ کرتی ہوئی فیلٹ جمی ہوئی تھی۔ چہرے سے بلا کی سنجیدگی اور ذہانت مترشح تھی۔ آنکھوں میں عقاب کی سی چمک موجود تھی ـــــــــ اس کے لانبے چہرے پر فرنچ کٹ ڈاڑھی کچھ زیادہ ہی کھپ رہی تھی۔ رنگت کے اعتبار سے وہ مقامی باشندہ ہی لگ رہا تھا۔ عمر پچاس اور پچپن کے درمیان رہی ہو گی اپنی اسپورٹ کار سے اتر کر وہ سیدھا پوسٹ آفس کی سیڑھیوں کی طرف آ گیا۔ بیرونی پھاٹک پر موجود چوکیدار نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر اسے روک کر بولا۔

"میرے محترم پوسٹ آفس بند ہو چکا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے دوست لیکن میں رابرٹ کا دوست ہوں۔ اس نے مجھے ایک ضروری کام سے اس وقت بلایا تھا ـــــــــ کیا وہ اندر موجود ہے۔"

"جی ہاں ـــــــــ" چوکیدار نے اسے جانے کا راستہ دے دیا۔

فرنچ کٹ ڈاڑھی والا' چوکیدار کو مسکراتے ہوئے دیکھتا پھاٹک سے اندر آیا!
کسی فوری خیال کے تحت وہ دوبارہ پلٹا اور چوکیدار کو مخاطب کر کے کہا۔

"میرے دوست ——— کیا تم میرا ایک کام کر سکو گے۔"

"فرمایئے۔"

"اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو مجھے پرنس ہنری کا تمباکو لا دو۔" ڈاڑھی والے نے جیب سے ایک بڑا نوٹ نکال کر چوکیدار کی طرف بڑھایا پھر جواب کا انتظار کئے بغیر اندر چلا گیا۔

پوسٹ آفس کا کیشیر رابرٹ اپنے جالی والے کمرے میں بیٹھا نوٹوں کی گڈیوں کو شمار کر رہا تھا کہ ڈاڑھی والا دبے قدموں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ رابرٹ نے نظر اٹھا کر اجنبی کو دیکھا تو وہ بے تحاشہ لرز اٹھا۔ اس کی بوکھلاہٹ کی وجہ اعشاریہ تین آٹھ کا وہ ریوالور ہی تھا جو ڈاڑھی والے نے اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

"جلدی کرو میرے دوست ——— مجھے زیادہ نہیں صرف بیس ہزار پونڈ درکار ہیں۔ انکار کی صورت میں مجھے مجبوراً تمہارے خون سے ہاتھ رنگنے ہوں گے۔ تمہاری اطلاع کے لئے یہ بھی عرض کر دوں کہ میرے ریوالور میں سائیلنسر بھی فٹ ہے اس لئے تمہاری موت کی اطلاع فوری طور پر تمہارے کسی دوسرے ساتھی کو نہ ہو سکے گی۔"

رابرٹ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے اجنبی کی نگاہوں میں سفاکی کی جھلک دیکھی تو جلدی جلدی مطلوبہ رقم کی گڈیاں گن کر اس کے سامنے رکھ دیں ——— فرنچ کٹ ڈاڑھی والے نے برق رفتاری سے ساری گڈیاں اٹھا کر اپنی جیبوں میں رکھیں پھر تیزی سے لمبے لمبے قدم اٹھاتا دروازے کی طرف لپکا لیکن ابھی صدر دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ کیشیر نے چلانا شروع کر دیا۔

"بچاؤ ——— پکڑو ——— میں لٹ گیا۔"

فرنچ کٹ ڈاڑھی والے نے پلٹ کر رابرٹ کی طرف دیکھا پھر جلدی سے دوڑتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے آیا اور اپنی اسپورٹس کار میں بیٹھ کر نو دو گیارہ ہو گیا

——— جتنی دیر میں رابرٹ اور پوسٹ ماسٹر چیختے چلاتے باہر نکلے' سرخ رنگ کی کار لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی ———!

کیپٹن پاول گزشتہ تین روز سے پوسٹ آفس میں پڑنے والے ڈاکے کے سلسلے میں لوگوں سے پوچھ گچھ کرتا پھر رہا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ کوئی ایسا سراغ حاصل نہ کر سکا جو مجرم تک اس کی رہبری کرنے میں معاون ثابت ہوتا۔ اس وقت بھی وہ اپنے آفس میں بیٹھا کیس کی بکھری ہوئی کڑیوں کو ملانے کی سعی میں مصروف تھا کہ فون کی گھنٹی بجی اور پاول نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر رسیور اٹھا لیا۔

"یس ——— کیپٹن پاول اسپیکنگ۔"

"کیپٹن ——— میں قانون کا ایک دوست اس وقت تم سے مخاطب ہوں۔" دوسری طرف سے کسی نے بھاری آواز میں کہا۔ "پوسٹ آفس کی ڈکیتی والے کیس میں میرے پاس ایک اہم اطلاع موجود ہے جو میں تم تک پہنچانا چاہتا ہوں۔"

"کیا تم جانتے ہو کہ مجرم کون ہے۔"

"ہاں ——— تم بھی اگر ذرا سی ذہانت سے کام لیتے تو شاید اب تک مجرم تک پہنچ گئے ہوتے۔"

"کیا مطلب ———" پاول نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"مطلب کی بات تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہو" رسیور پر بھاری آواز ابھری۔ "میں تمہیں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ سرخ رنگ کی اسپورٹس کار جو ابھی تک تمہاری تحویل میں ہے اس میں تمہارے لئے ایک اہم ثبوت موجود ہے۔"

"وہ کیا ———"

"مجرم کے فنگر پرنٹس ———"

"تمہارا خیال غلط ہے۔" کیپٹن پاول نے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا۔ "میں کار کی تلاشی لے چکا ہوں اور اس کے ساتھ ہی میں نے ممکنہ فنگر پرنٹس بھی حاصل کرنے کے لئے کوشش کی تھی مگر کوئی نشان نہیں مل سکا ——— لیکن تم کون ہو۔"

"کیپٹن ——— کیا تمہارا یہ خیال تھا کہ مجرم جو لارڈ کی کار چرا سکتا ہے

اور دن دہاڑے کسی پوسٹ آفس کے خزانچی کو لوٹ سکتا ہے وہ اتنا احمق ہو گا کہ
تمہارے لئے کار پر اپنے فنگر پرنٹس چھوڑ جائے گا۔"

"لیکن ابھی تم نے بھی یہی کہا تھا کہ کار میں مجرم کے فنگر پرنٹس موجود ہیں۔"

"ہاں ——— میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ اگر تم ثبوت چاہتے ہو تو کار کی
سیٹوں کے نیچے سے اس چرمی پرس کو تلاش کرنے کی کوشش کرو جو مجرم کی جیب سے
اتفاقیہ طور پر گر گیا تھا اور جلد بازی میں مجرم اسے دیکھ نہیں پایا تھا۔"

"مگر تم کون ہو اور تمہیں یہ اطلاعات ——— ہیلو ہیلو ———"

کیپٹن پاول نے جھلائے ہوئے لہجے میں دو تین بار ماؤتھ پیس میں ہیلو ہیلو کہا پھر ریسیور
کریڈل پر رکھ دیا۔ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کیا جا چکا تھا۔

ریسیور رکھ کر کیپٹن ایک لمحے تک کچھ سوچتا رہا پھر کسی خیال سے اٹھ کر باہر آیا
اور گیراج میں جا کر اس سرخ رنگ کی اسپورٹس کار کو از سرے نو دیکھنے لگا جو ابھی
تک اس کی تحویل میں موجود تھی۔ اس وقت کیپٹن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب
اس نے ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے ایک چرمی پرس دیکھا تھا۔ بڑی احتیاط سے اس نے
پرس کو ایک کونے سے چٹکی سے پکڑ کر اٹھایا اور سیدھا فنگر پرنٹس سیکشن کی طرف چلا
گیا۔ ویسے اس بات پر اسے حیرت ضرور تھی کہ آخر مخبر کو اس پرس کے بارے میں
کیوں کر معلوم ہو گیا جبکہ پوسٹ آفس کے چوکیدار کے بیان کے مطابق اسپورٹس کار
میں صرف ایک آدمی موجود تھا۔

فنگر پرنٹس سیکشن میں جا کر کیپٹن پاول نے اپنی موجودگی میں چرمی پرس پر پائے
جانے والے نشانات کی تصویریں اتروائیں پھر ان نشانات کو سر بمہر کر کے اس وقت
فنگر پرنٹس بیورو کے سربراہ کے پاس فوری رپورٹ کے لئے روانہ کر دیا۔

○

پروفیسر تھامس اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھا ایک موٹی کتاب کے مطالعے
میں مصروف تھا۔ جب اس کے ملازم نے اندر داخل ہو کر اسے ایک وزیٹنگ کارڈ
پیش کیا جو کیپٹن پاول کے سوا کسی اور کا نہیں تھا۔ پروفیسر نے ایک نظر کارڈ پر ڈالی پھر
ملازم کو گھورتے ہوئے بولا۔

"کیا کیپٹن پاول کو کوئی بہت ضروری کام ہے۔"

"میں نے دریافت کیا تھا جناب ——— لیکن وہ کہتے ہیں کہ کام کی نوعیت
آپ کے سوا کسی اور کو نہیں بتائی جا سکتی۔"

"تم انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ ——— میں آتا ہوں۔"

ملازم کے جانے کے بعد پروفیسر دوبارہ مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ پندرہ منٹ
بعد وہ کتاب بند کر کے اٹھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے
کہ اسے اس وقت کیپٹن پاول کی آمد گراں گزری ہے۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر اس نے کیپٹن کو بغور دیکھا پھر بڑے پر وقار انداز
میں چلتا ہوا ایک صوفے کے قریب جا کر اس پر بیٹھ گیا۔ اس تمام عرصے میں کیپٹن
پاول کی نظریں ایک لمحے کے لئے بھی پروفیسر تھامس کے چہرے سے نہیں ہٹی تھیں۔

"کیا تم کو کوئی ضروری کام آن پڑا ہے کیپٹن۔" پروفیسر نے اپنا پائپ جلا کر کثیف
دھواں اگلتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں اس وقت آپ کے لئے زحمت کا باعث بنا لیکن
———" کیپٹن اپنا جملہ نامکمل چھوڑ کر پروفیسر کے چہرے پر اس کا رد عمل دیکھنے
لگا لیکن اسے اپنے ارادے میں بری طرح ناکامی ہوئی۔ پروفیسر کا چہرہ کسی قسم کے
جذبات کی ترجمانی سے یکسر عاری تھا۔

"تم چپ کیوں ہو گئے کیپٹن" پروفیسر تھامس نے بدستور سنجیدگی سے پوچھا۔

"پروفیسر ——— آپ کو اخبارات کے ذریعے غالباً" اس ڈکیتی کا حال معلوم
ہو چکا ہو گا جو آج سے چار روز پیشتر براڈوے اسٹریٹ پر واقع پوسٹ آفس میں ہوئی
تھی۔"

"ہاں ——— میرا خیال ہے کہ وہ خبر میری نظروں سے گزری ضرور تھی
لیکن میں چونکہ جرائم کی خبریں زیادہ توجہ سے نہیں پڑھتا اس لئے کوئی دھیان نہیں
دیا۔" پروفیسر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا اسی کیس کے سلسلے میں قانون کو میری
خدمات درکار ہیں۔"

کیپٹن پاول نے فوراً" ہی کوئی جواب نہ دیا۔ پروفیسر تھامس کی شخصیت سے وہ

بخوبی واقف تھا۔ اپنی گرانقدر سائنسی خدمات اور حیرت انگیز ایجادات کے سلسلے میں پروفیسر کو متعدد بار حکومت کی طرف سے اعلیٰ اعزاز سے نوازا جا چکا تھا۔ اعلیٰ حکام سے اس کے تعلقات بھی خاصے گہرے اور بے تکلفانہ تھے اس لئے کیپٹن اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

"کیا بات ہے کیپٹن ——— تم کس سوچ میں ڈوب گئے۔" پروفیسر تھامس نے کیپٹن پاول کے چہرے پر چھائی سنجیدگی کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

کیپٹن ایک بار پھر سٹپٹا کر رہ گیا۔ اس نے صوفے پر پہلو بدلا پھر کچھ سوچ کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اس ڈکیتی میں جو سرخ رنگ کی اسپورٹس کار استعمال کی گئی تھی اسے ایک لارڈ مسٹر ہنری جارج کے بنگلے سے چوری کیا گیا تھا۔"

"مجھے اس واردات کی تفصیلات سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" پروفیسر نے قدرے ناگوار انداز میں کہا۔ "تم اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔"

"سرخ کار سے ہمیں ایک چرمی پرس دستیاب ہوا ہے۔ جس پر مجرم کے ہاتھوں کے فنگر پرنٹس بھی موجود تھے۔"

"کیپٹن ——— میں نہیں سمجھ سکا کہ ان باتوں سے تمہارا مقصد کیا ہے۔" پروفیسر جھلا گیا۔

"گستاخی معاف پروفیسر ———" پاول نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ "کیا آپ کا کوئی پرس تو ادھر تین چار دنوں میں گم نہیں ہوا تھا۔"

"نہیں ——— لیکن تم کہنا کیا چاہتے ہو۔"

"مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنا پڑ رہا ہے پروفیسر کہ وہ پرس جو مجرم کی نشاندہی کے طور پر پولیس کے لئے ایک اہم ثبوت فراہم کرنے کا ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ اس پر سے آپ ہی کے فنگر پرنٹس ملے ہیں۔"

"تم ہوش میں تو ہو کیپٹن۔" پروفیسر دھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں اپنے فرض کی ادائیگی کے معاملے میں حفظ مراتب کا لحاظ کرنے سے معذور ہوں پروفیسر! مجھے افسوس ہے میں آپ کو گرفتار کرنے کے لئے آیا ہوں۔" کیپٹن پاول نے ٹھوس آواز میں کہا پھر جیب سے پروفیسر تھامس کے وارنٹ گرفتاری نکال کر اسے

دکھانے لگا۔

پروفیسر تھامس کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے کیپٹن کو دیکھا پھر چیخ کر بولا۔

"میں دیکھوں گا کہ تم کتنے دنوں تک اپنے عہدے پر فائز رہ سکتے ہو۔"

"اس کا فیصلہ عدالت کرے گی کہ قصوروار اور مجرم کون ہے۔ فی الحال آپ کو میرے ساتھ ہیڈ کوارٹر چلنا پڑے گا۔" اس بار کیپٹن پاول نے افسرانہ شان سے بڑے دبنگ لہجے میں کہا پھر وارنٹ گرفتاری تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔

پروفیسر نے ایک بار پھر کیپٹن کو حقارت اور نفرت بھری نظروں سے گھورا پھر ہونٹ کاٹتا ہوا اس کے ساتھ جانے کے لئے آمادہ ہو گیا۔

تیسری پیشی پر عدالت نے کیپٹن پاول کے پیش کردہ دلائل اور فنگر پرنٹ بیورو کے ماہر کی رپورٹ پر پروفیسر تھامس کو ڈکیتی کے کیس کا مجرم گردانتے ہوئے دو سال قید کی سزا سنا دی ——— پروفیسر کے وکیل مورگن نے جو جرائم کے مقدموں کا ماہر سمجھا جاتا تھا اور اب تک وہ اپنی خداداد صلاحیتوں اور وسیع تجربوں کی بنا پر ہزاروں قاتلوں کو پھانسی کے پھندے سے نجات دلا چکا تھا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن اسے ناکامی ہوئی۔

جس وقت پروفیسر تھامس کو پولیس کے نرغے میں عدالت سے باہر لایا جا رہا تھا۔ کیپٹن پاول نے اس سے بڑی سرسری ملاقات کی۔ اس نے پروفیسر سے بڑے فخریہ اور طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے پروفیسر کہ ابھی تک میری برطرفی کے احکام مجھے نہیں ملے۔"

"بکو مت ———" پروفیسر جال میں پھنسے ہوئے کسی آدم خور کی طرح دہاڑا ——— "تم نے میرے فنگر پرنٹس کے سلسلے میں جس دھاندلی کا ثبوت دیا ہے وہ زیادہ عرصے نہیں چل سکے گی۔"

"بہرحال ——— ابھی دو سال تک تو میری ملازمت برقرار رہے گی۔"

کیپٹن نے حقارت سے پروفیسر کو دیکھا پھر اپنے کندھے اچکاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ہر چند کہ کیپٹن پاول پروفیسر کو سزا دلوانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن کچھ باتیں

اب بھی ایسی تھیں جو اس کے ذہن میں الجھ رہی تھیں مثلاً" یہ کہ جس شخص نے
پروفیسر کے گمشدہ پرس کی مخبری کی تھی۔ وہ کون تھا اور اسے کیوں کر اس کے بارے
میں علم ہوا تھا جبکہ شہادتوں کے اعتبار سے پوسٹ آفس میں ڈاکا ڈالنے والا شخص
سرخ اسپورٹس کار میں تنہا دیکھا گیا تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ ابھی تک کیپٹن وہ
رقم نہیں دستیاب کر سکا تھا جو لوٹی گئی تھی۔ تیسری بات جو اسے پریشان کر رہی تھی وہ
اس فرنچ کٹ داڑھی والے کی شخصیت تھی۔

اس خیال سے کہ ممکن ہے پروفیسر نے بھیس بدل کر ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی ہو
کیپٹن نے تلاشی کا پروانہ لے کر پروفیسر کی رہائش کا کونا کونا چھان مارا تھا لیکن نہ تو وہ
وہاں سے میک اپ کا کوئی سامان پا سکا تھا اور نہ ہی لوٹی ہوئی رقم کا کوئی سراغ ملا تھا۔
پروفیسر تھامس نے آخری وقت تک عدالت میں یہی بیان دیا تھا کہ وہ بے قصور ہے
اور کچھ شرپسند لوگوں نے اسے پھانسنے کی سازش کی ہے۔"

پروفیسر کو سزا ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ کیپٹن ابھی تک رقم کے بارے میں کوئی
فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے آفس میں بیٹھا کیس کی گتھیوں کو سلجھانے
میں منہمک تھا۔ جب فون کی گھنٹی نے اس کے خیالات کا شیرازہ منتشر کر دیا۔

"ہیلو ——— کیپٹن پاول اسپیکنگ" اس نے ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں
کہا۔

"میں سارجنٹ راکفورڈ بول رہا ہوں کیپٹن۔" دوسری طرف سے تیزی سے کہا
گیا۔ "براڈوے اسٹریٹ پر گلڈ ہال کے سامنے جو سٹی بینک واقع ہے وہاں کچھ دیر پیشتر
ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔ ملزم نے بینک مینیجر کو قتل کر کے اسٹرونگ سے ایک بڑی
رقم اڑا لی ہے۔"

"تم کہاں سے بول رہے ہو۔"

"سٹی بینک سے۔ واردات کی اطلاع ملتے ہی میں پہنچ گیا تھا۔"

"کسی چیز کو ابھی ہاتھ نہ لگایا جائے۔ میں فوراً" آ رہا ہوں۔" کیپٹن پاول نے
اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر اسے جائے وقوع تک پہنچنے میں بمشکل دس منٹ صرف ہوئے
تھے۔

بینک مینیجر کی لاش اسٹرونگ روم کے دروازے پر پڑی ہوئی تھی۔ بینک کا گارڈ
بیہوش ملا تھا۔ ہوش آنے پر اس نے مجرم کا جو حلیہ بتایا وہ پوسٹ آفس والے اس
شخص سے صد فیصد ملتا جلتا تھا۔ جو سرخ اسپورٹس کار پر دیکھا گیا تھا۔ کیپٹن پاول کی
پیشانی عرق آلود ہو گئی ایک لمحے کے لئے وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا پھر ضروری
کاروائی میں مصروف ہو گیا۔

اس واقعے کے دوسرے دن جو چیز کیپٹن کے سامنے آئی وہ اس کے اعصاب کو
جھنجھوڑ دینے کے لئے کافی تھی۔ فنگر پرنٹس کے ماہرین نے اسٹرونگ روم سے ملنے
والے نشان کو پروفیسر تھامس کے انگوٹھے کا نشان بتایا تھا۔ فنگر پرنٹس کی سائنس میں
پہلا حیرت انگیز اور چونکا دینے والا واقعہ تھا۔ جب دو آدمیوں کے نشان ایک دوسرے
سے مل رہے تھے۔ قبل اس کے کہ کیپٹن اس پر اسرار معمے کا کوئی حل تلاش کر پاتا
کسی طرح اس بات کی اطلاع پروفیسر تھامس کے وکیل مورگن کو بھی مل گئی۔ چنانچہ
اس نے فوراً" ہی عدالت سے رجوع کیا اور دوسری پیشی پر ہی پروفیسر کو باعزت طور پر
رہا کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ رہائی کے بعد عدالت سے باہر آتے وقت پروفیسر نے
کیپٹن کو راستے میں روک کر بڑی حقارت سے کہا تھا۔

"کیا اب بھی تمہارا یہ خیال ہے کہ تم اپنی ملازمت کو برقرار رکھ سکو گے۔"

کیپٹن پاول کوئی جواب دینے کے بجائے اپنے نچلے ہونٹ کو چباتا ہوا آگے بڑھ
گیا۔ شام کو شائع ہونے والے تمام اخبارات نے پروفیسر تھامس کے باعزت بری
ہونے کی اطلاع کو جلی سرخیوں کے ساتھ چھاپا تھا اور کیپٹن پاول اور فنگر پرنٹس
والوں پر کڑی تنقید کی تھی۔ اخبارات کے منظر عام پر آتے ہی پولیس اور محکمہ
سراغرسانی کے عملے میں کھلبلی مچ گئی۔ اعلیٰ حکام نے فوری طور پر ایمرجنسی میٹنگ بلائی
اور سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ میٹنگ میں کیپٹن پاول کو بھی بطور خاص شرکت کا دعوت نامہ
ملا تھا۔ تقریباً" تین گھنٹے تک بند کمرے میں افسران اس مسئلے کا حل تلاش کرتے رہے
لیکن وہ کسی آخری نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ کیپٹن پاول کو اس بات پر بری طرح لتاڑا گیا
کہ آخر پروفیسر کے وکیل مورگن کو پولیس کے اہم ریکارڈ کی اطلاع کس طرح ملی
تھی!

سٹی بینک والے ڈکیتی کے ٹھیک آٹھ روز بعد کیپٹن پاول کو ایک اور ایسے حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ جس نے پوسٹ آفس سے شروع ہونے والی ڈکیتی کی وارداتوں کو اس درجے الجھا دیا کہ کیپٹن اندر ہی اندر تلملا کر رہ گیا۔

اس رات وہ دن بھر کی تھکا دینے والی مصروفیات کے بعد سونے کے ارادے سے اپنے بستر پر ٹھیک طرح سے لیٹنے بھی نہ پایا تھا کہ خوابگاہ میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج اٹھی کیپٹن پاول نے ناخوشگوار نظروں سے فون ——— کو دیکھا۔ پھر دل ہی دل میں اس کے موجد کو ایک گندی گالی بکتا ہوا اٹھا اور بڑے غصیلے انداز میں کال رسیو کی ———!

میں کینن اسٹریٹ کے پولیس اسٹیشن کا انچارج انسپکٹر گریس بول رہا ہوں۔ دوسری طرف سے کہا گیا "یہاں گیارہویں شاہراہ کے مون لائٹ بار میں ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔ مجرم نے بار کے مالک کو قتل کر کے اس کی دن بھر کی جمع پونجی لوٹ لی ہے۔"

"انسپکٹر ——— کیا تم اس وقت مون لائٹ بار سے کال کر رہے ہو۔"

"یس کیپٹن ——— رسیور پر انسپکٹر کی آواز ابھری ——— میں نے ایک خاص وجہ سے تمہیں اس حادثے کی اطلاع دینی ضروری سمجھی ہے۔ بار کے ایک ملازم نے جو اپنے مالک کے قتل کے وقت اسی کے کمرے میں موجود تھا۔ مجرم کا جو حلیہ بتایا ہے وہ پوسٹ آفس اور سٹی بینک والے مجرم سے ملتا جلتا ہے۔"

"آئی سی ——— کیپٹن یہ اطلاع سن کر چونکا پھر جلدی سے بولا۔ "میں جلد از جلد تمہارے پاس آنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

رسیور رکھ کر کیپٹن پاول تقریباً" دوڑتا ہوا ڈریسنگ روم میں گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ عمارت سے باہر آ کر اس نے گیراج سے اپنی کار نکالی اور ہوا سے باتیں کرتا ہوا کینن اسٹریٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

جس وقت وہ مون لائٹ بار میں داخل ہوا وہاں پولیس کے دوسرے افسران بھی آ چکے تھے۔ کیپٹن نے سب سے پہلے اس ملازم کا بیان لیا جو قتل کے وقت موجود تھا ملازم کا بتایا ہوا حلیہ پہلی دونوں وارداتوں کے مجرم سے ملتا جلتا تھا۔ اپنے بیان میں

اس نے یہ بھی بتایا کہ مجرم نے تقریباً" ایک ہزار پونڈ کی رقم لوٹی ہے۔

کیپٹن پاول پوری توجہ سے حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ ضروری کاروائی ختم کرنے کے بعد جب وہ واپسی کے ارادے سے بار سے باہر نکل رہا تھا تو ایک سپاہی نے اس کے قریب آ کر کہا۔

"سر ——— آپ کی فون کال ہے۔"

"میری فون کال ———" کیپٹن نے سپاہی کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا پھر لمبے لمبے قدم اٹھاتا اس کمرے میں آ گیا جہاں فون موجود تھا۔

"ہیلو ——— کیپٹن پاول اسپیکنگ" اس نے رسیور اٹھا کر بڑی گمبھیر آواز میں کہا۔

"سنو کیپٹن ——— میں تمہیں ایک اہم اطلاع دینا چاہتا ہوں۔" رسیور پر دوسری جانب سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ واٹرلو کے زمین دوز ریلوے اسٹیشن پر ایک ایسی لاش تمہاری منتظر ہے جسے دیکھ کر ممکن ہے تمہیں تعجب بھی ہو۔"

"تم کون بول رہے ہو۔"

"تمہارا وہی پرانا مخبر جس نے پوسٹ آفس والے ڈکیتی کیس میں تمہیں مجرم کے فنگر پرنٹس کے بارے میں اطلاع بہم پہنچائی تھی۔"

"میں تمہارا شکرگزار ہوں دوست" کیپٹن جلدی سے بولا۔ "کیا تم میرے آنے تک اسٹیشن پر میرا انتظار کر سکو گے۔"

"تمہارا انداز غلط ہے کیپٹن ——— میں اس لاش کو دیکھتے ہی وہاں سے بھاگ آیا تھا مبادا پولیس مجھے شبے میں گرفتار کر کے پریشان کرے۔ اس وقت میں تم کو دوسری جگہ سے فون کر رہا ہوں۔"

"مگر تمہیں یہ اطلاع کس طرح ملی کہ میں اس وقت مون لائٹ بار میں موجود ہوں۔" کیپٹن پاول نے کچھ سوچتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔

"میں نے سب سے پہلے تمہیں تمہارے فلیٹ کے نمبروں پر فون کیا تھا۔ یہ اطلاع مجھے تمہارے ملازم سے ملی تھی کہ تم اس وقت مون لائٹ بار میں مل سکو گے۔"

پھر اس سے پیشتر کہ کیپٹن کوئی دوسرا سوال کرتا دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ کیپٹن پاول نے جھلا کر ریسیور کریڈل پر رکھا پھر انسپکٹر گریس کو ہمراہ لے کر سیدھا واٹرلو کے زمین دوز اسٹیشن پہنچا۔ تھوڑی سی ذہنی جمناسٹک اور دوڑ دھوپ کے بعد وہ اس لاش کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ جس کی اطلاع اسے نامعلوم مخبر نے دی تھی۔ لاش کو تلاش کرنے میں اسے محض اس وجہ سے دیر لگی تھی کہ وہ پلیٹ فارم پر بنے ہوئے فون بوتھ میں سے ایک میں بند تھی پہلی نظر میں کیپٹن یہی سمجھا کہ کوئی نشے میں دھت شرابی سردی سے بچنے کے لئے ٹانگیں جوڑ کر بوتھ میں سو رہا ہے لیکن جب اس نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچا تو وہ ایک ہی جھٹکے میں لڑھک کو بوتھ سے باہر آ رہا۔

مقتول کے چہرے پر نظر پڑتے ہی کیپٹن پاول یوں اچھلا تھا جیسے اس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گیا ہو۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑے وہ اس اکڑی ہوئی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے چہرے پر فرنچ کٹ ڈاڑھی موجود تھی اور حلئے کے اعتبار سے وہ ڈکیتی ان تینوں وار داتوں کے مجرم سے ملتا جلتا تھا۔ جس کا حل ابھی تک کیپٹن تلاش نہیں کر سکا تھا۔ اپنے شبے کی تصدیق کی خاطر اس نے انسپکٹر گریس کو بھیج کر بار کے ملازم کو بلوایا جس نے پہلی ہی نظر میں مقتول کو بحیثیت اپنے مالک کے قاتل کے شناخت کر لیا تھا۔

تلاشی لینے پر مقتول کے لباس سے آٹھ سو پونڈ کے کرنسی نوٹ اور ایک آٹو میٹک ریوالور بر آمد ہوا۔ دوسری حیرت انگیز بات جو سامنے آئی وہ مقتول کی مصنوعی ڈاڑھی تھی جس کے کچھ بال اس وقت انسپکٹر گریس کے ہاتھوں میں آ رہے۔ جب وہ مقتول کا چہرہ اونچا کر کے گولی لگنے والی جگہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ بعد میں جب ہیڈ کوارٹر لا کر اس کا چہرہ مکمل طور پر صاف کیا گیا۔ تو کیپٹن پاول کے علاوہ انسپکٹر گریس کی آنکھیں بھی حیرت سے چمک اٹھی تھیں۔ مقتول ہائڈ پارک کے علاقے کا ایک ایسا بدنام اور عادی مجرم ثابت ہوا جو پولیس کو ایک عرصے سے ڈکیتی کی گزشتہ وار داتوں میں درکار تھا اور عرصہ چار سال سے پولیس کی فائلوں پر مفرور قرار دیا جا چکا تھا۔

کیپٹن پاول نے اسی وقت مقتول کے فنگر پرنٹس لئے لیکن جب ایک ماہر کو بلوایا

گیا تو اس نے مقتول کے فنگر پرنٹس کو ان نشانوں سے قطعی مختلف بتایا جو اب تک کیپٹن کو تینوں وار داتوں میں ملے تھے۔ ایک لمحے کے لئے کیپٹن کا ذہن چکرا گیا۔ بات یقیناً حیرت انگیز تھی۔ اس لئے کہ بار کے ملازم نے نہ صرف یہ کہ مقتول کو بحیثیت قاتل کے شناخت کر لیا تھا بلکہ پولیس کو اس کے انگوٹھے کے نشان تلاش کرنے میں مدد بھی کی تھی لیکن ماہر نے اس نشان کو بھی مقتول کے انگوٹھے کے نشان سے مختلف قرار دے دیا تھا۔

چار پانچ گھنٹے کے بعد جب کیپٹن پاول ذہنی اور جسمانی طور پر چور چور گھر پہنچا تو اس نے سب سے پہلے ملازم سے حسب دستور یہی سوال کیا کہ کیا اس کی غیر موجودگی میں کوئی فون آیا تھا لیکن ملازم کا جواب نفی میں ملا۔ ایک بار پھر کیپٹن کا ذہن الجھ کر رہ گیا اب وہ بڑی سنجیدگی سے اس مخبر کے بارے میں سوچنے لگا۔ جس نے بار میں اس سے فون پر رابطہ قائم کیا تھا اور کیپٹن کے استفسار پر یہی کہا تھا کہ اسے اس کے ملازم کے ذریعے اس بات کا علم ہوا تھا کہ کیپٹن اس وقت مون لائٹ بار میں مل سکے گا۔ معاً“ کیپٹن کے ذہن میں ایک نیا خیال بڑی سرعت سے ابھرا ”کیا وہ مخبر ہی اصل مجرم ہے جو کیپٹن کی رہبری کرنے کے ساتھ ساتھ اسے غلط راستوں پر ڈال رہا ہے؟“

○

شام کو منظر عام پر آنے والے اخبارات نے واٹرلو کے زمین دوز ریلوے اسٹیشن والی قتل کی وار دات کو مون لائٹ بار والے حادثے سے نتھی کر کے جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا تھا اس سلسلے میں اخبار روز کور نے جہاں ان دونوں وار داتوں کی تفصیل کو بڑھا چڑھا کر عوام کے سامنے پیش کیا تھا وہاں پولیس اور محکمہ سراغرسانی کے عملے پر بھی کڑی تنقید کی تھی۔ خاص طور پر کیپٹن پاول کی شخصیت پر تو دل بھر کر کیچڑ اچھالی گئی تھی۔ خصوصی نامہ نگار نے واٹرلو ریلوے اسٹیشن کے مقتول راک فیلڈ کی مجرمانہ سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہماری پولیس آج کل ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہے اور مجرم بڑی آزادی اور انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ قانون اور قانون کے نگہبانوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر جرائم کا ارتکاب کر گزرتے ہیں۔

پولیس ان کو گرفتار کرنے میں ناکام رہتی ہے۔

شام کے قریب قریب تمام اخبارات نے اسی قسم کی خبریں شائع کی تھیں لیکن ان میں سے ایک نے جو خبر شائع کی تھی وہ سب سے اہم اور چونکا دینے والی تھی۔ اس اخبار نے کیپٹن پاول کے بارے میں بڑے وثوق کے ساتھ یہ اطلاع شائع کی تھی کہ لندن کے اس عظیم سراغرساں نے اپنی پے در پے ناکامیوں کے بعد دل برداشتہ ہو کر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔

○

اس وقت رات کے تقریباً" ساڑھے گیارہ کا عمل رہا ہو گا۔

پارک روڈ پر فراٹے بھرنے والی گہرے سیاہ رنگ کی گاڑی بڑے چورستے سے تیزی سے بائیں جانب گھوم کر آکسفورڈ اسٹریٹ پر آ گئی۔ دوسری بار وہ' آکسفورڈ اسٹریٹ سے گھوم کر ریجنٹ اسٹریٹ پر آ گئی۔ کچھ دیر بعد سیاہ رنگ کی گاڑی شیسل گیلری کے علاقے میں داخل ہو کر آٹھویں شاہراہ پر واقع ایک کیفے کے سامنے رک گئی۔ گاڑی سے جو شخص برآمد ہوا وہ درمیانے قد اور چھریرے جسم کا مالک تھا اس کی آنکھوں میں عقاب جیسی چمک موجود تھی۔ اس کا لانبا چہرہ گھنیری داڑھی کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ جلد کی رنگت مقامی باشندوں سے ملتی جلتی تھی۔ اس کے جسم پر اس وقت ورسٹڈ کی اسٹیل گرے پتلون اور گہرے چاکلیٹ کلر کا چسٹر نظر آ رہا تھا۔ سر پر اسٹرا فیلٹ موجود تھی۔ جس کے اگلے حصے کو اس نے اپنی کشادہ پیشانی پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جھکا رکھا تھا۔ گاڑی سے نیچے اتر کر وہ چند ثانئے تک کیفے کے نیوئن سائن بورڈ کو دیکھتا رہا پھر لمبے لمبے قدم اٹھاتا کیفے کے اندر چلا گیا۔

ڈائننگ ہال کی بیشتر میزیں اس وقت بھی نظر آ رہی تھیں۔ کیفے کی ملازمین شوخ و شنگ لڑکیاں میزوں کے اطراف چکراتی پھر رہی تھیں۔ بہکے شرابیوں کے قہقہے اور ان کے ہمراہ گھومتی عورتوں کی معنی خیز مسکراہٹوں نے ماحول کو بڑا ہی رومان پرور بنا رکھا تھا۔

چسٹر میں ملبوس شخص کچھ دیر دروازے پر کھڑا ہال میں بیٹھے ہوئے افراد کو دیکھتا

رہا پھر اس نے کسی خیال سے اپنے شانے اچکائے اور بائیں جانب گھوم کر اس دروازے کی سمت بڑھنے لگا۔ جس پر مینجر کی تختی آویزاں تھی۔ ٹھیک اس وقت جب چسٹر والا مینجر کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ ایک دوسرا شخص جو صورت و شکل کے اعتبار سے کوئی چھٹا ہوا بدمعاش نظر آ رہا تھا۔ صدر دروازے کو جھٹکے کے ساتھ کھول کر اندر داخل ہوا۔ دروازے پر رک کر اس نے بڑی کینہ توز نظروں سے دائیں بائیں دیکھا پھر لڑکھڑاتا ہوا ایک خالی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ کیفے میں موجود جن لوگوں کی نظریں اس نووارد پر پڑی تھیں انہوں نے نفرت سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا لیکن نووارد نے شاید اس بات پر توجہ نہیں دی تھی۔

"اے ــــــ نہی" نووارد نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک خوبصورت لڑکی کو جو اپنے لباس کے اعتبار سے ٹیبل پارٹنر لگ رہی تھی ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

"یو ــــــ ڈرٹی سوائن" لڑکی کے چہرے پر ناگوار تاثرات ابھر آئے۔ شاید اسے نووارد کا یہ انداز اچھا نہیں لگا تھا۔

"گڈ" ــــــ نووارد اپنی زبان ہونٹ پر پھیرتا ہوا بولا۔ "مجھے تمہاری جیسی تیز طرار لڑکیاں ہمیشہ پسند آتی ہیں ــــــ آؤ بیٹھو ــــــ میں تم کو پہلی ہی نظر میں پسند کرنے لگا ہوں۔ مشروب خاص ہماری دوستی کو اور بھی مستحکم بنائے گا۔"

"سوری ــــــ میں آج کے لئے بک ہوں۔" لڑکی نے بدستور نفرت سے کہا پھر وہ آگے جانے کے ارادے سے پلٹی ہی تھی کہ نووارد نے دوبارہ اس کی کلائی تھام لی اور قدرے سخت لہجے میں بولا۔

"میں تم کو زیادہ رقم دے سکتا ہوں۔"

"نہیں میں اب کسی بھی دوسری پیشکش کو قبول نہیں کر سکتی۔"

"کیوں ــــــ" نووارد بگڑتے ہوئے تیور کے ساتھ لڑکی کو گھورتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

قرب و جوار کی میز پر بیٹھے ہوئے افراد نووارد کو نفرت بھری نظروں سے دیکھ

رہے تھے لیکن ان میں سے کسی ایک کی ہمت بھی نہ پڑ سکی جو اٹھ کر لڑکی کو اس کی آہنی گرفت سے نجات دلا سکتا۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دو ——— ورنہ ———"

اور پھر لڑکی باقی جملہ ادھورا چھوڑ کر چیخ اٹھی ——— فائرنگ کی آواز نے دوسروں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ نووارد نے جلدی سے لڑکی کو بائیں جانب والی میز پر دھکیلا پھر وہ پلک جھپکتے ہی حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ بھاگتا ہوا کیفے کے صدر دروازے سے باہر نکل گیا۔ ڈائننگ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ ابھی ٹھیک طور سے حالات کی نوعیت سمجھ بھی نہ سکے تھے کہ مینجر کے آفس کا دروازہ کھلا اور چسٹر والا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں اعشاریہ آٹھ کا ریوالور دیکھ کر لوگ بری طرح سہم گئے پورے ہال میں ایک ثانئے کے لئے موت کا بھیانک تصور گھوم گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے مینجر کے کمرے سے کوئی چیخا۔

"بچاؤ ——— بچاؤ ——— مجھے ...... بچا۔"

چسٹر والے نے جلدی سے لپک کر ہال کا صدر دروازہ کھولا پھر لوگوں کو گھورتا ہوا برق رفتاری کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی سب سے پہلا شخص جو اپنی میز سے اٹھ کر مینجر کے کمرے میں طرف دوڑا تھا وہ ایک مقامی اخبار کا رپورٹر تھا جو اس وقت کیفے میں اپنی ایک گرل فرینڈ کے ساتھ بیٹھا۔ خوش گپیوں میں مصروف تھا!

مینجر کے کمرے میں داخل ہوتے ہی رپورٹر ایک جھٹکے کے ساتھ رک گیا۔ پہلی ہی نظر میں اس نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کمرے میں ڈکیتی اور قتل کی واردات ہوئی ہے ہوٹل کا مینجر اپنی ریوالونگ چیئر پر یوں جھول رہا تھا جیسے اس کے جسم پر زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہ گئی ہو۔ اس کے گلے سے خون کی بوندیں اب بھی بڑی تیزی سے ٹپک رہی تھیں۔ ڈھلکی ہوئی گردن اور زمین تک جھولتے ہوئے بے جان ہاتھوں نے اس کی موت کی تصدیق کر دی تھی۔ مینجر کی بڑی میز کے دائیں جانب رکھے ہوئے سیف کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور نئے نئے کرنسی نوٹ ادھر ادھر بکھرے نظر آ رہے تھے۔ قاتل شاید بہت جلدی میں تھا اس لئے اس نے ان بکھرے ہوئے نوٹوں کو سمیٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ رپورٹر نے پورے کمرے کا نقشہ اپنے ذہن میں

محفوظ کیا۔ پھر وہ تیزی سے پلٹ کر کاؤنٹر کی طرف آیا اور پولیس کو حادثے کی اطلاع دینے کی غرض سے فون کرنے لگا۔

گاہکوں کے علاوہ کیفے کے ملازمین کی اچھی خاصی بھیڑ مینجر کے دروازے پر جمع ہو چکی تھی ———!

○

گہرے سیاہ رنگ کی کار اس وقت ہائڈ پارک جانے والی کشادہ اور سنسان سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ ڈیش بورڈ پر رفتار بتانے والی سوئی ساٹھ کے ہندسے پر تھرتھرا رہی تھی۔ اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص سامنے سڑک پر نظریں جمائے ہر لمحے ایکسیلیٹر پر اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھاتا جا رہا تھا۔ چسٹر کے بڑے بڑے کالروں اور اسٹرا فیلٹ کے اگلے حصے نے اس کے چہرے کے بیشتر حصے کو اپنے اندر چھپا رکھا تھا۔ اس کی کلائی پر بندھی ہوئی ریڈیم ڈائل کی گھڑی میں اس وقت رات کے ساڑھے بارہ کا عمل تھا۔

بیز واٹر روڈ پر پہنچ کر اس نے گاڑی کو ہائڈ پارک کے خاموش کونے پر کھڑا کر دیا۔ چابی گھما کر انجن بند کیا پھر دروازہ کھول کر نیچے اترنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ پچھلی نشست سے ایک انسانی سایہ ابھرا اور اس نے سرد لہجے میں چسٹر والے کو للکارتے ہوئے کہا۔

کیفے سے لوٹی ہوئی رقم کو تم تنہا ہضم نہیں کر سکو گے میرے دوست۔"

"کیا مطلب ——— کون ہو تم" چسٹر والے نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے خشک آواز میں پوچھا۔

"مطلب تم خوب سمجھ رہے ہو دوست" پچھلی نشست سے کرخت لہجے میں جواب ملا۔ "میں اگر چاہوں تو تم کو چپ چاپ ختم کر کے ساری دولت پر بھی ہاتھ صاف کر سکتا ہوں۔ کیفے کے بے شمار افراد تمہاری شکل دیکھ چکے ہیں۔ انہیں تمہاری لاش کو بھی شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ پولیس یہی سمجھے گی کہ کیفے کے کسی ملازم نے تم سے انتقام لیا ہے یا پھر خودکشی کے امکانات پر بھی غور کیا جا

سکتا ہے۔"

"تم کب سے میرا تعاقب کر رہے ہو۔" چسٹر والا کچھ توقف کے بعد بولا۔

"اس وقت سے جب تم نے کیفے جانے سے پیشتر گرین پارک سے یہ گاڑی اڑائی تھی۔ اگر ثبوت چاہو تو میں تمہاری کار کے نمبر بھی بتا سکتا ہوں جو اس وقت بھی گرین پارک کے قریب موجود ہو گی۔

"تمہیں میرے اوپر شبہ کس طرح ہوا تھا۔"

"بڑا بچکانہ سوال پوچھ رہے ہو۔" پچھلی نشست والے نے تیزی سے کہا۔ "جس وقت تم نے اپنی کار چھوڑ کر دوسری گاڑی حاصل کی تھی میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ تمہارے ارادے نیک نہیں ہوں گے۔"

"میں تم کو کیفے سے لوٹی ہوئی آدھی رقم بڑی ایمانداری سے دینے کو تیار ہوں لیکن اس شرط پر کہ تم رقم لے کر چپ چاپ میرے راستے سے ہٹ جاؤ گے۔"

"مجھے منظور ہے لیکن تمہیں رقم کے ساتھ ساتھ میرے ایک سوال کا جواب بھی دینا پڑے گا۔"

"وہ کیا ——————"

"تم نے ہائڈ پارک کے علاقے کے بدنام مجرم کو واٹرلو کے زمین دوز اسٹیشن پر کیوں قتل کیا تھا۔"

"غلط خیال ہے تمہارا" چسٹر والے نے جلدی سے کہا۔ "میں قتل جیسے جرم سے ہمیشہ دور رہتا ہوں۔"

"کیفے کے مینجر کے بارے میں کیا کہو گے۔ جس پر کچھ دیر پیشتر تم نے گولی چلائی تھی۔"

"میرے پاس بچاؤ کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس لئے مجبوراً گولی چلانی پڑی۔"

"کیا ہائڈ پارک والے بدنام مجرم کے سلسلے میں بھی تمہیں کوئی ایسی دشواری پیش آ گئی تھی۔ جو تم نے اسے ٹھکانے لگایا۔"

"میں نہیں سمجھ سکا کہ تمہارا اشارہ کس مجرم کی طرف ہے۔"

"تو مجھ سے سنو۔ پچھلی نشست والا خشک آواز میں بولا۔ "وہ شخص قدو قامت

اور صورت شکل کے اعتبار سے تم سے ملتا جلتا ہے۔ تم نے اسے کسی خاص مقصد کے تحت اپنا آلہ کار بنائے رکھا اور جب تمہارا مطلب نکل گیا تو تم نے اسے قتل کر دیا۔"

چسٹر والا خاموش رہا لیکن اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بڑی سختی سے بھنچ رہی تھیں شاید وہ موجودہ سچویشن پر تلملا رہا تھا۔

"پروفیسر تھامس سے تمہارا کیا تعلق ہے۔"

"میں کسی پروفیسر سے واقف نہیں ہوں۔ چسٹر والا غصیلی آواز میں بولا۔ "تم اپنا اور میرا دونوں کا وقت برباد کر رہے ہو۔ سیدھی طرح اپنی نصف رقم لو اور چلتے بنو۔"

"اور اگر میں پوسٹ آفس سے لے کر مون لائٹ بار تک کی لوٹی ہوئی تمام رقم میں سے نصف کا مطالبہ کروں تو تمہارا کیا جواب ہو گا۔"

"مجھے ان تمام حادثوں کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔"

"ایک بات اور ——————" پچھلی نشست والے نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "میک اپ کا یہ فن تم نے کہاں سے سیکھا ہے۔"

"بکو مت ——————" چسٹر والا غرایا۔ "تم اپنی حیثیت سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"ہو سکتا ہے مگر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ اس وقت تم میرے رحم و کرم پر ہو۔"

چسٹر والا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گھوم پڑا۔ اس کا فضا میں بلند ہاتھ پوری قوت سے پچھلی نشست والے کے سر پر پڑا پھر اس نے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی لیکن اس کے ستارے گردش میں تھے۔ پچھلی نشست والا جو اس اچانک حملے سے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا تھا۔ فوراً ہی سنبھلا اس کے بعد اس نے بڑی برق رفتاری سے پچھلا دروازہ کھولا اور تاریکی میں بھاگتے ہوئے انسانی ہیولے پر دو فائر جھونک دیئے۔ اندھیرے اور سناٹے کا سینہ چیرتی ہوئی ایک کربناک چیخ ابھری۔ چسٹر والے نے رک رک آگے پیچھے دو چار جھولے کھائے پھر کسی تناور درخت کی طرح سڑک پر الٹ گیا۔

پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا شخص تیزی سے نیچے اتر کر چسٹر والے کی طرف دوڑا تھا۔

○

دوسری صبح شائع ہونے والے اخبارات نے لندن میں ہونے والی ڈکیتی کی وار داتوں کے سلسلے میں ایک حیرت انگیز کہانی سنائی تھی۔ پروفیسر تھامس کے بارے میں تمام اخبارات نے یہی لکھا تھا کہ اگر وہ فنگر پرنٹس کے اس نئے تجربے کو مجرمانہ سرگرمیوں کے لئے استعمال کرنے کے بجائے اپنے ملک کے لئے استعمال کرتا تو اس کا نام دفاعی کارناموں میں سنہری حروف سے لکھا جاتا۔ حکومت برطانیہ کے جاسوس اس ایجاد کے ذریعے نہ صرف یہ کہ اپنے ملک کے لئے پیش بہا خدمت انجام دے سکتے تھے بلکہ دشمنوں کو آپس میں کٹ مرنے پر بھی مجبور کر سکتے تھے۔

لندن کے ایک اخبار نے بڑی تفصیل کے ساتھ ڈکیتی کی پر اسرار وار داتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا ——————!

"پروفیسر تھامس کی شخصیت ایک سائنس داں کی حیثیت سے لندن والوں کے لئے ہمیشہ زندہ رہے گی۔ لیکن ایک مجرم کے بھیس میں پروفیسر نے جن سرگرمیوں کو اپنایا تھا وہ بلاشبہ قابل نفرین تھیں۔ ہرچند کہ ابھی تک ہمیں پولیس یا محکمہ سراغرسانی والوں کی طرف سے کوئی رپورٹ نہیں مل سکی لیکن باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ لندن میں براڈوے اسٹریٹ پر واقع پوسٹ آفس سے شروع ہونے والی ڈکیتی کی تمام وار داتوں میں پروفیسر ہی کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ ہمیں انتہائی معتبر حلقوں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ پروفیسر تھامس نے جو ایک طویل عرصے سے نشان انگشت پر اہم ریسرچ کر رہا تھا۔ ایک ایسا چرمی خول تیار کر لیا تھا جس پر پائے جانے والے نشانات اس کے اپنے انگوٹھے کے نشانات سے صد فیصد ملتے جلتے تھے۔ پروفیسر تھامس اسی نقلی انگوٹھے کے ذریعے پولیس کی نظروں میں دھول جھونک کر کھلے عام جرائم کا ارتکاب کرتا رہا۔"

پروفیسر نے جرائم کی ابتدا بھی بڑے سائنٹفک طریقے پر کی تھی۔ پوسٹ آفس کی

ڈکیتی کے فوراً ہی بعد کیپٹن پاول نے ایک نامعلوم مخبر کی فون کال پر سرخ رنگ کی اسپورٹس کار سے وہ چرمی پرس تلاش کر لیا۔ جس پر پروفیسر کے انگوٹھے کے نشانات موجود تھے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ پروفیسر مذکور نے اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کا آغاز کرنے سے پیشتر ہائیڈ پارک کے علاقے کے ایک بدنام مجرم اڈگر کو جو پولیس کے ریکارڈ پر مفرور قرار دیا جا چکا تھا۔ اپنا ہم راز اور شریک کار بنا لیا تھا۔ براڈوے روڈ کی ڈکیتی میں اڈگر کا ہاتھ تھا۔ جس کی اطلاع پروفیسر نے کیپٹن پاول کو دی تھی۔ چنانچہ انگوٹھے کے نشان کے ذریعے پروفیسر کو گرفتار کر لیا گیا لیکن طے شدہ پروگرام کے تحت جب پروفیسر کی گرفتاری کے بعد اڈگر نے سٹی بینک میں ڈاکا ڈالا تو وہاں سے پروفیسر کے انگوٹھے کا نشان ملا۔ جو دراصل اس چرمی دستانے کا نشان تھا جو پروفیسر کی اپنی ایجاد تھی۔ اڈگر نے اسی دستانے کو پہن کر ڈاکا ڈالا اور پولیس کو الجھن میں ڈالنے کی خاطر انگوٹھے کے نشان چھوڑ گیا۔"

"پروفیسر تھامس نے اپنی رہائی کے بعد ایک نیا پلان مرتب کیا۔ ایک بار نشانات کے حیرت انگیز مطابقت کی بنا پر رہا ہو جانے کے بعد پروفیسر کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا اب اسے محض انگوٹھے کے نشانات کے ثبوت پر دوبارہ نہیں گرفتار کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس نے اڈگر کو جو اس کا واحد ہم راز تھا اپنے راستے سے ہٹانے کا پلان بنا لیا اور اپنے پروگرام کے مطابق اس نے اڈگر کو واٹرلو کے زمین دوز اسٹیشن پر گولی مار کر اس وقت ہلاک کر دیا۔ جب اڈگر طے شدہ پروگرام کے تحت مون لائٹ بار میں ڈاکا مارنے کے بعد پروفیسر سے مقررہ مقام پر ملنے گیا تھا۔ اڈگر کی موت نے کیپٹن پاول کو جہاں بری طرح الجھا دیا تھا۔ وہاں اسے نئے طریقے سے سوچنے کا احساس بھی دلایا تھا۔ کیپٹن پاول نے اپنی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت دوسرے ہی دن ملازمت سے استعفی دے دیا۔ جس کا راز صرف اس کے افسران کو معلوم تھا۔"

ملازمت سے اپنی سبکدوشی کا اعلان کرنے کے بعد کیپٹن پاول ایک نئے بھیس میں پروفیسر تھامس کے پیچھے لگ گیا۔ اسے شروع ہی سے اس بات کا شبہ تھا کہ پروفیسر بھی کسی نہ کسی زاویے سے ڈکیتی کی ان وار داتوں میں ملوث ہے۔ اڈگر کے قتل کے بعد تو اسے مکمل یقین ہو گیا کہ پروفیسر ہی وہ پر اسرار مخبر ہے جو اب تک اسے اندھیرے

میں رہ کر دھوکا دیتا رہا ہے۔ چنانچہ وہ سائے کی طرح پروفیسر کے ساتھ رہا۔ اس کی ایک ایک نقل و حرکت کو جانچتا رہا۔ آخر کار گزشتہ رات اس نے پروفیسر تھامس کو نہ صرف یہ کہ رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا بلکہ وہ چرمی دستانہ بھی برآمد کر لیا جو پروفیسر کی رہائش گاہ پر اس کے سیف میں مقفل تھا۔ کیفے سے لوٹی ہوئی رقم پروفیسر کے چسٹر کی جیبوں سے ملی تھی۔" آخر میں کیپٹن کی ماہرانہ صلاحیتوں کو سراہا گیا تھا جس نے بڑی چابکدستی سے پروفیسر تھامس کو کیفر کردار تک پہنچایا تھا۔ کیپٹن نے اپنے ایک بیان میں بڑی کشادہ دلی سے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ پروفیسر تھامس ایک عظیم سائنسداں ہونے کے ساتھ ہی میک اپ کے فن میں بھی بیحد ماہر تھا۔ اگر وہ شروع ہی سے پروفیسر کے تعاقب میں نہ ہوتا تو شاید چسٹر والے کو وہ پروفیسر کی حیثیت سے کبھی شناخت نہ کر پاتا۔"

جس روز لندن کے اخبارات میں پروفیسر تھامس کے انجام کی خبریں شائع ہوئیں اس روز دنیا کے عظیم سائنسدانوں میں ہلچل مچ گئی۔ لیکن لندن کے محکمہ پولیس اور سراغرسانوں نے بڑے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

○

"آسیب زدہ"

میرا نام شیرازی ہے۔ کسی زمانے میں فوج میں میجر کے عہدے پر بھی فائز رہ چکا ہوں۔ اس وقت جب کہ میں اپنی زندگی کی سب سے پر اسرار اور حیرت انگیز کہانی قلم بند کرنے بیٹھا ہوں میری عمر ستر سال کے لگ بھگ ہے لیکن میرے قویٰ آج بھی اتنے ہی مضبوط ہیں اور جسمانی کیفیت ایسی ہے کہ جب میں سوٹ پہن کر گھر سے باہر نکلتا ہوں تو میرے نئے دوست یہی سمجھتے ہیں کہ میری عمر پینتالیس پچاس کے لگ بھگ ہو گی۔ میرے سر کے بال زیادہ تر سفید ہو چکے ہیں۔ جس کی وجہ وہ تجربات ہیں جو میں نے اپنی زندگی اور ان حیرت انگیز واقعات سے حاصل کئے ہیں جو میری عمر کے تقریباً" ہر حصے میں پیش آتے رہے ہیں۔

قبل اس کے میں اپنی اصل کہانی کا آغاز کروں آپ کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک میجر کی حیثیت سے میں آٹھ سال تک جنگ کے زمانے میں اگلے محاذوں پر رہ چکا ہوں۔ اس عرصے میں موت کا تصور ہر لمحے میرے بہت قریب رہا ہے لیکن میں دشمن کے گولوں کی گھن گرج یا اپنی موت سے ہراساں ہونے کے بجائے ہمیشہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا رہا ہوں۔ میں نے اپنے بے شمار عزیز دوستوں کو میدان جنگ میں اپنی نظروں کے سامنے بڑی بے سرو سامانی کی حالت میں موت کی کربناک اذیتوں سے دوچار ہوتے بھی دیکھا ہے لیکن اس کے باوجود موت مجھے کبھی ہراساں نہیں کر سکی۔

فوجی زندگی سے سبکدوش ہونے کے بعد میں نے اپنی گزر اوقات کے لئے ایک کاروبار شروع کر دیا جس میں مجھے خاطر خواہ کامیابی ہوئی لیکن میرا دل چونکہ ہمیشہ مہم جوئی کی طرف راغب رہا تھا اس لئے میں زیادہ عرصے تک اپنے کاروبار میں ذاتی دلچسپی

نہ لے سکا چنانچہ اپنا کاروبار اپنے بڑے لڑکے اور مینیجر کے سپرد کر کے اکثرو بیشتر میں دو' دو اور تین تین ماہ کے لئے اپنی مہم جو طبیعت کو بہلانے کی غرض سے کبھی افریقہ کے گھنے جنگلات میں جا کر شیر چیتوں کا شکار کھیلتا رہتا اور کبھی ہندوستان کے نشیبی علاقوں میں واقع .... جنگلات میں پہنچ کر آدم خور جانوروں کے ساتھ موت اور زندگی کی خطرناک آنکھ مچولی کھیلا کرتا۔

یہاں پر ایک بات یہ بھی عرض کر دوں کہ اپنی زندگی کے ان جنگی اور شکاری واقعات اور تجربات کا تذکرہ کر کے میں پڑھنے والوں سے نہ تو کسی داد و تحسین کا طلب گار ہوں اور نہ کوئی شہرت چاہتا ہوں بلکہ ان باتوں کا تذکرہ محض اس لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ یہ باور کرا دوں کہ موت مجھے کبھی ہراساں نہیں کر سکی اور اب اپنی زندگی کی سب سے پر اسرار اور حیرت انگیز کہانی شروع کرنے سے پہلے اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ سیاہ بلیاں میری زندگی کی سب سے بڑی کمزوری ہیں اور سیاہ بلے یا بلی کو دیکھ کر مارے دہشت کے میرے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں تو آپ یقیناً" مجھ پر ہنسیں گے اور یہی کہیں گے کہ شاید انداز تفنن میں ایسا کہہ رہا ہوں لیکن جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ حرف بحرف درست ہے۔

یہ اس وقت کا ذکر ہے۔ جب میری عمر بتیس سال کی تھی میں جنگ میں اپنی نمایاں کار کردگی کے عوض ایک اعلیٰ فوجی اعزاز حاصل کر کے دو مہینے کی چھٹیوں پر اپنے آبائی شہر واپس آیا تھا۔ میرے والدین جو دن رات میری زندگی کے لئے دعائیں مانگا کرتے تھے مجھے اپنے درمیان پا کر کس قدر خوش ہوئے اس کی تشریح ناقابل بیان ہے۔ میرے پرانے پڑوسی جن سے میں مکمل چھ سال بعد ملا تھا میری واپسی پر مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ملے۔ اس چھ سال کے عرصے میں جو میں اپنے شہر سے دور میدان جنگ میں گزار چکا تھا میرے محلے میں نمایاں تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ پرانے مکانوں کی جگہ نئی اور کئی کئی منزلہ عمارتیں بن چکی تھیں۔ میرے مکان کی پرانی حیثیت بدل چکی تھی اور وہ میدان جو میرے خوبصورت دو منزلہ مکان کے عین سامنے واقع تھا اور کسی زمانے میں تمام محلے کی گندگی اور کوڑا کرکٹ کا ڈھیر سمیٹے فضا کو متعفن کیا کرتا تھا اب ایک خوب صورت وسیع و عریض پارک میں تبدیل ہو چکا تھا جہاں سر شام ہی سے

خوبصورت بچوں اور عمر رسیدہ بوڑھوں کا جمگھٹا نظر آنے لگتا تھا۔ پارک سے ملحق ایک خوبصورت اور عالیشان کیفے کی عمارت بنی ہوئی تھی۔ جہاں بے فکروں کا ہجوم ہمہ وقت خوش گپیوں میں مصروف نظر آتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کیفے کی جگہ کسی زمانے میں ایک نیم پختہ اسکول ہوا کرتا تھا جہاں محلے کے نادار بچے پڑھا کرتے تھے۔ غرضیکہ محض چھ سال کے مختصر عرصے میں میرے آبائی شہر اور میرے محلے میں بڑی خوشگوار تبدیلیاں آ چکی تھیں جنہیں دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

میں فوجی زندگی اور جنگی مصروفیات سے تھکا ماندہ گھر واپس آیا تھا اس لئے تین چار دن تک صرف اپنے مکان کی چار دیواری کے اندر بند پڑا آرام کرتا رہا لیکن اس عرصے میں بھی میرے کچھ پرانے دوست اور واقفیت کار میری آمد کی اطلاع پا کر مجھ سے ملنے کے لئے آتے رہے۔ چوتھے روز جب میں ازخود باہر جانے کے لئے تیار ہوا تو معاً" مجھے اپنے ایک پرانے ساتھی ڈاکٹر ٹیپو کا خیال آ گیا جو چھ سال قبل میرا بہترین دوست تھا۔ ہرچند کہ وہ کوئی مستند ڈاکٹر نہ تھا لیکن اپنی گزر اوقات کی خاطر اس نے ایک چھوٹی سی دکان کرایہ پر لے کر اس پر ڈاکٹر ٹیپو ہومیو پیتھ کی چھوٹی سے تختی لگا رکھی تھی۔ دو چار کتابیں پڑھ کر اس نے چھوٹے موٹے علاج کرنے سیکھ لئے تھے۔ قدرت اس پر مہربان تھی اس لئے لوگوں کو اس کی ننھی منی گولیوں سے فائدہ ہونے لگا اور ٹیپو کے برے دن ختم ہو گئے۔ میرا شام کا اکثر وقت اس کی دکان پر گزرا کرتا تھا۔ آج مجھے ٹیپو کا خیال آیا تو اس کے ساتھ گزاری ہوئی دل چسپ شامیں بھی یاد آ گئیں۔ میں نے اپنے بوڑھے والد سے ٹیپو کے بارے میں دریافت کیا تو وہ برا سا منہ بنا کر بولے "اس کالے شیطان کو گرفتار ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔"

بعد میں مجھے جو تفصیل والد صاحب کی زبانی معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ ٹیپو نے کسی بچے کو غلط دوا دے دی تھی۔ اور وہ مر گیا تھا۔ لڑکے کے باپ کو کسی طرح اس بات کا علم ہو گیا کہ ٹیپو بغیر کسی ڈگری کے پریکٹس کر رہا ہے چنانچہ کیس پولیس کے حوالے کر دیا گیا اور ٹیپو کو چار سال کی سزا ہو گئی۔ مجھے والد کی زبانی ٹیپو کا انجام معلوم کر کے سخت افسوس ہوا میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ٹیپو کس قدر معصوم اور نیک طبیعت کا مالک تھا۔ کچھ دیر تک والد سے ادھر ادھر کی گفتگو کر کے جب باہر جانے کے ارادے

سے اٹھا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے والد مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ بعد میں میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ انہوں نے میرے اٹھتے ہی والدہ کو کچھ ایسا اشارہ کیا جس کا مطلب یہی تھا کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے اب وہ میری ماں کی زبانی کہلوانا چاہتے تھے یہ سوچ کر کہ ممکن ہے میرا اندازہ غلط نہ تھا اس سے پہلے کہ میں کمرے سے باہر نکل جاتا میری ماں نے مجھے آواز دے لی تھی۔ میں بڑی سعادت مندی مگر فوجی انداز میں ایڑیوں کے بل تیزی سے گھوم کر ماں کے قریب آگیا۔

"شیرو بیٹے ــــــ" میری ماں نے کچھ سوچ کر قدرے سنجیدگی سے کہا۔

"تم شاید اس وقت چہل قدمی کی غرض سے باہر جا رہے ہو۔"

"جی ہاں ــــــ" میں نے بڑے ادب سے پوچھا۔ "اگر کوئی کام ہو تو مجھے بتا دیجئے۔"

"کام تو کوئی نہیں ہے لیکن میں تم سے ایک ضروری اور اہم بات کہنا چاہتی ہوں۔"

ماں کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات دیکھ کر میرا جذبہ تجسس بیدار ہو گیا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ بات جسے میرے کانوں تک پہنچانے کے لئے میرے والد نے میری ماں کو اشارہ کیا تھا یقیناً" کسی اہم نوعیت کی حامل ہو گی ورنہ براہ راست بھی مجھ سے کہہ سکتے تھے۔ میری ماں نے جس انداز میں تمہید شروع کی تھی وہ بھی میرے لئے حیرت انگیز تھی۔ میں خاموش اور باادب کھڑا ماں کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو غالباً" کسی خاص وجہ سے ابھی تک وہ اہم اور ضروری بات کہنے سے ہچکچا رہی تھی جس کے لئے مجھے روکا تھا۔

"میں ــــــ تم سے ــــــ یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم اپنے تمام پرانے دوستوں سے ضرور ملنا لیکن ــــــ"

لیکن کہنے کے بعد میری ماں دوبارہ خاموش ہوئیں تو میرا ذہن اس بات کو جلد از جلد جان لینے کے لئے اور بھی مضطرب ہو گیا جو ابھی تک مخفی تھی اور جسے کہنے کے لئے شاید مزید کسی تمہید کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ میں چونکہ شروع ہی سے الجھاووں کا قائل نہیں ہوں اس لئے ماں کی خاموشی محسوس کر کے جلدی سے بولا۔

"آپ نے اپنا جملہ نامکمل کیوں چھوڑ دیا۔ کیا آپ مجھے کسی خاص دوست سے ملنے کو منع کرنا چاہتی ہیں۔"

"نہیں ــــــ" میری ماں نے میری اضطرابی کیفیت کو محسوس کر لیا تو۔ "تم اپنے پرانے دوستوں سے ضرور ملو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا مگر ہو سکتا ہے کہ تمہارے پرانے واقف کار تم سے پروفیسر رام لال کا ذکر بھی کریں۔ میں یہ مناسب نہیں سمجھتی کہ تم رام لال سے ملو۔"

پروفیسر رام لال کا نام میں پہلی بار سن رہا تھا۔ اس سے قبل یہ نام میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا اور نہ ہی مجھے یہ یاد تھا کہ میرا کوئی پڑوسی اس نام کا بھی تھا۔ چنانچہ ایک لمحے کے لئے میں نے اپنے ذہن پر زور دے کر اپنی یادداشت کو کریدا پھر دبی زبان میں میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ میں پروفیسر رام لال کا نام پہلی بار سن رہا ہوں۔"

"ہاں ــــــ" میرے والد درمیان میں بول پڑے۔ "یہ منحوس اور غلیظ شخص ابھی دو ڈھائی سال ہوئے ہمارے محلے میں آ کر بسا ہے۔ انتہائی ذلیل اور کمینہ طبیعت کا مالک ہے۔"

"کیا پروفیسر نے آپ کے ساتھ بھی خدانخواستہ ــــــ"

"جس دن اس کی نوبت آئی میں اسے زندہ درگور کر ڈالوں گا۔" میرے والد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ غصے کے ساتھ ساتھ ان کے لہجے سے کسی مجبوری کا احساس بھی جھلک رہا تھا۔

"اگر محلے والے رام لال کو غلیظ اور کمینہ سمجھتے ہیں تو پھر اسے یہاں سے نکلوایا بھی جا سکتا ہے۔" میں نے رام لال کے بارے میں کچھ مزید جاننے کی غرض سے کہا۔

"میں ذاتی طور پر اپنا اثر و رسوخ بھی کام میں لا سکتا ہوں محض ایک درخواست پر اسے محلہ بدر کرا دینا میرے لئے کوئی دشوار بات نہ ہو گی۔

"خدا کے لئے تم ایسی کوئی حرکت نہ کرنا۔" میری ماں جلدی سے بولیں۔ "رام لال اگر صرف انسان ہوتا تو محلے والے اب تک نہ جانے کب کا اسے مار پیٹ کر بھگا چکے ہوتے لیکن ــــــ"

میری ماں دوبارہ خاموش ہو گئیں تو میرا تجسس اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا۔ ساتھ ہی مجھے کوفت بھی ہونے لگی تھی کہ آخر رام لال کی شخصیت میں ایسی کون سی بات ہے جس کی وجہ سے مجھے اس سے دور رہنے کی تلقین کی جا رہی ہے اور پھر یہ کہ اگر وہ انسان نہیں تو تھا تو پھر کیا تھا؟

"کیا کوئی ایسی بات ہے جو مجھ سے پوشیدہ رکھنی ضروری ہے۔" میں نے دبی زبان میں اپنی الجھن کا اظہار کیا تو میرے والد صاحب جلدی سے پہلو بدل کر قدرے نفرت سے بولے۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں کہ رام لال کیا ہے۔ دراصل میں نے اسے ناپاک اور غلیظ اس لئے کہا تھا کہ وہ مردود کچھ ناپاک اور پر اسرار قوتوں کا مالک بھی ہے۔ شروع شروع میں جب وہ یہاں آیا تو ہم کچھ دنوں تک اسے ملنسار سمجھتے رہے لیکن پھر کچھ ایسی باتیں بھی سامنے آئیں جس سے بیشتر لوگ رام لال کے خلاف ہو گئے اور یہی طے پایا کہ اسے محلے سے نکال باہر کیا جائے چنانچہ وفد کی صورت میں کچھ افراد رام لال کے یہاں گئے لیکن وہاں ایک ایسا حادثہ پیش آیا کہ محلے میں سنسنی پھیل گئی۔"

میں چونکہ والد صاحب کی گفتگو میں اپنے لئے ایک انجانی کشش محسوس کر رہا تھا اس لئے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ کر بڑی توجہ سے ان کی بات سننے لگا۔ والد صاحب نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جس وقت وفد کے ارکان رام لال سے ملنے کی غرض سے اس کے بنگلے کے احاطے میں داخل ہوئے اس وقت وہاں ایک سیاہ رنگ کا بوڑھا سانپ نہ جانے کہاں سے اچانک نمودار ہوا اور پھن اٹھا کر وفد کے سامنے یوں لہرانے لگا جیسے حملہ کرنا چاہتا ہو سانپ کو یوں خطرناک حالت میں دیکھ کر وفد کے سارے ہی اراکین خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہجوم میں ایک شخص نے جس کے پاس غالباً بھرا ہوا ریوالور موجود تھا فوراً ہی لوگوں کے بچاؤ کی خاطر بوڑھے سانپ پر پے در پے چار فائر جھونک دیئے۔ چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ وہ ساری کی ساری گولیاں سانپ کے جسم پر لگی تھیں۔ انہوں نے سانپ کو زخمی ہو کر زمین پر اپنا پھن زور زور سے مارتے دیکھا اور پھر وہ اچانک پر اسرار طور پر ان کی نگاہوں سے غائب ہو گیا۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔" میں جلدی سے بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ سانپ زخمی ہو کر بھاگ گیا ہو اور لوگ چونکہ خوفزدہ تھے اس لئے وہ اسے بھاگتے ہوئے نہ دیکھ سکے ہوں۔"

"کچھ بزرگوں کا بھی یہی خیال تھا لیکن دوسرے دن ایک ایسی حیرت انگیز اطلاع ملی جس نے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ رام لال کچھ پر اسرار طاقتوں کا مالک ہے۔" میرے والد نے حقارت سے کہا پھر کچھ توقف کے بعد بولے۔ "اگلے روز جب رام لال گھر سے برآمد ہوا تو زخمی حالت میں دیکھا گیا پھر جس ڈاکٹر نے اس کی مرہم پٹی کی تھی اس نے لوگوں کو یہی بتایا کہ رام لال کے جسم سے ریوالور کی چار گولیاں برآمد ہوئی تھیں عام حالات میں اگر یہ واقعہ کسی دوسرے کے ساتھ پیش آتا تو وہ شاید دو گھنٹے بھی جانبر نہ رہ سکتا لیکن رام لال بارہ چودہ گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی نہ صرف زندہ تھا بلکہ بالکل تندرست حالت میں پایا گیا تھا۔"

"گویا لوگوں کے خیال میں وہ رام لال ہی تھا جو سانپ کی شکل میں وفد کے اراکین کو خوفزدہ کرنے کی غرض سے انکے سامنے آیا تھا۔" میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ——— بزرگوں کا یہی خیال ہے۔"

"یہ بھلا کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی صورت شکل اور جون کو بدل سکے۔" میرے لہجے میں الجھن تھی۔

"تم غالباً دوسرے مذہب اور ان کے دیوی دیوتاؤں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ وثوق کے ساتھ میں بھی کوئی بات نہیں کہہ سکتا لیکن میں نے بے شمار لوگوں کی زبانی یہ بات سنی ہے کہ سیاہ ناگ کی عمر جب سو سال سے زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ اپنی صورت شکل بدلنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ اور جب چاہے اپنی جون بدل لیتا ہے۔"

"تو کیا پروفیسر رام لال درحقیقت انسان کے بجائے کوئی پرانا ناگ ہے۔" میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ "وہ کچھ بھی ہو لیکن تمہیں ان معاملات میں کوئی دخل نہیں دینا چاہئے میں نے اسی لئے تم کو منع کیا تھا کہ اگر تمہارے دوست اس منحوس کے

بارے میں کچھ کہیں تو اس پر کوئی توجہ نہ دینا۔ میری والدہ نے گویا اس قصے کو ختم کرنے کی غرض سے کہا۔ "وہ جانے اور اس کا کام ——— ہمیں کیا پڑی ہے کہ گندی بلاؤں میں ٹانگ پھنسائیں۔"

میں چاہتا تھا کہ والد صاحب سے رام لال کے بارے میں اور بھی کچھ دریافت کروں لیکن میری والدہ نے چونکہ انہیں اشارے سے منع کر دیا تھا اس لئے میں مسکراتا ہوا اٹھا اور والدہ سے یہ وعدہ کر کے باہر آگیا کہ مجھے ان باتوں سے کوئی غرض نہ ہو گی۔ لیکن باطنی طور پر میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ رام لال کی پر اسرار شخصیت کا کھوج ضرور لگاؤں گا۔

دن بھر میں اپنے پرانے واقف کاروں سے ملتا رہا لیکن کسی ایک نے بھی رام لال کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ مجھے اس بات پر بےحد تعجب ہوا لیکن میرا یہ تعجب اس وقت رفع ہو گیا جب شام کو میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر ہمایوں سے ملا۔ کچھ دیر تک ہمارے درمیان دنیا جہان کی باتیں ہوتی رہیں پھر ہمایوں نے رام لال کا قصہ شروع کیا لیکن رام لال کی کہانی شروع کرنے سے پیشتر اس نے مجھ سے وعدہ لے لیا تھا کہ میں یہ بات کسی کو نہ بتاؤں گا کہ مجھے رام لال کی کہانی کا علم کس کے ذریعے ہوا ہے میرے بہت اصرار پر ہمایوں نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ میرے والد نے میری آمد سے پہلے ہی تمام دوستوں کو تاکید کر دی تھی کہ مجھے اس ناپاک شخصیت کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔ شاید یہی وجہ تھی جو میرے دوسرے دوستوں نے رام لال کے سلسلے میں اپنی زبان بند رکھی تھی۔

بہر حال، ہمایوں بڑی دیر تک مجھے رام لال اور اس سے متعلق حیرت انگیز واقعات سناتا رہا۔ ایک دو باتیں میں پہلے ہی اپنے والد کی زبانی سن چکا تھا لیکن ہمایوں نے ان باتوں کے علاوہ بھی بہت سارے واقعات سنا ڈالے جن میں سے ایک میرے لئے سب سے زیادہ حیرت انگیز ثابت ہوئی اور اس پر اسرار کہانی کو سن کر میں نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ اپنی رخصت ختم ہونے سے پہلے ہی پہلے رام لال کی شخصیت کا کھوج ضرور لگاؤں گا۔ خواہ اس کے نتائج کتنے ہی خطرناک کیوں نہ ہوں۔
ہمایوں کے بیان کے مطابق اس نے رام لال کے احاطے میں ایک بار ایک سیاہ

بلے اور ایک سیاہ ناگ کے درمیان بڑی ہولناک جنگ دیکھی تھی۔ محلے کے دوسرے بے شمار لوگ بھی قرب و جوار کی عمارتوں پر چڑھ کر اس جنگ کا تماشا دیکھ رہے تھے اور پھر اس وقت ان لوگوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب بلا اور سانپ ایک دم ہی ان کی نگاہوں سے غائب ہو گئے تھے اس واقعے کے بعد سے محلے کے لوگوں نے اس بات پر یقین کر لیا تھا کہ صرف رام لال ہی شیطانی طاقتوں کا مالک نہیں ہے بلکہ اور بھی شخصیت وہاں ایسی موجود ہے جس نے سیاہ بلے کا روپ دھار کر سیاہ ناگ سے ٹکرانے کی کوشش کی تھی۔ جس روز یہ حیرت انگیز واقعہ پیش آیا اسی شام کسی نامعلوم شخص کی مخبری پر مقامی تھانے کے ایک دلیر پولیس آفیسر نے جو نیا نیا اس علاقے میں آیا تھا رام لال کو عین اس وقت گرفتار کر لیا جب وہ اپنے بنگلے کے احاطے میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ پولیس آفیسر وہاں تنہا آیا تھا لیکن محلے کے بیشتر لوگوں نے رام لال کی گرفتاری کا تماشا دیکھا تھا۔

ڈاکٹر ہمایوں کے بیان کے مطابق پولیس آفیسر جس وقت رام لال کو گرفتار کر کے اپنی جیپ میں لے جا رہا تھا اس وقت رام لال کے ہونٹوں پر کچھ عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ محلے والوں نے بڑے سکون کا سانس لیا تھا ان کا خیال تھا کہ شاید اب وہ رام لال کی منحوس شخصیت سے ضرور نجات حاصل کر لیں گے مگر دوسری صبح کے اخبار میں جو خبر پڑھی گئی وہ اس قدر ہولناک تھی کہ محلے والوں کی امیدوں پر نہ صرف یہ کہ اوس پڑ گئی بلکہ اس روز سے انہوں نے رام لال کی طرف دیکھنا بھی ترک کر دیا۔ اگر وہ کبھی اتفاق سے گھومتا پھرتا سڑک پر آ جاتا تو لوگ خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوتے۔

اخبار میں جو اطلاع شائع ہوئی تھی وہ اسی پولیس آفیسر کی پر اسرار موت کے بارے میں تھی جو رام لال کو گرفتار کرنے آیا تھا۔ اخباری اطلاع کے مطابق پولیس آفیسر تھانے پہنچنے سے پیشتر ہی جیپ ڈرائیو کرتے کرتے مر گیا تھا۔ موت کی وجہ پولیس سرجن کے بیان کے مطابق کسی زہریلے سانپ کے ڈسنے سے واقع ہوئی تھی۔ اس خبر میں رام لال کا نام کہیں بھی نہیں تھا۔ محلے والوں نے اگلی صبح رام لال کو اپنے بنگلے کے احاطے میں چہل قدمی کرتے دیکھا۔ بعد میں کچھ پولیس نے محلے والوں سے گواہی

شہادت کے سلسلے میں رابطہ قائم کرنے کی بے انتہا کوشش کی لیکن کسی ایک نے بھی رام لال کا نام نہیں لیا۔ چنانچہ پولیس آفیسر کی موت کی فائل بند کر دی گئی۔

ڈاکٹر ہمایوں نے جو معلومات فراہم کی تھیں وہ میرے خون کو گرمانے کے لئے بہت کافی تھیں میں اس کی ایک ایک بات کو بہت غور سے سنتا رہا جب اس نے اپنی تفصیل ختم کی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا رام لال نے براہ راست کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔"

میرا خیال ہے کہ ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔" ہمایوں نے چونکتے ہوئے جواب دیا "جہاں تک اس کی نحوست کا تعلق ہے میں بھی اس بات کا قائل ہو گیا کہ وہ ضرور کسی شیطانی قوت کا مالک ہے۔

"لیکن ایسا کوئی واقعہ میرے علم میں نہیں ہے۔ جب رام لال نے اپنے کسی پڑوسی یا محلے کے کسی فرد کو از خود کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہو۔"

"ایک بات اور ——— میں نے جلدی سے پوچھا "کیا تمہارے خیال میں وہ سیاہ بلا بھی کسی انسانی وجود کا بدلا ہوا روپ تھا۔"

"اس کے علاوہ اور کیا سوچا جا سکتا ہے" ڈاکٹر ہمایوں نے دبی زبان میں جواب دیا۔

"کیا آج تک کوئی شخص رام لال کے بنگلے میں نہیں گیا۔ میرا مقصد ہے کوئی ملنے جلنے والا جو رام لال کے بنگلے میں آتے جاتے دیکھا گیا ہو۔"

"مجھے اس سلسلے میں زیادہ کچھ نہیں معلوم لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے آج تک سوائے ایک کے کسی کو وہاں آتے جاتے نہیں دیکھا گیا اور وہ ایک ہندو لڑکی شیلا پرکاش ہے۔"

"کیا شیلا وہاں اکثر آتے جاتے دیکھی گئی ہے۔" میری دلچسپی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"نہیں صرف ایک بار اسے رام لال کے مکان سے نکلتے دیکھا گیا تھا۔ لیکن تم یہ بات خاص طور پر کس لئے دریافت کر رہے ہو۔"

"یونہی ———" میں نے پہلو بدل کر کہا۔ پھر پوچھا "کیا تم شیلا پرکاش کا پتا

جانتے ہو۔"

"ہاں ——— شیلا پرانی بستی کی گیارہویں شاہراہ پر ایک سو اٹھارہ نمبر کے مکان میں مقیم ہے۔" ہمایوں نے کسی خیال سے مسکراتے ہوئے مجھے غور سے دیکھا پھر یکلخت سنجیدگی اختیار کر کے بولا۔ "میرے دوست تمہیں یہ سن کر یقیناً" تعجب ہو گا کہ شیلا بھی اپنے مکان میں بالکل تنہا رہتی ہے۔ اس کے والدین کو مرے ہوئے ایک مدت گزر چکی ہے۔"

"شیلا کا پتا بتاتے وقت تم ہنسے کیوں تھے" میں نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ رام لال کی پر اسرار شخصیت کا کھوج لگانے کے سلسلے میں میں کسی ایک معمولی سے نکتے کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اس کا جواب تم شیلا سے ملنے کے بعد بھی حاصل کر سکتے تھے۔ بہر حال اب تمہارے پوچھنے پر بتا رہا ہوں کہ شیلا اس شہر کی سب سے حسین لڑکی تصور کی جاتی ہے اور اس کے حسن کے چرچے ہر طرف ہیں۔ تم بھی اگر ایک بار دیکھ لو تو دو چار ٹھنڈی سانسیں بھرے بغیر نہ رہ سکو۔"

"محض لغویت ——— مجھے خوبصورت لڑکیوں یا رومانس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے سرد لہجے میں ہمایوں سے کہا پھر کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔

ڈاکٹر ہمایوں سے مل لینے کے بعد میرا تجسس اس قدر بڑھ چکا تھا کہ میں رات بھر جاگتا رہا! اور ان پر اسرار واقعات کے بارے میں سوچتا رہا جو اب تک میرے علم میں آ چکے تھے۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے مجھے اپنے خدا اور اپنے ایمان پر مکمل بھروسا تھا نہ جانے کیوں میں ان باتوں پر یقین کر لینے کو خود کو آمادہ نہ کر سکا جو مجھے رام لال کے بارے میں بتائی گئی تھیں۔ تمام رات میں اپنا پسندیدہ تمباکو پائپ میں بھر بھر کر پیتا رہا اور رام لال سے متعلق کہانیوں پر غور کرتا رہا۔ آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنی کھوج کا آغاز شیلا پرکاش سے کرنا چاہئے۔ چنانچہ اگلی صبح میں گھر سے تیار ہو کر سیدھا شیلا پرکاش کے اس پتے پر پہنچا جو مجھے ڈاکٹر ہمایوں سے ملا تھا۔

ہمایوں کے بیان کے مطابق شیلا واقعی بیحد حسین و جمیل ثابت ہوئی۔ اس کے

تراشیدہ اور نرم مخمل کی طرح چمکدار بال پہلی ہی نظر میں دیکھنے والوں کو موہ لینے کے لئے کافی تھے۔ اس کی آنکھیں نیلے رنگ کی اور نشیلی نشیلی سی تھیں۔ ہونٹ بے حد دلکش اور جنس مخالف کے لئے بڑے جاذب نظر تھے۔ جس وقت میں شیلا کے گھر پہنچا وہ ہلکے دھانی رنگ کی ساڑی میں ملبوس کہیں جانے والی تھی۔ میں نے ایک انشورنس ایجنٹ کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا تو ایک لمحے کے لئے وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی پھر مجھے اپنے ساتھ لئے اپنے خوبصورت ڈرائنگ روم میں آئی جو بڑے سلیقے سے اعلیٰ فرنیچر اور قیمتی سازو سامان سے سجا ہوا تھا۔ کچھ دیر تک وہ مجھ سے ایک اجنبی کی طرح گفتگو کرتی رہی پھر بڑی سنجیدگی سے بولی۔

"زندگی کا بیمہ واقعی میرے لئے بہت اہم ہے لیکن میں ابھی تک کسی ایسے شخص کا انتخاب نہیں کر سکی ہوں جو میرے مرنے کے بعد بیمے کی رقم وصول کر سکے۔"

"کیا مطلب" میں چونکا۔ "کیا آپ کا کوئی عزیز یا رشتہ دار موجود نہیں ہے۔"

"نہیں ——— میں اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔"

"آئی سی" میں نے ظاہری طور پر اظہار افسوس کیا۔ پھر دبی زبان میں پوچھا۔ "کیا ابھی تک آپ کی شادی نہیں ہوئی۔"

"جی نہیں ———" شیلا کے چہرے پر الجھن کے تاثرات پھیل گئے پھر وہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے اس وقت ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔ آپ پھر کسی وقت ملاقات کریں تو زیادہ مناسب ہو گا۔"

"مس شیلا ———" میں موقع کی نزاکت کو بھانپ کر اصل مقصد کی طرف آگیا۔ "کیا میں آپ سے ایک نجی سوال کر سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب ———" وہ میرے سوال پر کچھ برہم سی نظر آنے لگی۔"

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ پروفیسر رام لال سے واقف ہیں۔"

"تم ——— تم انشورنس ایجنٹ نہیں ہو سکتے۔" شیلا کا لہجہ یکلخت بدل گیا۔ وہ مجھے ایسی نگاہوں سے گھورنے لگی جس میں خوف اور حیرت کے ملے جلے تاثرات موجود تھے۔

"آپ کا خیال درست ہے" میں نے گھماؤ پھراؤ کو ختم کرتے ہوئے بڑی صاف

گوئی سے جواب دیا پھر ایک ہی سانس میں اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔

شیلا مجھے یوں گھورتی رہی جیسے یا تو وہ مجھے کوئی دیوانہ سمجھ رہی تھی یا پھر اسے میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر اس کی نیلی نیلی نیم وا آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز رہیں۔ پھر اس کے لب آہستہ سے ہلے۔

"مسٹر ——— تم جو کچھ کہہ رہے ہو میری سمجھ میں خاک نہیں آیا اور اب اس سے پہلے کہ میں پولیس کو فون کر کے تمہارے بارے میں یہ بتاؤں کہ تم بغیر اجازت میرے مکان میں داخل ہوئے ہو بہتر یہ ہو گا کہ چپ چاپ اٹھ کر یہاں سے چلے جاؤ اور دوبارہ مجھ سے ملنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔"

"میں رام لال سے مل کر یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ تم نے مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ بھگوان کے لئے ایسا مت کرنا۔" شیلا کا چہرہ جو کچھ دیر پہلے گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا ایک دم ہی زرد پڑ گیا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔ میرے چہرے پر نظر جمائے وہ قدم اٹھاتی دوبارہ اس صوفے تک آئی جس پر کچھ دیر قبل بیٹھی تھی پھر دھم سے بیٹھ گئی۔ اس کے تنفس کی رفتار مجھے اب قدرے تیز نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسکی کیفیت کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔"

"مس شیلا ——— کیا آپ یہ پسند نہ کریں گی کہ مجھے اپنا راز دار بنا کر اس شیطانی چکر سے خود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا دلا دیں۔"

"نا ممکن ہے ———" وہ مردہ لہجے میں بولی۔ "دنیا کی کوئی طاقت مجھے ان بلاؤں سے نجات نہیں دلا سکتی۔ وہ دونوں بھیانک اور خطرناک شیطانی قوتوں کے مالک ہیں ——— میرے ساتھ وہ تم کو بھی جان سے مار ڈالیں گے۔ انسان سب کچھ کر سکتا ہے لیکن دیوی دیوتاؤں کی شکتی کے آگے اس کی ایک نہیں چلتی۔"

"میں ہر خطرے سے مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔" میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ "ابھی آپ نے وہ دونوں کا لفظ استعمال کیا تھا ——— کیا رام لال کے علاوہ کوئی اور بھی شیطانی قوت ایسی موجود ہے جو آپ کے علم میں ہے۔"

"ہاں ـــــــ لیکن میں ان کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی" شیلا ایک دم کانپ اٹھی پھر خوفزدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ کر بولی۔ "ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی اس وقت بھی یہاں موجود ہو اور ہماری باتیں سن رہا ہو ـــــــ"

"میں ان باتوں کا قائل نہیں ہوں اور ہر قیمت پر آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا ـــــــ" شیلا نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔ "مجھے اپنے بارے میں یقین ہے کہ زیادہ دنوں تک میں ان دو بلاؤں کا تنہا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اب اگر تم بھی میری خاطر اپنا جیون برباد کرنا چاہتے ہو تو پھر تمہاری مرضی۔ لیکن بعد میں مجھے کوئی دوش نہ دینا۔"

میں نے لوہے کو پگھلتا دیکھا تو دو چار لمبے چوڑے وعدے اور کر بیٹھا۔ شیلا میری باتوں پر بڑے مایوسانہ انداز میں مسکراتی رہی اور پھر سپاٹ لہجے میں بولی۔

"آج سے چار روز بعد پور نماشی کی رات ہے اس روز میں آدھی رات گزر جانے کے بعد پروفیسر۔ کے مکان پر جاؤں گی۔ تم اگر چوری چھپے اس کی خوابگاہ تک آ سکو تو پھر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا اپنی زبان سے میں اس کے علاوہ کچھ اور نہیں کہہ سکتی۔"

"کیا یہ ضروری ہے کہ آپ وہاں ضرور جائیں۔"

"ہاں ـــــــ میں اس کے لئے مجبور ہوں ورنہ۔"

اچانک درائنگ روم کے دروازے پر کچھ آہٹ سی ہوئی۔ میں چونکہ دروازے کی طرف پشت کئے بیٹھا تھا۔ اس لئے کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ لیکن شیلا اس آہٹ پر چونکی تھی۔ اس نے نظر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا پھر ایک بھیانک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ میں اس اچانک افتاد پر پریشان ہو کر تیزی سے اٹھا پھر کچھ سوچ کر دروازے کی طرف لپکا لیکن اس سے پیشتر کہ میں باہر نکل پاتا کسی نے بڑے غصے کی حالت میں باہر سے دروازہ بند کر کے اسے بولٹ کر دیا اس کے ساتھ ہی دروازے کی دوسری سمت سے کسی بلے کی خونخوار غراہٹ ابھری تو نہ جانے کیوں ایک لمحے کے لئے میرے جسم کے رونگٹے خوف کے مارے کھڑے ہو گئے لیکن دوسرے ہی لمحے میں تیزی سے لپک کر اس کھڑکی کے قریب آ گیا جو باہر راہداری میں کھلتی تھی۔ کھڑکی کا

ایک پٹ کھول کر میں نے راہداری میں دروازے کی سمت دیکھا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سیاہ رنگ کا ایک بلا جو جسامت میں کسی شکاری کتے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر کھڑا بڑی خونخوار آواز میں غرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے خون جھلک رہا تھا۔ میں نے ایک ثانئے کے لئے کچھ سوچا پھر بڑی پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا فوجی ریوالور نکال لیا جو کبھی مجھ سے دور نہیں رہتا تھا لیکن قبل اس کے میں اس خوفناک بلے کو نشانہ بناتا۔ خدا جانے اسے کس طرح میرے ارادے کا علم ہو گیا چنانچہ اس نے ایک دم ہی سے پلٹ کر اپنی خونی نگاہوں سے مجھے گھورا پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھٹتے گھٹتے ایک دم سے غائب ہو گیا۔ زندگی میں یہ پہلا حیرت انگیز واقعہ تھا جو خود میں نے اپنی نظروں سے دیکھا تھا دہشت کے مارے میں کانپ اٹھا۔ پھر مجھے شیلا کا خیال آیا تو تیزی سے پلٹ کر اس کی طرف آ گیا۔ اس کی نبض دیکھی جو آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ میں نے کچھ سوچ کر شیلا ہی کے فون سے ایک قریبی ڈاکٹر کو جلد از جلد دیئے ہوئے ایڈریس پر آنے کو کہا پھر کھڑکی کے راستے باہر آیا اور ڈرائنگ روم کے دروازے کو باہر سے کھولتا ہوا تیز تیز قدم اٹھاتا شیلا کے مکان سے باہر آ گیا۔ میں وہاں رک کر اپنی شخصیت کو پولیس یا دوسرے لوگوں کی نظروں میں مشکوک نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اسی وجہ سے میں نے ڈاکٹر کو فون کرتے وقت اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ صرف شیلا کا پتا نوٹ کرایا تھا۔

جس صبح شیلا کے مکان پر میں نے اس خوفناک سیاہ بلے کو دیکھا اس رات میں سوتے میں کئی بار چونک چونک کر اٹھا تھا۔ ہر بار اسی سیاہ بلے کی خونخوار غراہٹ میرے لاشعور میں گونج کر مجھے نیند سے بیدار کر دیتی تھی۔ میں تمام رات اس کے بارے میں سوچتا رہا یقین جانئے میں نے جس بلے کو شیلا کے دروازے کے باہر دیکھا تھا اس جیسا بھیانک اور خوفناک بلا میں نے اس سے پہلے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا میں جتنا اس پر اسرار مخلوق کے بارے میں سوچتا رہا اتنا ہی میرا ذہن الجھتا گیا پھر معا" مجھے خیال گزرا کہ کہیں یہ کوئی جناتی چکر نہ ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں چھوٹا سا تھا تو میری ماں ہمیشہ مجھے سیاہ بلیوں کو مارنے اور ان سے دور رہنے کی تاکید کیا کرتی تھیں۔ ایک ـــــــ بار انہوں نے میرے استفسار پر بتایا تھا کہ

سیاہ بلیوں کے بھیس میں پر اسرار روحیں ہوتی ہیں۔ اس لئے ان سے بچتے رہنا چاہئے۔ بچپنے کی یہ بات مجھے اچانک یاد آئی تو میں ایک نئی الجھن سے دوچار ہو گیا۔ رام لال کی شخصیت کے بارے میں میرے والد نے مجھے پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ غالباً وہ کسی سو سال پرانے سیاہ ناگ کا دوسرا روپ ہے۔ غرضیکہ شیلا کے ہاں پیش آنے والے واقعے نے جہاں مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا وہاں میرے تجسس کو اور بھی بھڑکا دیا تھا ——— !

تین روز تک میں جن حالات سے دو چار رہا۔ یہ میں ہی بہتر جانتا ہوں۔ اس دوران بارہا میرے دل نے یہ مشورہ دیا کہ میں اپنے ارادے سے باز آ جاؤں اور خواہ مخواہ ان شیطانی چکروں میں اپنی ٹانگ نہ پھنساؤں لیکن اپنی طبیعت اور اپنے دماغ کو کیا کرتا جو ہر لمحہ پورنماشی کی رات کے لئے بے چین تھے۔ ویسے بھی ایک تجربہ کار فوجی ہونے کی حیثیت سے ایک بار اڈوانس کر کے پیچھے ہٹ جانا میری فطرت کے خلاف تھا۔ چنانچہ بہت غور و خوض کے بعد میں نے اٹل فیصلہ کر لیا کہ رام لال کی شخصیت اور سیاہ بلے کی اصلیت ضرور معلوم کروں گا خواہ مجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ مجھے اپنے اس فیصلے کے لئے کس قدر لمبی سزا بھگتنی پڑ رہی ہے۔ اس کا احساس میں ہی بہتر کر سکتا ہوں اور اکثر سوچتا ہوں کہ اے کاش میں اپنے دل کا فیصلہ قبول کر لیا ہوتا تو آج یہ داستان لکھنے کی نوبت نہ آتی اور نہ ہی مجھے اس بات کا اقرار کرنے کی ضرورت پیش آتی کہ سیاہ بلیاں میری سب سے بڑی کمزوری ہیں۔

پورنماشی والے روز میں صبح سویرے اٹھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں خاصی دور تک ٹہلنے کو گیا۔ ایک کھلے پارک میں جا کر میں نے اس کے چار پانچ چکر لگائے پھر ستانے کے لئے بنچ پر بیٹھا تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی آ گئی۔ جانے کیوں غیر ارادی طور پر آج میں نے اسی انداز میں چاق و چوبند رکھنے کے لئے یہ ورزش کی تھی جیسی میں بارکوں میں رہنے کے دوران روزانہ صبح کیا کرتا تھا۔ ہنسی مجھے اس بات پر آئی تھی کہ میں شاید اپنے کو رات کے لئے تیار کر رہا تھا۔

خاصی دیر میں پارک میں بیٹھا حالات پر غور کرتا رہا پھر گھر آ کر میں نے تھوڑا مطالعہ کیا۔ دوپہر ہوئی تو کھانا کھا کر سو گیا۔ ملازم کو اس بات کی تاکید کر دی تھی کہ

مجھے اس وقت تک نہ جگایا جائے جب تک ازخود میری آنکھ نہ کھل جائے۔ یہ ہدایت میں نے اس لئے دی تھی کہ میں دل بھر کر سو لینا چاہتا تھا تاکہ رات کو شیطانی قوتوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہیں مجھ پر نیند کا غلبہ نہ طاری ہو جائے۔

شام کو میری آنکھ سات بجے کھلی۔ کمرے کی بتیاں روشن دیکھ کر ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں خاصی دیر تک سویا ہوں۔ نیند سے بیدار ہو کر میں نے سب سے پہلے غسل کیا تاکہ طبیعت کی کسلمندی دور ہو پھر شام کی چائے پی کر اپنے والدین کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا اور ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گیا۔

رات کے کھانے کا وقت آیا تو میں نے دیدہ دانستہ کم کھایا تاکہ سستی نہ ہونے پائے۔ کھانے کے بعد میں اپنے اصول کے مطابق ٹہلنے کی غرض سے باہر چلا گیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک کھلی فضا میں چہل قدمی کے بعد واپس لوٹا تو میرے والد سونے کے لئے اپنی خوابگاہ میں جا چکے تھے لیکن والدہ ابھی تک جاگ رہی تھیں کچھ سوچ کر میں نے اپنی ماں سے کہا۔

"آج رات مقامی ٹریننگ سنٹر میں کیڈٹوں کی میس نائٹ (Mess Night) منائی جا رہی ہے اور میں وہاں مدعو ہوں۔ ہو سکتا ہے میری واپسی صبح تک ہو اس لئے آپ پریشان نہ ہوں۔"

"لیکن تم نے مجھ سے پہلے کسی ایسے پروگرام کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔" ماں نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو میں ایک لمحے کے لئے گڑبڑا گیا پھر ہونٹوں پر لاپرواہ سی مسکراہٹ بکھیر کر بولا۔

"بات ذہن سے نکل گئی تھی ورنہ مجھے تین روز قبل ہی اس دعوت کا علم ہو گیا تھا۔"

اپنی والدہ کو سونے کے لئے ان کی خوابگاہ تک پہنچانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ آرام کرسی پر بیٹھ کر میں نے اپنا پسندیدہ تمباکو پائپ میں بھرا پھر پائپ جلا کر اس کے لمبے لمبے کش لیتا ہوا دوبارہ ان حالات اور واقعات پر غور کرنے لگا جو اب تک رام لال سے متعلق میرے علم میں آ چکے تھے۔ خاص طور پر وہ سیاہ بلا اور اس کی خونخوار آنکھیں اس وقت بھی میرے ذہن پر مسلط تھیں۔

میرے دل نے ایک بار پھر مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنے ارادے سے باز آجاؤں۔ کوئی ان دیکھی قوت مجھے بار بار احساس دلا رہی تھی کہ اگر میں اپنے ارادے سے باز نہ آیا تو عمر بھر پچھتانا پڑے گا۔ لیکن ذہن اپنے فیصلے پر ڈٹا ہوا تھا۔

گھڑی نے ساڑھے گیارہ کا اعلان کیا تو میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ الماری سے اپنا سوٹ نکال کر پہنا پھر اپنا سروس ریوالور دراز سے نکال کر اس کے چیمبر کو بھرا اور کچھ فاضل راؤنڈ واچ پاکٹ میں رکھ کر کمرے سے باہر آگیا۔ باہر راہداری میں ہلکے پاور کا بلب روشن تھا۔ میں پنجوں کے بل چلتا ہوا راہداری کو عبور کرتا لان تک آگیا اور دوسرے ہی لمحے میں احاطے کے پھاٹک سے نکل کر کھلی سڑک پر آگیا جہاں اب کچھ زیادہ چہل پہل نہیں تھی۔ بس اکا دکا آدمی نظر آرہے تھے۔

رام لال کی رہائش میرے مکان سے بمشکل ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ میں جلد ہی وہاں پہنچ گیا لیکن اس کے پھاٹک کے سامنے رکنے کی بجائے خاموشی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ کچھ سوچ کر میں نے اچانک یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ مکان میں داخل ہونے کے لئے پشت والا راستہ زیادہ محفوظ ثابت ہو گا۔ چنانچہ میں چہل قدمی کرتا ہوا رام لال کے مکان کی پشت پر آگیا جہاں ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔ اپنی گھڑی پر نظر ڈالی تو بارہ بجکر تین منٹ ہو رہے تھے۔ چند ثانئے تک میں حد بندی کی دیوار کے ساتھ لگا کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر سوچے ہوئے پروگرام کے تحت میں نے تین بار آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کی اور حدبندی کی دیوار پھلانگ کر اندر احاطے میں داخل ہو گیا۔ کسی فوری خطرے سے مقابلہ کرنے کے لئے میں نے اپنا ہاتھ جیب میں پڑے ہوئے ریوالور کے دستے پر بڑی مضبوطی سے جما رکھا تھا۔ میں ایک ایک قدم ناپ تول کر اٹھا رہا تھا۔ میری عقابی نظریں اطراف کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

رام لال کی خوابگاہ تک پہنچنے میں مجھے پورے بیس منٹ صرف کرنے پڑے۔ اس دوران میں اگر کوئی جھینگر بھی اچانک بول اٹھتا تو میں اچھل پڑتا تھا۔ لیکن یہاں ایک بات باور کرا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ محض احتیاط کے پیش نظر تھا ورنہ میں مطلق خائف نہ تھا۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ میں کسی پیش آنے والے حادثے کی بو سونگھ رہا تھا۔ اسے آپ میری چھٹی حس سمجھیں!

رام لال کی خوابگاہ کمروں کی قطار کے درمیان واقع تھی۔ چنانچہ میں نے راہداری میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس زیرو کے بلب کو نکال کر جیب میں ڈال لیا جو راہداری کے درمیان روشن تھا۔ بلب کو اتارنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔ بس ایک کھڑکی کی چوکھٹ پر پاؤں جما کر ذرا سا اوپر اٹھنا پڑا تھا۔ بلب کو نکالتے ہی بیرونی راہداری میں گھپ اندھیرا پھیل گیا۔ اب مجھے اس بات کا کوئی خدشہ نہیں تھا کہ کوئی دوسرا شخص چھپ کر میری حرکات و سکنات کا جائزہ لے سکتا ہے۔ اس کام سے نپٹ کر میں دبے قدموں آگے بڑھ کر اس کھڑکی تک آگیا جو رام لال کی خوابگاہ میں کھلتی تھی میرا خیال تھا کہ وہ کھڑکی بند ہو گی لیکن قریب جا کر جب میں نے دیکھا تو وہ اندر سے بولٹ نہیں تھی۔ دھڑکتے ہوئے دل سے میں نے کھڑکی کے ایک پٹ کو ذرا سا اندر کی طرف دبایا پھر اس پردے کو بھی آہستہ آہستہ کھسکانے لگا جو کھڑکی پر موجود تھا۔ پردے سے چھنتی ہوئی نیلی روشنی دیکھ کر مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اندر نیلے رنگ کی مدھم سی روشنی ہو رہی ہے ابھی تک میں نے اندر سے کسی آہٹ کی ایک معمولی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ ایک لمحے کے لئے میرے ذہن نے سوچا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ شیلا نے مجھے پھانسنے کے لئے کوئی جال بچھایا ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب پردے کے درمیان تھوڑا سا خلا پیدا ہوا اور میں نے اندر جھانکا تو خوف کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی سے گزر گئی اور جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خوف و دہشت کے مارے قریب تھا کہ میری چیخ نکل جاتی لیکن میں نے ازخود اپنا الٹا ہاتھ پوری قوت سے منہ پر جما لیا اور پھٹی پھٹی خوفزدہ نظروں سے اس منظر کو دیکھنے لگا جس نے مجھ جیسے نڈر اور بے خوف آدمی کے دل کو بھی دہلا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جسم کا سارا خون منجمد ہو کر رہ جائے گا ——————!

جی ہاں ——————— میری نظروں نے کچھ ایسا ہی ہولناک منظر دیکھا تھا جسے میں آج بھی محسوس کرتا ہوں تو جسم پر کپکپاہٹ طاری ہو جاتی ہے۔

جس وقت میں نے کھڑکی کے پردے کو ہٹا کر اندر دیکھا تو اس وقت رام لال کی خوابگاہ میں جہاں ہلکے نیلے رنگ کا بلب روشن تھا ایک عجیب و غریب ڈراما کھیلا جا رہا

تھا۔ میں نے شیلا پرکاش کو ایک مسہری پر نیم برہنہ حالت میں دیکھا تھا۔ اس کا اوپری جسم قریب قریب کپڑے سے بالکل ہی بے نیاز تھا اور ایک سیاہ رنگ کا موٹا تازہ ناگ اس کی چھاتی سے چمٹا ہوا دودھ پی رہا تھا۔ کمرے کی ملگجی روشنی کے باوجود میں نے شیلا کے چہرے پر کرب کی جو جھلک دیکھی تھی۔ وہی میرے لئے اس قدر دہشت ناک تھی کہ میں سن ہو کر رہ گیا۔ کسی بے جان بت کی طرح اپنی جگہ خاموش کھڑا میں پھٹی پھٹی نظروں سے اس منظر کو دیکھتا رہا پھر اس وقت چونکا جب سیاہ ناگ نے اپنا پھن اوپر اٹھایا تھا اور اب وہ شیلا کے برہنہ سینے پر بیٹھا اپنا پھن اٹھائے جھوم رہا تھا۔ ایک دو بار وہ جھومتے جھومتے شیلا کے چہرے کے قریب اپنا پھن لے آتا پھر دوبارہ سیدھا ہو کر جھومنے لگتا۔

شیلا بدستور دم سادھے بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میرے ذہن میں اچانک یہ خیال بڑی تیزی سے ابھرا کہ کیوں نہ شست باندھ کر اس موذی ناگ کے جسم میں اپنے ریوالور کی تمام گولیاں اتار دوں لیکن قبل اس کے میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتا سیاہ ناگ تیزی سے رینگ کر مسہری کے نیچے اتر آیا اور زمین پر قلابازیاں کھانے لگا۔ میں بڑی توجہ سے اس موذی کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا اور پھر ——— اف میرا خدا ——— جب میں نے سانپ کو اچانک رام لال کی صورت میں زمین سے اٹھتے دیکھا تو میری حیرت اور تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مجھے والد صاحب کی کہی ہوئی بات یاد آگئی جو انہوں نے مجھے پرانے ناگوں کے بارے میں بتائی تھی۔ اس وقت مجھے اپنے والد کی بات پر یقین نہیں آیا تھا لیکن اس وقت جب میں نے خود اپنی نظروں سے سیاہ ناگ کو شکل بدلتے دیکھا تو خوف کے مارے کانپ اٹھا۔

رام لال کا جسم اس وقت کپڑوں کی قید سے آزاد تھا۔ مسہری سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑا وہ شیلا پرکاش کو بڑی غلیظ نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی ناپاک زبان بار بار اس کے گندے ہونٹوں پر یوں پھسل جاتی جیسے وہ ابھی تک کسی چیز کا ذائقہ لے رہا ہو۔ کچھ دیر تک وہ یوں ہی کھڑا شیلا کو گھورتا رہا پھر آگے بڑھ کر اس کے قریب آگیا اور کھردرے لہجے میں بولا۔

”دیوی ——— تیری تپسیا خالی نہیں جائے گی۔ دیوتاؤں کو اگر منظور ہوا تو کچھ دنوں میں تو بھی امر ہو جائے گی۔ پھر دیوتا تجھے ناگن بنا کر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔“

شیلا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اس کی آنکھوں میں نفرت اور مجبوری کی جھلک محسوس کر رہا تھا۔ رام لال کی بات سن کر وہ آہستہ سے اٹھی پھر اس نے اپنے اوپری جسم کو ڈھانپنے کی کوشش کی ہی تھی کہ اچانک اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ اس کی خوف و دہشت سے پھٹی پھٹی نظریں بائیں سمت کسی چیز پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنی توجہ کمرے کے بائیں سمت کی تو خود میری کیفیت بھی شیلا سے مختلف نہ رہ سکی۔ میری نگاہوں کے سامنے اس وقت وہی سیاہ بلا موجود تھا جسے میں چار روز قبل شیلا کی رہائش ...... پر دیکھ چکا تھا۔ قدوقامت کے اعتبار سے اس وقت وہ کچھ زیادہ ہی بڑا لگ رہا تھا۔ اس کی خونی اور بڑی بڑی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور حلق سے ہلکی ہلکی خوفناک غراہٹ کی آواز خارج ہو رہی تھی۔ اس کی شعلہ بار اور خوفناک آنکھیں شیلا پر جمی ہوئی تھیں جو کسی بید مجنوں کی مانند کپکپا رہی تھی۔

اچانک میں نے رام لال کو سیاہ بلے کی طرف متوجہ ہوتے دیکھا دوسرے ہی لمحے وہ تیزی سے فرش پر اوندھے منہ گر کر لوٹنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے رام لال کی جگہ پھر سیاہ ناگ نے لے لی۔ سانپ کی شکل اختیار کر لینے کے بعد وہ پھن اٹھا کر تیزی سے لہراتا بل کھاتا سیاہ بلے کی طرف جھپٹا تھا۔

کمرے میں سانپ کی پھنکار اور سیاہ بلے کی خونخوار غراہٹ نے عجیب دہشتناک ماحول پیدا کر دیا تھا۔ شیلا بدستور سہمی ہوئی بیٹھی پھٹی پھٹی نظروں سے ان دونوں بلاؤں کو دیکھ رہی تھی اور دوسری طرف میں تصویر حیرت بنا کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب میرا اگلا اقدام کیا ہونا چاہئے۔ میری نگاہیں سیاہ ناگ پر جمی ہوئی تھیں جو فضا میں نصف دھڑ اٹھائے کسی بدمست شرابی کی طرح لہراتا ہوا ہر لمحے سیاہ بلے کے قریب ہوتا جا رہا تھا پھر جیسے ہی اس نے اپنے حریف کے قریب پہنچ کر اس پر حملہ کیا۔ سیاہ بلا اچھل کر ہٹ گیا سانپ کا پھن اپنی جھونک میں پتھریلے فرش سے ٹکرایا تو وہ غضبناک ہو گیا۔

دوسری بار اس نے طیش میں پھن مارا تو سیاہ بلا دوبارہ اچھل کر ہٹ گیا پھر اچانک بلے کے حلق سے ایک خوفناک غراہٹ ابھری۔ اتنی کرخت اور خوفناک آواز کہ میں بھی کانپ اٹھا اور اس کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا وہ میری حیرت میں مزید اضافہ کرنے کے لئے بہت کافی تھا۔ سیاہ ناگ جو پھن اٹھائے لپک رہا تھا۔ اس خوفناک آواز کو سن کر یوں اپنی جگہ ساکت ہو گیا جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے اسے جکڑ لیا ہو۔ اس کا پورا جسم فضا میں اکڑ کر رہ گیا تھا صرف آنکھیں اپنے حلقوں میں کھلتی بند ہوتی نظر آ رہی تھیں۔

ایک لمحے تک سیاہ بلا سانپ کی نفرت انگیز نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر وہ آہستہ سے شیلا کی طرف پلٹا اور یوں گھورنے لگا جیسے وہ اچانک ہی اس پر حملہ کر دینا چاہتا ہو۔ میرے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہونے لگیں۔ کچھ سوچ کر میں نے ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کی اور سیاہ بلے کا نشانہ لے کر لبلبی دبادی مگر ٹھیک اسی وقت بلے نے اپنی جگہ سے جست لگائی اور اچھل کر شیلا پر آ رہا۔ شیلا کی کربناک چیخ بڑی دہشتناک تھی۔ میں نے دوبارہ سیاہ بلے کو نشانا بنانا چاہا تو نہ جانے کیوں میرا ہاتھ کانپنے لگا اور پھر جو منظر میں نے دیکھا وہ کچھ اس قدر اذیت ناک تھا کہ میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

سیاہ بلے نے ایک ہی جھپٹے میں شیلا پرکاش کے خوبصورت چہرے کو مسخ کر دیا تھا۔

دوسری بار جب میں نے آنکھ کھولی تو دہشت کے مارے لرز کر رہ گیا۔ میں نے شیلا پر نظر ڈالی جو مسہری پر پڑی ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ گوشت کے لوتھڑے خون میں تربتر جھولتے نظر آ رہے تھے۔ سیاہ بلے نے اس کے سارے جسم کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ شیلا کے حلق سے خرخراہٹ کی کربناک آواز بلند ہو رہی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ شیلا بس اب کسی دم کی مہمان رہ گئی ہے۔ اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر میں نے سیاہ بلے کو دیکھا جو سیاہ ناگ کے سامنے بیٹھا غالباً" شیلا پرکاش کے جسم سے نچے ہوئے گوشت کے ایک ٹکڑے کو اپنے پنجوں میں دبائے دانتوں سے بھنبھوڑ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میرے بدن میں جھرجھری سی

پیدا ہوئی۔ پھر مارے غصے کے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اپنا ریوالور والا ہاتھ بلند کیا اور پے در پے چیمبر میں موجود تمام گولیاں سیاہ بلے پر جھونک ماریں لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ریوالور سے نکلی ہوئی تمام گولیاں بے اثر ثابت ہوئی۔ اتنا ضرور ہوا تھا کہ گولیوں کی آواز سن کر اب وہ سیاہ اور خونخوار بلا مجھے غضب ناک نظروں سے گھورنے لگا تھا۔ پھر کمرے میں ایک خوفناک آواز ابھری۔

"شیرازی ——— بھاگ جاؤ یہاں سے ...... تم روحوں کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتے ...... میں آج ناگ دیوتا کے گھمنڈ کو خاک میں ملانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

میں نے وہ پر اسرار آواز سنی ضرور تھی لیکن شیلا کی کیفیت نے میرے اوپر جو جنونی حالت طاری کر دی تھی۔ اس نے مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیا فاضل گولیاں واچ پاکٹ سے نکال کر میں نے اپنا ریوالور دوبارہ بھرا مگر اس سے قبل کہ میں سیاہ بلے کو نشانہ بنا سکتا وہ تیزی سے اچھل کر میری طرف آیا۔ دہشت اور خوف کے مارے میرے حلق سے ایک گھٹی چیخ نکل گئی۔ پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ملٹری ہاسپٹل میں پایا۔ جہاں میرے والدین کے علاوہ ڈاکٹروں کی ایک پوری جماعت میرے ہوش میں آنے کی منتظر تھی۔ چند ثانئے تک میں خالی الذہن حالت میں کمرے کی چھت کو تکتا رہا۔ رفتہ رفتہ میری یاداشت تازہ ہونے لگی۔ اس کے بعد ڈاکٹروں نے میرے ساتھ کیا کیا مجھے کچھ یاد نہیں۔

تقریباً" ایک ماہ بعد ہسپتال سے رخصت ہونے پر جب میں نے اپنے واقف کاروں سے شیلا پرکاش اور رام لال کے بارے میں دریافت کیا تو مجھے یہی بتایا گیا کہ رام لال اب اس مکان میں نہیں رہتا۔ لوگوں کے بیان کے مطابق جس روز میں رام لال کے مکان میں بے ہوشی کی حالت میں پایا گیا تھا۔ اس کے دوسرے دن انہیں اس مکان کے باہر انسانی ہڈیوں کا ایک پنجرا پڑا ملا تھا جس کے بارے میں یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ انسانی ڈھانچہ بدنصیب شیلا ہی کا تھا جو دو شیطانی قوتوں کی رقابت کا شکار

ہوئی تھی۔

میرے والد کے ایما پر پولیس کی ایک بھاری جمعیت نے رام لال کے مکان کی تلاشی لی تھی لیکن نہ تو انہیں رام لال ہی کہیں نظر آیا اور نہ ہی سیاہ ناگ اور سیاہ بلے کا کوئی سراغ ملا۔ لیکن ان واقعات کے پیش نظر اتنا ضرور ہوا کہ وہ مکان جس میں رام لال رہتا تھا منحوس مشہور ہو گیا۔ مالک مکان نے اسے سستے داموں فروخت کرنے کی بھی بہت کوشش کی لیکن بے سود ——— چنانچہ وہ آج بھی خالی پڑا ہے لوگ آج بھی اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے کتراتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ میرے پرانے واقف کار بھی اب مجھ سے کترانے لگے ہیں۔ شاید اس لئے کہ سیاہ بلے کے پنجوں سے آنے والی خراشیں آج بھی میرے چہرے پر موجود ہیں۔ میرے دوست مجھے منحوس سمجھنے لگے ہیں۔ لیکن مجھے اپنے ملنے جلنے والوں سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اس لئے کہ پیش آنے والے واقعات نے انہیں مجھ سے بھی محتاط رہنے پر مجبور کر دیا ہے ———!

اس واقعے کو آج پورے اڑتیس سال ہو گئے ہیں۔ لیکن مجھے آج بھی یہ کل کا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔

○

منگیتر کی موت

کہر میں ڈوبی ہوئی وہ رات بے حد سرد تھی۔

اس وقت رات کے بارہ کا عمل تھا۔ وقت کا اندازہ موڈرن سوسائٹی کے اس کلاک ٹاور سے ہوا تھا جس نے ابھی ابھی بارہ گھنٹے بجائے تھے۔ سوسائٹی کا علاقہ جو گئی رات تک ہنگاموں کی آماجگاہ بنا رہتا تھا۔ آج سرشام ہی سے ویران اور سنسان ہو گیا تھا۔ خنکی کے ساتھ ہی دھند کی دبیز چادر نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ کبھی کبھار کسی اکا دکا کار کے گزرنے کی آواز فضا کے سکوت کو درہم برہم کر جاتی یا گندی نالی میں دبکے ہوئے کسی کتے کے رونے کی کریہہ آواز ہوا کے دوش پر دور تک لہراتی چلی جاتی۔

موڈرن سوسائٹی کی تیسری گلی میں گشت کرتا ہوا ڈیوٹی کانسٹیبل لانبے چسٹر کو جس کے سامنے کے دو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے بار بار ہاتھوں سے ٹھیک کر رہا تھا۔ چسٹر کے کالر کو اس نے کچھ اس انداز میں لوٹ کر اوپر اٹھا دیا تھا کہ اس کے کان کے ساتھ چہرے کا نصف حصہ بھی چھپ گیا تھا۔ اس کے وزنی بوٹ کی آواز اس سنسان رات میں کافی دور تک سنی جا سکتی تھی۔ لمبے لمبے قدم اٹھاتا وہ جلد از جلد شہباز کے قہوہ خانے تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جو گیارہویں گلی پر کمرشل ایریا کے آخری سرے پر واقع تھا۔ شہباز کا یہ قہوہ خانہ پوری رات کھلا رہتا تھا اور گشت پر موجود کانسٹیبل جس کے چسٹر پر سینے کے داہنی جانب پیتل کا بنا ہوا آٹھ کا ہندسہ جھلملا رہا تھا ہر رات ٹھیک اس وقت شہباز کے قہوہ خانے میں جا کر قہوے کا ایک پیالہ اپنے خون کو حدت پہنچانے کی غرض سے ضرور پیا کرتا تھا۔ گزشتہ بیس روز سے جب سے وہ اس علاقے میں تعینات ہوا تھا اس کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

تیسری گلی کے بڑے چورستے پر رک کر آٹھ نمبر کے کانسٹیبل نے چسٹر کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا پھر ماچس جیب میں ڈال کر سگریٹ کے طویل کش لیتا ہوا گیارھویں گلی کی سمت بڑھنے لگا جو بمشکل ایک فرلانگ پر واقع تھی۔ دھند کی دبیز چادر ہر لمحے گہری ہوتی جا رہی تھی اور خنکی میں ہر لحظ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سڑک پر اس وقت گہرا سکوت طاری تھا۔ ہوا کی سائیں سائیں کرتی ہوئی آواز بڑی پر اسرار لگ رہی تھی۔

ختم ہوتے سگریٹ کا آخری کش لگا کر آٹھ نمبر کے کانسٹیبل نے اسے فضا میں اچھالا پھر وہ سڑک عبور کرنے کی خاطر گھوما ہی تھا کہ کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر رک گیا۔ پہلے بھی متعدد موقعوں پر وہ رات کے سناٹے میں بہکے ہوئے آوارہ جوڑوں کو ڈرا دھمکا کر ان سے لمبی لمبی رقمیں حاصل کر چکا تھا چنانچہ اس وقت بھی آہٹ کی آواز سن لینے کے بعد وہ کسی مشاق شکاری کی طرح تیزی سے پلٹا اور اور پشت کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کی چمکتی ہوئی بڑی بڑی نگاہیں اس لڑکی کے چہرے پر جم کر رہ گئیں جو شب خوابی کے لباس میں ملبوس گردن اٹھائے چلی آ رہی تھی۔ لڑکی کے سیاہ اور لمبے بال اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ چہرے کے خد و خال کے علاوہ رنگت کے اعتبار سے بھی اسے حسین ترین کہا جا سکتا تھا ——— وہ بالکل تنہا تھی اور غالباً" کسی قریب کے بنگلے سے نکلی تھی لیکن اس سرد رات میں اس کا محض ایک باریک ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس ہونا کانسٹیبل کے لئے تعجب خیز بات تھی۔ لڑکی کے بارے میں وہ ابھی تک کوئی آخری رائے قائم نہیں کر سکا تھا۔ ماڈرن سوسائٹی میں چونکہ زیادہ تر بڑے لوگ اور اعلیٰ افسران رہتے تھے اس لئے وہ کوئی اوچھا ہاتھ ڈال کر اپنی اچھی خاصی ملازمت سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا تھا۔

لڑکی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے قریب سے ہو کر گزر گئی تو کانسٹیبل نے اپنے شانوں کو جھٹکا اور سڑک عبور کر کے دوسری طرف آ گیا۔ اس نے اپنے تجربے کی بنا پر لڑکی کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہیں کی تھی۔ اگر وہ بری ہوتی یا کسی غلط ارادے سے گھر سے نکلی ہوتی تو ویران سڑک پر ایک پولیس والے کو دیکھ کر ضرور چونکتی۔ لیکن اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی وہ گردن اکڑائے، نظر سامنے

جمائے بڑے پر وقار انداز میں قدم اٹھاتی کانسٹیبل کے قریب سے گزر گئی تھی۔

آٹھ نمبر کے کانسٹیبل نے سڑک عبور کی پھر دونوں ہاتھ چسٹر کی جیب میں ڈالے اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا اس پتلی گلی میں ہو لیا جس کے دوسرے سرے پر کمرشل ایریا واقع تھا۔ تقریباً" دس منٹ بعد ہی وہ شہباز کے قہوہ خانے میں بیٹھا بھاپ اڑاتی ہوئی سبز چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔

○

دوسری شام منظر عام پر آنے والے روزناموں نے شہر میں خوف و دہشت کی لہر دوڑا دی۔ بیرسٹر نوازش علی کی پر اسرار موت کی خبر کے ساتھ ہی چند ایسی تصاویر بھی شائع ہوئی تھیں جو جائے واردات سے متعلق تھیں۔ ایک تصویر میں مقتول کا صرف درمیانی دھڑ نظر آ رہا تھا۔ جسم کے دوسرے حصوں کی تصویریں علیحدہ شائع کی گئی تھیں۔ اخبار کی رپورٹ کے مطابق نوازش علی کو 18 اور 19 دسمبر کی درمیانی شب کو ان کے ذاتی بنگلے میں جو ماڈرن سوسائٹی کی بارھویں گلی پر واقع تھا۔ ایک اور ڈیڑھ بجے کے درمیان قتل کیا گیا تھا۔ قتل کی اطلاع پولیس کو گزشتہ رات ہی فون پر موصول ہو گئی تھی۔ لیکن اطلاع دینے والے نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ پولیس اسٹیشن کا انچارج انسپکٹر سراج جو اس وقت تھانے پر موجود تھا اطلاع ملتے ہی اپنے آدمیوں سمیت جائے واردات پر پہنچ گیا۔

قاتل یا قاتلوں نے مقتول نوازش علی کو ان کی خوابگاہ میں بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ مقتول کے ہاتھ پاؤں اس کے جسم سے کاٹ کر علیحدہ کر دیئے گئے تھے اور خوابگاہ میں ادھر ادھر بکھرے ملے تھے۔ خوابگاہ میں جابجا خون کے چھینٹے اور بڑے بڑے دھبے موجود تھے۔ بعد کی تفتیش سے صرف اسی حد تک پتا چل سکا کہ مقتول کو اس کے سر پر کسی وزنی ہتھیار سے ضرب لگا کر ہلاک کیا گیا پھر اس کے جسم کے ٹکڑے کئے گئے۔ پولیس سرجن نے اپنی رپورٹ میں اس بات کا اظہار بھی کیا تھا کہ مقتول ایک صحت مند دل اور مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا۔

انسپکٹر سراج نے اپنی خفیہ رپورٹ میں اس بات کا تذکرہ بھی کیا تھا کہ مقتول

انتہائی اوباش اور بد کردار واقع ہوا تھا۔ اپنے بنگلے میں وہ تنہا رہا کرتا تھا اور اپنے تمام ملازمین کو سر شام ہی سے چھٹی دے دیا کرتا تھا تاکہ کوئی اس کی عیاشی میں مداخلت نہ کر سکے۔ قرب و جوار میں رہنے والے افراد نے نوازش علی کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی تھیں۔ پہلا بیان نوازش علی کے سب سے قریبی پڑوسی سیٹھ اکبر کا تھا۔

”جس بے دردی سے نوازش علی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے وہ تمام منظر دیکھ کر خود مجھے بھی صدمہ ہوا ہے لیکن میں بڑے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب ہماری راتوں کی نیند حرام نہیں ہو گی۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مقتول سے میری کوئی ذاتی رنجش نہیں تھی۔ لیکن ایک جوان لڑکی کا باپ ہونے کی حیثیت سے میری ہمیشہ سے یہی خواہش رہی تھی ——— کہ نوازش علی اگر ہمارا محلہ چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ وہ حد درجہ عیاش واقع ہوا تھا۔ بیشتر راتوں کو کوئی نہ کوئی آوارہ عورت اس کی خوابگاہ میں موجود رہتی تھی۔ اور جب بھی ایسا ہوتا تمام رات ہنگامہ جاری رہتا تھا ——— اسی وجہ سے اس نے ابھی تک شادی بھی نہیں کی تھی۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے تو میں یہ کہوں گا کہ مقتول نے اپنے پڑوسیوں سے کبھی کوئی دنگا فساد نہیں کیا تھا نہ ہی وہ کسی سے کوئی تعلق رکھنا پسند کرتا تھا ——— میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ نوازش علی کے قتل میں کسی لڑکی کا مسئلہ ضرور درپیش رہا ہو گا۔“

انسپکٹر سراج کے مزید سوالوں کے جواب میں سیٹھ اکبر نے کچھ ایسی لڑکیوں کے نام پتے بھی فراہم کئے تھے جو اکثر نوازش علی کی قیام گاہ پر دیکھی گئی تھیں۔ انسپکٹر سراج سے اس نے بات کی درخواست بھی کی تھی لڑکیوں کے نام اور پتے کے سلسلے میں اس کا نام درمیان میں نہ آنے پائے۔ مبادا ان لڑکیوں کے والدین اور شوہروں سے مفت میں رنجش کے امکانات پیدا ہوں۔

مقتول کے دوسرے پڑوسی پروفیسر فاروقی نے انسپکٹر سراج کو کوئی بیان دینے سے قطعی طور پر انکار کر دیا تھا لیکن اس کے چہرے پر ابھرنے والے نفرت کے تاثرات نے اس بات کی ترجمانی کر دی تھی کہ وہ بھی نوازش علی کو پسندیدہ نظروں سے نہیں

دیکھتا تھا۔ ایک تیسرے شخص نے بھی کم و بیش وہی بیان دیا تھا جو سیٹھ اکبر کا تھا۔ اس نے بھی انسپکٹر سراج کو تھوڑی جھجک کے بعد کچھ ایسی عورتوں اور لڑکیوں کے نام پتے بتائے تھے جن کو مقتول کی رہائش گاہ پر آتے جاتے دیکھا گیا تھا۔ سب سے زیادہ اہم معلومات انسپکٹر سراج کو مقتول کے پڑوس میں رہنے والے ایک ایسے صحافی سے ملی تھی جو ایک روزنامے میں ملازم تھا۔

”مجھے یقین تھا جناب کہ ایک نہ ایک دن نوازش علی کی خرمستیاں رنگ لا کر رہیں گی۔“

”کیا اس کی کوئی وجہ تھی؟“ انسپکٹر سراج نے پوچھا۔

”جی ہاں ———“ صحافی جس کا نام احمد کریم تھا بڑے فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ”جرم و گناہ کے بارے میں کم از کم میرا نظریہ یہی ہے کہ اس کا انجام ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔ نوازش علی کی عیاشی بھی حدود سے تجاوز کرتی جا رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ کسی معصوم کی آہ اسے لے ڈوبی۔“

”آپ کا ذاتی خیال مقتول کے بارے میں کیا ہے؟“

”بظاہر وہ ایک شریف اور نیک انسان نظر آتا تھا۔ لیکن صرف دن کی روشنی میں۔ رات میں وہ ہمیشہ درندہ بن جاتا تھا۔ اپنی پسندیدہ لڑکیوں اور عورتوں کو حاصل کرنے کی خاطر وہ بے دریغ دولت صرف کرتا تھا۔ اس کی آمدنی بھی میری معلومات کے مطابق اچھی خاصی تھی۔“

”کیا آپ کچھ ایسی لڑکیوں کے پتے بتا سکیں گے جو مقتول کی ہوس کا نشانہ بن چکی ہیں۔“

”بڑا عجیب سوال پوچھ رہے ہیں آپ۔“ احمد کریم نے مسکراتے ہوئے کہا پھر سنجیدگی اختیار کر کے بولے۔ ”اول تو یہ کہ میں مقتول کے دوستوں میں سے نہیں تھا جو اس سے خواب گاہ کی تفصیل دریافت کر سکتا۔ دوئم یہ کہ ہوس کا نشانہ بننے والی بات بھی اس وقت تسلیم کی جا سکتی ہے جب کسی کو زبردستی اور اس کی خواہشات کے خلاف برباد کیا جائے۔ ممکن ہے نوازش علی نے کچھ لڑکیوں یا عورتوں کو ان کی مرضی کے خلاف بھی اپنی ہوس کاری کا نشانہ بنایا ہو لیکن میں اس سلسلے میں وثوق کے ساتھ

کچھ نہیں کہہ سکتا ———— اب رہا لڑکیوں کے نام اور پتے کا سوال تو میں ایک دو کو صورت سے ضرور شناخت کر سکتا ہوں لیکن ان کے نام اور پتے سے قطعاً ناواقف ہوں ———— ہاں! اگر نوازش علی کی زندگی کچھ دنوں اور وفا کرتی تو ممکن تھا وہ راہ راست پر آ جاتا۔"

"بڑی نوازش ہو گی اگر آپ اس جملے کی وضاحت بھی کر دیں" انسپکٹر سراج نے احمد کریم کی منطقی گفتگو سے قدرے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ اس جملے پر ضرور چونکیں گے۔" احمد کریم نے کہا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ نوازش علی عنقریب شادی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے یہ بات اس کے ایک قریبی جاننے والے نے بتائی تھی! ———— آپ غالباً اس لڑکی کے والد کو جانتے بھی ہونگے۔ خان شاہنواز جو کسی زمانے میں فوج میں بھی رہ چکے ہیں۔"

"جی ہاں ———— میں یہ نام سن چکا ہو لیکن کیا مسٹر شاہنواز کو نوازش علی کی عادتوں کے بار۔ یں کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ بذات خود بھی موڈرن سوسائٹی میں رہتے ہیں۔"

"یقیناً معلوم ہو گا۔" احمد کریم نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن میں نے اکثر والدین کو موجودہ زمانے میں جوان لڑکیوں کی ضد کے آگے سر تسلیم خم کرتے دیکھا ہے۔"

"اوہ ———— گویا مسٹر شاہنواز کی لڑکی نوازش علی میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔"

"بالکل یہی بات ہے جناب۔" احمد کریم نے کہا پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر برجیس شاہنواز کو نوازش علی میں کیا خوبی نظر آ گئی جو وہ اس پر اس قدر فریفتہ ہو گئی۔ میں نے اسے بار ہا نوازش علی کے مکان پر آتے جاتے دیکھا ہے! ———— غالباً کل رات بھی وہی رہی ہو ...... میں جلدی میں تھا اس لئے ٹھیک طور سے اسے دیکھ نہیں سکا ...... ویسے بھی اس قسم کے معاملات میں دلچسپی لینا میری عادت کے خلاف ہے۔"

"مسٹر شاہنواز کے بنگلے کا نمبر معلوم ہے آپ کو۔"

"جی ہاں ———— گیارہویں گلی کی بائیس نمبر کی کوٹھی ان ہی کی ہے۔ آپ کسی سے بھی دریافت کر لیں۔"

"کل رات آپ نے کس وقت برجیس شاہنواز کو نوازش علی کے ساتھ دیکھا تھا۔" انسپکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے سوال کیا۔

"نوازش علی اس کے ہمراہ نہیں تھا۔ رہا وقت کا سوال تو میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت رات کے سوا بارہ یا ساڑھے بارہ کا عمل رہا ہو گا۔ میں دفتر سے عموماً اسی وقت واپس ہوتا ہوں۔ لیکن یہ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ برجیس ہی ہو گی ———— میں نے محض ایک شبہ کا اظہار کیا تھا۔"

"بہت خوب" ———— انسپکٹر سراج نے دوسرا رخ اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا گزشتہ رات سے قبل بھی کبھی آپ نے برجیس کو نوازش علی کی قیامگاہ پر دیکھا ہے۔"

"شاید ایک دو بار ایسا بھی اتفاق ہو چکا ہے لیکن کل رات ————" احمد کریم نے قدرے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔ "اگر وہ برجیس ہی تھی تو پھر مجھے یہ سوچنا پڑے گا کہ نوازش علی اس کے ساتھ بھی کوئی لمبا فراڈ کر رہا ہو گا ———— ہو سکتا ہے کہ اس نے شادی کا لالچ دے کر برجیس کو پھانسنے کی کوشش کی ہو۔"

"کیا آپ اس خیال کی کوئی وضاحت کر سکتے ہیں۔"

"جی ہاں ————" احمد کریم جلدی سے بولا۔ "دراصل جس لڑکی پر میں برجیس شاہنواز کا گمان کر رہا ہوں۔ وہ گزشتہ رات محض شب خوابی کے ایک باریک ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس تھی جبکہ سردی کے مارے میں سوئٹر اور کوٹ میں ہونے کے باوجود ٹھٹھرا جا رہا تھا! ———— آپ کا کیا خیال ہے کہ اس لباس میں نصف رات گئے برجیس نوازش علی کے پاس کس مقصد سے گئی ہو گی۔"

"میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ مجھے کیا باور کرانا چاہتے ہیں لیکن ایک بات بھی تشنہ رہ جاتی ہے۔" انسپکٹر سراج نے احمد کریم کو بغور گھورتے ہوئے کہا پھر قبل اس کے کہ احمد کریم کچھ کہتا وہ جلدی سے بولا۔ "کل رات کس قدر کہر پڑ رہی تھی اور دھند کا عالم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی پڑ رہا تھا۔"

"جی ہاں ——— مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"کیا آپ نے برجیس شاہنواز کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔" انسپکٹر نے تیزی سے سوال کیا۔

"برجیس کو نہیں جناب بلکہ اس لڑکی کو جو محض ایک ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس تھی۔" احمد کریم نے انسپکٹر سراج کے لہجے کی روکھائی محسوس کی تو منہ بنا کر جواب دیا۔

"میں کہر اور دھند ہی کے باعث اس سے بے خیالی میں ٹکرا گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے معذرت طلب کی تھی اور پھر گھر چلا آیا تھا۔"

"اوہ ——— گویا اس سے ٹکرانے اور معذرت طلب کرنے کے باوجود آپ اس کی صورت نہیں دیکھ سکے تھے ———"

"یہ میرا اخلاقی فرض تھا محترم۔" احمد کریم نے ناگوار لہجے میں کہا۔ "ڈریسنگ گاؤن پر بھی میری نظر محض اتفاقیہ پڑ گئی تھی جس کے بعد میں نے جلدی سے اپنا منہ دوسری سمت پھیر لیا تھا۔"

"پھر آپ کو یہ احساس کیوں کر ہوا کہ وہ برجیس ہی ہو سکتی ہے۔"

"اس کے قدو قامت سے ...... اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو یقیناً بھڑک اٹھتی مگر اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ ہو سکتا ہے اس نے مجھے پہچان لیا ہو۔"

"کیا مس برجیس شاہنواز آپ سے واقف ہیں ———" انسپکٹر نے قدرے نرمی سے پوچھا۔

"بہت اچھی طرح ——— میں متعدد بار اس سے اس کے گھر پر مسٹر شاہنواز کی موجودگی میں بھی مل چکا ہوں ———"

"ایک سوال اور ——— کیا آپ نے بحیثیت ایک اچھے واقف کار کے مسٹر شاہنواز سے یہ بات نہیں دریافت کی تھی کہ وہ نوازش علی کے ساتھ برجیس کا رشتہ کیوں کر رہے ہیں جبکہ مقتول اوباش مشہور تھا۔"

"آپ کا اندازہ غلط ہے انسپکٹر۔" احمد کریم نے تیزی سے کہا ——— "مسٹر

شاہنواز سے میرے تعلقات بے تکلفی کی حد تک نہیں تھے جو میں اس قسم کا سوال کرتا۔ ہماری ملاقات زیادہ تر کاروباری نوعیت کی ہوا کرتی تھی۔"

انسپکٹر سراج نے دو چار رسمی سوالات اور کیے پھر وہ واپس تھانے آ گیا۔ جہاں آٹھ نمبر کا کانسٹیبل اس کی ہدایت پر منتظر تھا۔

"گزشتہ رات تمہاری ڈیوٹی موڈرن سوسائٹی کے کس حصے میں تھی۔" انسپکٹر نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

"تیسری سے لے کر گیارہویں گلی تک۔" ڈیوٹی کانسٹیبل نے جلدی سے کہا۔

"کیا تم مسٹر شاہنواز کو جانتے ہو ———؟"

"جی نہیں جناب لیکن ان کی کوٹھی میرے ہی علاقے میں گیارھویں گلی پر واقع ہے۔"

"ہوں ———" انسپکٹر سراج نے کانسٹیبل کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کل رات تم بارہ اور ساڑھے بارہ کے درمیان کس شاہراہ پر گشت کر رہے تھے؟"

"اس وقت میں گیارہویں گلی پر تھا جناب۔"

"کیا تم نے وہاں کسی ایسی لڑکی کو بھی دیکھا تھا جو تنہا تھی ———"

"ج ...... جی ہاں جناب۔" کانسٹیبل نے قدرے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

"ایک لڑکی مجھے نظر آئی تھی جناب لیکن میں نے اسے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ صورت شکل سے بھی وہ مجھے غلط نہیں لگی تھی۔"

"گویا تم نے اسے بہت غور سے دیکھا تھا ——— کیوں ———"

"جی ——— جی ہاں جناب۔" کانسٹیبل ہڑبڑا کر بولا۔ "بات دراصل یہ ہے جناب کہ میرے علاقے میں ......"

"لڑکی کا حلیہ کیسا تھا۔" انسپکٹر سراج نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے سوال کیا۔

جواب میں آٹھ نمبر کے کانسٹیبل نے اس لڑکی کا تفصیلی حلیہ دہرایا جسے اس نے کل رات بہت قریب سے دیکھا تھا۔

"وہ ——— وہ صرف ایک باریک گاؤن میں تھی جناب ———"

"کیا تمہیں دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی اضطرابی کیفیت نمودار نہیں ہوئی تھی۔"

"اس کی نوبت ہی نہیں آ سکی جناب۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔ "وہ میری طرف دیکھے بغیر سر اٹھائے میرے قریب سے گزر گئی تھی۔ ممکن ہے اس نے جان بوجھ کر مجھے نظرانداز کرنے کی کوشش کی ہو۔"

"کیا تم لڑکی کو دوسری بار دیکھنے پر شناخت کر سکتے ہو۔"

"بہت اچھی طرح جناب ——"

ٹھیک ہے —— تم اب جا سکتے ہو ——"

آٹھ نمبر کے کانسٹیبل نے اطمینان کا سانس لیا پھر ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس نے فوجی انداز میں انسپکٹر کو سلیوٹ کیا اور تیزی سے گھوم کر باہر نکل گیا۔

○

خان شاہنواز بار بار اپنے صوفے پر پہلو بدل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر آنے والے تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ اس وقت انسپکٹر سراج کی آمد سے خوش نہیں تھا۔ برجیس کو گزشتہ رات گیارہویں گلی پر دیکھے جانے کا مسئلہ درمیان میں آیا تو وہ پریشان ہو کر بولا۔

"ہو سکتا ہے کہ آپ کا خیال درست ہو انسپکٹر لیکن میں برجیس کو اس سلسلے میں مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ اس لئے کہ وہ سوتے میں اٹھ کر چلنے پھرنے کی عادی ہے —— ممکن ہے کل رات بھی اس پر اسی قسم کا کوئی دورہ پڑا ہو اور وہ خواب بیداری کی حالت میں اٹھ کر باہر چلی گئی ہو —— آپ ڈاکٹر برلاس سے تصدیق کر سکتے ہیں جو برجیس کے معالج ہیں۔"

"میں آپ کی بات پر یقین کئے لیتا ہوں۔" انسپکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا پھر بولا "کیا یہ درست ہے کہ آپ نوازش علی کے ساتھ اپنی صاحبزادی کا رشتہ کرنے کے حق میں تھے۔"

"ہاں —— میں اس کے لئے مجبور تھا۔" خان شاہنواز نے بڑی بے بسی

ی حالت میں اپنا نچلا ہونٹ چباتے ہوئے کہا ——"

"کیا میں اس مجبوری کے بارے میں کچھ دریافت کر سکتا ہوں۔"

میں سمجھ رہا ہوں انسپکٹر کہ آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں۔" ن شاہنواز نے خا لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے معلوم تھا کہ نوازش علی ایک بدقماش اور عیاش طبع آدمی تھا لیکن اس کے باوجود میں اسے اپنا داماد بنانے پر مجبوراً آمادہ ہو گیا تھا —— ڈاکٹر برلاس نے برجیس کی بیماری کو انتہائی خطرناک قرار دیا تھا اور مجھ سے بار بار یہی کہا تھا کہ برجیس کی شادی جتنی جلد ممکن ہو سکے کر دی جائے —— مجھے اس بات کا بھی علم تھا کہ برجیس جو ایک پارٹی میں نوازش علی سے متعارف ہوئی تھی اس میں زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔ میں نے حتی الامکان یہی کوشش کی کہ اس کی شادی عزیزوں اور واقف کاروں میں کہیں طے کر دی جائے لیکن مجھے اپنے ارادے میں سخت مایوسی ہوئی۔ میرے قریبی حلقے کے تمام لوگوں کو برجیس کی بیماری کا علم تھا چنانچہ وہ اس کے ساتھ اپنے لڑکوں کی شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے جس کے بعد مجھے محض اس کی زندگی کو اس موذی مرض سے نجات دلانے کی طر نوازش علی کو قبول کرنا پڑا —— مقتول نے مجھ سے عہد کیا تھا کہ برجیس سے شادی کے بعد وہ اپنی تمام برائیوں کو چھوڑ دے گا —— لیکن! جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ برجیس راتوں کو چھپ چھپ کر اس سے ملنے جایا کرتی ہے تو میں اسے تسلیم نہیں کرونگا —— ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ خواب بیداری کی کیفیت میں ایک دو بار ایسا کر گزری ہو لیکن اس بات کا تعلق اس کے شعور سے نہیں ہو سکتا۔"

"ممکن ہے ——" انسپکٹر نے روکھے لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ بات بہر حال طے ہے کہ وہ گزشتہ رات بارہ اور ساڑھے بارہ بجے کے درمیان مقتول کی رہائش پر موجود تھی۔"

"اگر ایسا ہے انسپکٹر تو پھر میں ہاتھ جوڑ کر تم سے یہی درخواست کرونگا کہ اس اطلاع کو صرف اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا ورنہ میری عزت ک میں مل جائے گی۔" ن شاہنواز نے اپنے آنسوؤں کو آستین میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ "میں

کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہونگا۔"

"میں کوشش کروں گا کہ برجیس کا نام درمیان میں نہ آنے پائے لیکن ـــــــ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ برجیس بھی اس قتل میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شامل رہی ہو۔"

"کچھ بھی ہو انسپکٹر لیکن تمہیں میری عزت کا خیال ملحوظ رکھنا ہو گا۔" خان شاہنواز نے رقت بھری آواز میں کہا۔

"ہوں ـــــــ" انسپکٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا پھر توقف کے بعد پوچھا۔

"کیا آپ نوازش علی کے قتل پر کوئی روشنی ڈال سکتے ہیں۔"

"نہیں ـــــــ میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"کیا آپ کسی ایسی شخصیت سے واقف ہیں جو برجیس کے ساتھ نوازش علی کی شادی کو ناپسند کرتا ہو۔"

"میرے علم میں کوئی ایسی شخصیت بھی نہیں ہے ـــــــ ہاں! ایک بار میرے پڑوسی ابرار حسن خان نے مجھ سے اتنا ضرور کہا تھا کہ اگر میں نے برجیس کی شادی نوازش علی سے کی تو اس کی زندگی برباد ہو کر رہ جائے گی۔ ممکن ہے انہوں نے یہ بات ازراہ محبت کہی ہو اس لئے کہ وہ رخسانہ اور برجیس میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔"

"رخسانہ کون ہے؟" انسپکٹر سراج نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"ابرار حسن کی لڑکی کا نام ہے ـــــــ کیوں؟ ـــــــ کیا آپ اس سے واقف ہیں۔"

"جی نہیں ـــــــ میں نے محض اپنی معلومات کی خاطر دریافت کیا تھا۔" انسپکٹر نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔ "کیا میں آپ کی اجازت سے برجیس کے ساتھ کچھ گفتگو کر سکتا ہوں۔"

"یقیناً" کر سکتے ہو لیکن ـــــــ"

"میں اپنے فرائض کو سمجھتا ہوں محترم ـــــــ" انسپکٹر سراج نے اٹھتے ہوئے کہا۔

چند منٹ بعد وہ برجیس کی خواب گاہ میں اس کے سامنے موجود تھا۔ خان شاہنواز اسے کمرے کے باہر تک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ انسپکٹر سراج نے خاص طور پر اس بات پر

زور دیا تھا کہ وہ تنہائی میں برجیس سے گفتگو کرنا زیادہ پسند کرے گا۔

برجیس، احمد کریم اور آٹھ نمبر کے کانسٹیبل کے بیان کے مطابق حقیقتاً بیحد حسین واقع ہوئی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھکنے والی معصومیت اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ کم از کم وہ قتل کے کیس میں ملوث نہیں سمجھی جا سکتی۔ انسپکٹر سراج بڑی دیر تک اسے مختلف زاویوں سے ٹٹولتا رہا۔ برجیس نے گزشتہ رات کے بارے میں اسے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنی خواب گاہ سے ایک منٹ کے لئے بھی باہر نہیں نکلی تھی۔ اس کی بیماری کے پیش نظر انسپکٹر سراج نے اسے اس سلسلے میں زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ نہ ہی اس نے نوازش علی کے قتل کے سلسلے میں اسے کچھ بتایا تھا۔

"رخسانہ سے آپ کے تعلقات کس قسم کے ہیں؟" اس نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔

"وہ میری اچھی سہیلی ہے۔" برجیس نے برجستہ کہا۔

"کیا اسے بھی اس بات کا علم ہے کہ آپ کی بات نوازش علی کے ساتھ طے ہو چکی ہے۔"

جی ہاں ـــــــ لیکن آپ یہ سوال مجھ سے کس لئے کر رہے ہیں۔" یکلخت برجیس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کا ان باتوں سے کیا تعلق ہے۔"

"گھبرائیے نہیں محترمہ ـــــــ میں آپ کے والد کے پرانے دوستوں میں سے ہوں۔"

"لیکن والد صاحب نے مجھ سے کبھی اپنے کسی ایسے دوست کا ذکر نہیں کیا جس کا تعلق پولیس کے محکمے سے ہو۔" برجیس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اسے انسپکٹر سراج کے بیان پر شبہ ہے۔

"بات دراصل یہ ہے محترمہ کہ ابرار حسن خاں اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ آپ کا رشتہ نوازش علی کے ساتھ ہو۔" انسپکٹر نے بڑی خوبصورتی سے اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"ابرار انکل غالباً" اسے رخسانہ کے لئے پسند کر چکے ہوں گے۔" برجیس نے

غصے سے کہا۔ "مگر رخسانہ کو اب اس بات کا علم ہے کہ میری شادی نوازش علی سے ہو رہی ہے۔ اس لئے اس کے حائل ہونے کا سوال ہی نہیں۔

"کیا رخسانہ بھی نوازش علی سے واقف ہے۔"

"جی ہاں ———— غالباً" اس کا خیال ہے کہ نوازش اس کی فیشن پرستی اور آزاد خیالی پر فریفتہ ہو گیا ہے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین ہے میرے مقابلے میں وہ رخسانہ کو کبھی ترجیح نہیں دے گا۔" برجیس کا چہرہ غصے کی شدت سے تمتما اٹھا۔

"ابرار حسن کے کاروبار کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔" انسپکٹر سراج نے بیحد نرمی سے سوال کیا۔

"مجھے ان کے کاروبار سے کوئی سروکار نہیں ہے لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ انکل اپنی دولت سے نوازش کو مرعوب نہیں کر سکتے ————" برجیس نے بدستور جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"لیکن آپ کو یہ بھی تو سوچنا پڑے گا کہ رخسانہ آپ کی بڑی اچھی سہیلی ہے اور آپ ————" انسپکٹر سراج اتنا کہنے کے بعد اچانک خاموش ہو گیا۔ معاً اس کی نظر لوہے کے ایک ٹھوس اور موٹے سریے پر پڑی جو برجیس کی مسہری کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ لوہے کے اس ٹکڑے کی لمبائی بمشکل ساڑھے تین فٹ رہی ہو گی۔ اس کے سرے پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ جس پر خون کے دھبے موجود تھے۔

انسپکٹر سراج کی نظر مسہری پر بچھی ہوئی چادر کے اڑنے سے اتفاقیہ اس پر پڑ گئی تھی۔ چند ثانئے تک وہ اسے دیکھتا رہا پھر اس نے آگے بڑھ کر اسے مسہری کے نیچے سے نکال لیا۔ اب اس کی نظر برجیس کے چہرے پر مرکوز تھی جو بدستور غصے میں بھری اپنا ہونٹ چبا رہی تھی۔

"برجیس صاحبہ ————" انسپکٹر سراج نے اسے مخاطب کیا۔ "کیا آپ بتائیں گی کہ لوہے کا یہ ٹکڑا آپ نے بستر کے نیچے کیوں چھپایا ہوا تھا۔"

"میں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتی کہ نوازش اور میرے درمیان جو بھی آیا میں اس کا خون کر دوں گی۔" برجیس نے لوہے کے ٹکڑے پر ایک سرسری نظر ڈالتے

ہوئے کہا۔ پھر اس طرح اپنی نظر انسپکٹر کے چہرے پر جما دی جیسے اسے لوہے کے ٹکڑے کو دیکھ کر مطلق کوئی تشویش لاحق نہیں ہوئی تھی۔

انسپکٹر سراج ایک لمحے تک برجیس کے چہرے پر نظر آنے والے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر لوہے کے ٹکڑے کو لئے باہر آ گیا۔ ایک منٹ بعد ہی وہ خان شاہنواز کے سامنے کھڑا اس سے کہہ رہا تھا۔

"میں بیحد وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مقتول کو اسی آلے سے ٹھکانے لگایا گیا ہے۔ یہ ہمارے لئے ایک اہم ثبوت ثابت ہو گا۔"

"میرے خدا" ———— خان شاہنواز کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی۔

انسپکٹر سے لوہے کے متعلق تفصیل جاننے کے بعد وہ دم بخود رہ گیا۔ پھر اس نے بڑی مشکلوں سے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا ———— "تمہارا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ انسپکٹر ———— نوازش علی کے قاتلوں نے میری بچی کو بھی اپنے ناپاک جرم میں ملوث کر لیا۔ اف میرے معبود ...... اب کیا ہو گا۔"

"کیا آپ نے لوہے کے اس ٹکڑے کو اس سے پہلے کبھی اپنے گھر میں یا برجیس کے کمرے میں دیکھا تھا۔"

"نہیں ......" خان شاہنواز نے لوہے کی سلاخ کو خوفزدہ نگاہوں سے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کو میرے ساتھ تھانے تک چلنا ہو گا ————" انسپکٹر سراج نے خشک لہجے میں کہا۔

"تو کیا تم ...... م ...... مجھے ......" خان شاہنواز کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

"ضابطے کی کاروائی میرا فرض ہے جناب۔" انسپکٹر سراج نے خان شاہنواز کے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھتے ہوئے افسرانہ شان سے کہا پھر اسے ساتھ لے کر تھانے چلا گیا۔

بعد کی تفتیش نے خان شاہنواز کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے۔ ماہرین نے لوہے پر بندھے ہوئے کپڑے پر ملنے والے خون کا کیمیائی تجزیہ کرنے کے بعد اپنی

رپورٹ میں لکھا تھا کہ یہ خون مقتول نوازش علی کے خون سے صد فی صد ملتا ہے۔ لوہے کے ٹکڑے پر سے جو فنگر پرنٹس ملے ان میں سے کچھ برجیس کی انگلیوں کے بھی تھے۔ انسپکٹر سراج نے ماہرین کی دونوں رپورٹ کی بنیاد پر برجیس کو گرفتار کرلیا۔ خان شاہنواز نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ برجیس کو گرفتار ہونے سے بچالے لیکن انسپکٹر سراج کے آگے اس کی ایک نہ چل سکی!

برجیس کی گرفتاری کے ایک گھنٹے بعد ہی اسے ابرار حسن خاں کی ایک لاکھ روپے کی شخصی ضمانت پر رہا کردیا گیا۔ انسپکٹر خان نے برجیس کو رہا کرنے سے پیشتر کاغذات کی خانہ پری کرتے وقت ابرار حسن خاں اور شاہنواز کو مشروبات سے نوازنا غالباً" اپنا اخلاقی فرض سمجھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ برجیس کو چھوڑنے کی خاطر تھانے کے صدر دروازے تک آیا۔ پھر جب وہ ان لوگوں کی روانگی کے بعد واپس گھوما تو اس کی پیشانی پر منتشر اور مضطرب سلوٹیں نمایاں تھیں۔

○

دو روز تک انسپکٹر سراج ہمہ وقت نوازش علی کے کیس فائل میں الجھا رہا۔ اس عرصے میں اس نے خفیہ طور پر ان تمام لڑکیوں کے بارے میں معلومات فراہم کرلی تھیں جن کے پتے اسے تفتیش کے دوران ملے تھے اور جنہیں مقتول کے ساتھ جنسی فعل میں ملوث سمجھا جا رہا تھا۔ کچھ لڑکیوں نے اپنا نام پتا بتائے بغیر فون پر مقتول کی عیاشی طبعی کے بارے میں معلومات فراہم کی تھیں۔ انسپکٹر سراج نے جب ان کے فون نمبر معلوم کرنے کی کوشش کی تو اسے اپنے مقصد میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایکسچینج والوں نے ہربار کسی پبلک بوتھ کا حوالہ دیا تھا۔

آج صبح سے بھی اسے اسی قسم کے دو فون موصول ہو چکے تھے۔ انسپکٹر سراج ان فون کالوں کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔ کیس کے دوسرے پہلو بھی اس کے ذہن میں موجود تھے۔ یہ کیس عجیب نوعیت کا تھا۔ اس میں پیچیدگی بڑھنے کا امکان زیادہ تھا۔ کوئی واضح بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ تفتیش کے کون سے نکتے کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ وہ دیر تک کامل سنجیدگی سے اس معاملے

کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے میں منہمک رہا پھر معاً" کسی خیال سے وہ اٹھا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا آفس سے باہر نکل آیا۔ خلاف توقع اس وقت اس نے اپنے ساتھ عملے کے کسی آدمی کو نہیں لیا۔ سر کی خفیف جنبش سے ڈیوٹی پر موجود گارڈ کے سلام کا جواب دیتا ہوا وہ تیزی سے اپنی جیپ کی طرف لپکا۔

رہ منٹ بعد وہ ڈاکٹر برلاس کی رہائش پر اس کے سامنے بیٹھا برجیس کی بیماری کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔

"میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سوتے میں اٹھ کر چلنے پھرنے والے مریض کسی کے قتل کا ارتکاب نہیں کر سکتے .... کم از کم میری نظر سے تو ایسا کوئی کیس نہیں گزرا۔" ڈاکٹر برلاس نے اپنے موٹے فریم کی عینک کو درست کرتے ہوئے کہا۔ "جہاں تک آلہ قتل کا میری مریضہ کی خوابگاہ میں پائے جانے کا تعلق ہے تو میں یہی نتیجہ اخذ کر سکتا ہوں کہ یہ کسی منظم سازش کا نتیجہ ہے۔"

"آپ برجیس کا علاج کب سے کر رہے ہیں؟" ——— انسپکٹر سراج نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ تین ماہ یا شاید اس سے کچھ زیادہ عرصے سے میرے زیر علاج ہے۔"

"کیا آپ کا خیال ہے کہ شادی کے بعد اس کی بیماری ختم ہو جائیگی؟"

"ختم تو نہیں ——— ہاں البتہ کم ضرور ہو جائیگی۔ جس کے بعد علاج کے ذریعے اس پر آسانی سے قابو پایا جا سکتا ہے۔"

"خان شاہنواز سے آپ کے تعلقات کب سے ہیں؟"

"اسی وقت سے جب سے میں برجیس کا علاج کر رہا ہوں ———"

"کیا آپ کے خیال میں انہیں نوازش علی کے قتل کا ذمہ دار سمجھا جا سکتا ہے؟"

"اس ضمن میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" ڈاکٹر برلاس نے کہا۔ "آپ بہتر طور پر حالات کو سمجھ سکتے ہیں۔"

"آپ کی ذاتی رائے کیا ہے۔" انسپکٹر سراج نے دوبارہ اصرار کیا تو ڈاکٹر برلاس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

"اگر آپ صرف میری رائے دریافت کرنا چاہتے ہیں تو میں یہی کہوں گا کہ خان

شاہنواز کو کسی خطرناک جرم کا مرتکب نہیں سمجھا جا سکتا۔"

"ایک بات اور ——— " انسپکٹر سراج نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ مجرم نے جرم کرنے کے بعد آلہ قتل برجیس کو دے دیا ہو اور وہ اسے اپنی خوابگاہ تک لے آئی ہو۔"

"جی ہاں ——— " ڈاکٹر برلاس نے جواب دیا ——— "یہ بات نہ صرف قرین قیاس ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ قاتل نے محض برجیس کو پھنسانے کے لئے جرم کا ارتکاب کرنے کے بعد آلہ قتل اس کے ہاتھ میں تھما دیا جسے وہ اپنی لاشعوری کیفیت میں خواب گاہ تک ساتھ لے آئی ہو گی۔"

"اور اگر محض اسی بنا پر میں برجیس کو قتل گردانے کی کوشش کر گزروں تو آپ کا ردعمل کیا ہو گا۔" انسپکٹر سراج کا لہجہ اس بار کچھ اتنا خشک اور سرد تھا کہ ڈاکٹر برلاس نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک ثانئے تک وہ خالی خالی نظروں سے اسے گھورتا رہا پھر اپنے صوفے پر پہلو بدل کر بولا۔

"جہاں تک میرے ردعمل کا تعلق ہے تو قدرتی طور پر مجھے اپنی مریضہ سے ہمدردی ہو گی ——— ممکن ہے کہ مریضہ کے بارے میں قانون میری تشخیص سے متفق نہ ہو لیکن اگر پولیس سرجن اور دوسرے ماہرین نے بھی میری تشخیص سے اتفاق کیا تو پھر برجیس کو مجرم نہیں گردانا جا سکتا۔"

"میں صرف یہی دریافت کرنا چاہتا تھا ڈاکٹر ——— " انسپکٹر سراج مسکرا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر قبل اس کے کہ ڈاکٹر برلاس مزید کچھ کہتا وہ اسے حیرت میں ڈ چھوڑ کر تیزی سے الٹے قدموں ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔ اب اس کی جیپ موڈرن سوسائٹی کی گیارہویں گلی کی طرف فراٹے بھر رہی تھی ———!

○

بہت دیر سے کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ برجیس کی آنکھیں بند تھیں او وہ چت لیٹی لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ پروفیسر آفریدی اس کے سرہانے کھڑا ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر سراج کی نگاہیں پروفیسر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

پروفیسر کے طویل عمل سے اس کی نظروں میں اکتاہٹ سی ہو چلی تھی۔ اچانک پروفیسر نے انسپکٹر سراج کو گردن کی خفیف جنبش سے اشارہ کیا تو انسپکٹر سراج نے جلدی سے ٹیپ ریکارڈ کا سوئچ آن کیا اور مائیک ہاتھ میں لئے برجیس کے قریب آ گیا۔ (سوال و جواب کی اس طویل گفتگو میں کام کی باتوں کو اس طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے۔)

"برجیس ——— کیا تم میری آواز سن رہی ہو ——— " پروفیسر آفریدی نے ٹھوس مگر ٹھہرے ہوئے لہجے میں برجیس کو مخاطب کیا ——— "

"ہاں ——— میں آپ کی آواز سن رہی ہوں۔"

"تم اس وقت گہری نیند سو رہی ہو ——— بہت گہری نیند۔"

"ہاں ——— " برجیس کے ہونٹوں کو دوبارہ جنبش ہوئی ——— "

"برجیس ——— کیا یہ سچ ہے کہ تم بیرسٹر نوازش علی سے محبت کرتی تھیں ——— " پروفیسر آفریدی نے اس بات کا یقین آ جانے کے بعد کہ برجیس پوری طرح عمل تنویم کے زیر اثر ہے۔ اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ——— مجھے نوازش علی سے بے پناہ محبت تھی مگر آہ ——— اسے ظالموں نے قتل کر دیا۔"

"تمہارے خیال میں وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔"

"مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ کاش مجھے معلوم ہوتا۔"

"آخری بار تم نوازش علی سے کب ملی تھیں۔"

"میں اس سے چار روز قبل اس کے مکان پر ملی تھی۔"

"کیا تم نے اس سے باتیں بھی کی تھیں۔"

"نہیں ——— " برجیس نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ "نوازش علی نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے بھی اسے مخاطب نہیں کیا تھا اور واپس چلی آئی تھی۔"

"کیا وہاں تمہاری ملاقات کسی اور سے بھی ہوئی تھی۔"

برجیس نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا تو پروفیسر کی آنکھیں کسی اندرونی جذبے کے تحت چمک اٹھیں۔ اس نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو برجیس نے کہا۔

"ہاں ———— کوئی تیسرا آدمی بھی وہاں موجود تھا جس نے لوہے کا راڈ میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔"

"کیا تم اس شخص کو جانتی ہو کہ وہ کون ہے۔"

"نہیں اس کے چہرے کو میں نہیں دیکھ سکی!!"

"تم سے کچھ کہا بھی تھا اس نے ————" پروفیسر نے ٹھوس لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں ———— وہ لوہے کا راڈ میرے ہاتھ میں دے کر تیزی سے باہر چلا گیا تھا۔"

"تم نے لوہے کے اس راڈ کا کیا کیا تھا۔"

"میں اسے اپنے ساتھ گھر لے آئی تھی اور اسے اپنی مسہری کے نیچے رکھ دیا تھا۔"

اس موقع پر انسپکٹر سراج نے منہ قریب لے جاکر پروفیسر آفریدی کے کان میں کچھ کہا تھا جس کے بعد پروفیسر نے اثبات میں گردن کو جنبش دی پھر برجیس سے مخاطب ہو کر بولا ————

"برجیس ———— کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ رخسانہ بھی نوازش علی سے محبت کرتی تھی۔"

"شروع شروع میں اسے نوازش علی سے محبت رہی ہو تو دوسری بات ہے لیکن اب وہ اس سے شدید نفرت کرتی تھی۔"

"کیا اس نے اپنی نفرت کا اظہار تم سے بھی کیا تھا۔"

"ہاں ———— اس نے مجھ سے اپنی نفرت کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ اگر نوازش علی میرا منگیتر نہ ہوتا تو شاید وہ اسے قتل کر گزرنے سے بھی دریغ نہ کرتی۔"

"کیا رخسانہ نے تمہیں اس کی کوئی وجہ بھی بتائی تھی۔" پروفیسر نے دوسرا سوال کیا۔

"ہاں ———— اس نے دبی زبان میں کہا تھا کہ نوازش علی انتہائی بدقماش اور آوارہ قسم کا آدمی ہے۔"

"کیا تم نے رخسانہ کی بات کا اعتبار کر لیا تھا۔"

"نہیں ———— میں نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ دوبارہ وہ میرے سامنے نوازش کو برا بھلا نہ کہے۔"

"برجیس ————" اس بار پروفیسر آفریدی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کیا وہ آدمی جس نے نوازش علی کی رہائش پر لوہے کا راڈ تمہیں دیا تھا تمہارے کسی قریبی جاننے والے سے ملتا جلتا تھا۔"

"میں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا۔"

"کیا لوہے کے راڈ پر بندھے ہوئے کپڑے پر تمہیں خون کے دھبے نظر آئے تھے۔"

"مجھے اس کے بارے میں بھی کوئی علم نہیں ہے۔"

"برجیس ———— خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دو۔ کیا انکل ابرار حسن خان اگر چاہیں تو نوازش علی کو قتل کرا سکتے ہیں۔"

"نہیں ———— وہ مجھے رخسانہ کی طرح عزیز سمجھتے ہیں پھر وہ میرے ہونے والے شوہر کو کیوں قتل کرانے لگے ————!! وہ جانتے ہیں کہ میں نوازش علی کی منگیتر ہوں۔ مگر وہ بہت بڑے اور با اثر آدمی ہیں۔ وہ سخت گیر بھی بہت ہیں۔"

انسپکٹر سراج نے اس موقع پر بھی کوئی بات پروفیسر کے کان میں کہی تھی جس کے بعد پروفیسر نے برجیس کو دوبارہ مخاطب کیا۔

"برجیس ———— کیا تم بتا سکتی ہو کہ جو شخص تم سے نوازش علی کی رہائش پر ملا تھا وہ کس قسم کا لباس پہنے ہوئے تھے۔"

"مجھے ٹھیک طور سے یاد نہیں ہے۔"

"کیا وہ جسامت اور قدو قامت کے اعتبار سے تمہارے انکل ابرار حسن خاں سے ملتا جلتا تھا۔"

"نہیں میں نے اسے ٹھیک طرح سے نہیں دیکھا مجھے تو صرف ایک سایہ سا نظر آیا تھا۔"

ٹھیک ہے ————" پروفیسر آفریدی نے انسپکٹر کا اشارہ پا کر کہا۔ "اب تم

آرام سے گہری نیند سو جاؤ ———— تمہیں شدید آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ "

انسپکٹر سراج نے ٹیپ ریکارڈ بند کر کے اسے اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل آیا جہاں خان شاہنواز بڑی بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔

"کیوں انسپکٹر ———— برجیس نے کچھ بتایا۔ " اس نے سراج کو دیکھتے ہی اس کے قریب آکر پوچھا۔

"میں اس وقت جلدی میں ہوں ———— آپ برجیس کو اب گھر لے جا سکتے ہیں لیکن اس بات کا خیال رکھیے گا کہ اس بات کا علم آپ کے سوا کسی اور کو نہیں ہونا چاہئے کہ میں برجیس کو یہاں کس مقصد سے لایا تھا ———— "

"گویا نوازش علی کے قاتل کا سراغ نہیں ملا۔ "

"فی الحال کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی لیکن اگر میرا اندازہ درست ثابت ہوا تو میں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر نوازش علی کے قاتل یا قاتلوں کو ضرور ہتھکڑیاں پہنا دونگا۔ " انسپکٹر سراج نے جلدی سے کہا پھر تیزی سے قدم اٹھاتا پروفیسر آفریدی کے مکان سے باہر آگیا ————!

○

اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے انسپکٹر سراج کو اپنے قائم کردہ نتیجے کے پیش نظر ان افراد کو تلاش کرنے میں خاصی دشواری پیش آئی جو اس کی نظر میں مشتبہ تھے اگر اتوار کے بجائے کوئی کاروباری دن ہوتا تو وہ ان آدمیوں سے بہ آسانی رابطہ پیدا کر سکتا تھا۔ بہر حال تمام دن کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ چار افراد کو گھیر گھار کر تھانے لے آیا تھا۔ اس کے بعد ان چاروں سے علیحدہ علیحدہ پوچھ گچھ کرنے میں اسے مزید تین گھنٹے صرف کرنے پڑے لیکن جب وہ ان چاروں کو اپنے ایک ماتحت کی تحویل میں دے کر باہر آیا تو اس کی آنکھیں پر امید انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

○

تھانے سے باہر آکر اس نے ایک دوسرے ماتحت کو ساتھ لیا اور موڈرن

سوسائٹی کی طرف روانہ ہو گیا ———— پندرہ منٹ بعد وہ ابرار حسن کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں ان کے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"میں خان شاہنواز صاحب کے بعد اب آپ کو یہ خوشخبری سنانے آیا ہوں کہ نوازش علی کے قاتلوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ "

"کیا سچ ———— یقیناً" آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ " ابرار حسن خان نے بڑی گرمجوشی سے جواب دیا۔ "کیا قاتلوں نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا ہے۔ "

"جی ہاں ———— لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بیانات جو انہوں نے تحریری طور پر مجھے دیئے ہیں اس کے کچھ حصے مجھے کاٹنے پڑیں گے۔ "

"وہ کس لئے ————" ابرار حسن نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"قاتلوں نے اپنے بیان میں کچھ ایسی لڑکیوں کے بارے میں بھی بڑی اہم باتیں بتائی ہیں جو اگر ایک بار فائل پر آ گئیں تو پھر انہیں علیحدہ کرنا میرے بس سے باہر ہو گا۔ " انسپکٹر سراج نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔

"کیا آپ ان لڑکیوں سے واقف ہیں۔ " ابرار حسن نے اس بار قدرے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"خوب اچھی طرح سے ————" انسپکٹر سراج نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے کہ آپ بھی ان لڑکیوں کے بارے میں قاتلوں کا بیان پولیس ریکارڈ پر آنا مناسب نہ سمجھیں۔ "

"کیا مطلب ————" ابرار حسن نے تیزی سے کہا۔ "کیا قاتلوں نے برجیس کے بارے میں بھی کوئی بیان دیا ہے ———— "

"آپ غلط سمجھے جناب ———— میرا اشارہ آپ کی صاحبزادی رخسانہ کی طرف تھا۔ "

"کیا ————" ابرار حسن کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لئے فق ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے خود پر قابو پاتے ہوئے غصیلی آواز میں پوچھا ———— "کیا ان حرامزادوں نے رخسانہ کے سلسلے میں بھی کچھ بکواس کی ہے۔ "

"جی ہاں ———— ان کا بیان ہی ہے کہ مقتول کے کچھ ایسے تعلقات آپکی

صاجزادی سے بھی استوار تھے جنہیں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔" انسپکٹر سراج نے ابرار حسن خاں کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا ——۔

"ثبوت کے طور پر انہوں نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر پولیس کو ان کے دیئے ہوئے بیان پر شبہ ہو تو کسی لیڈی ڈاکٹر کے ذریعے اس کی تصدیق بھی کرائی جا سکتی ہے۔"

"لیکن نوازش علی کے قتل کا تعلق بھلا ان بیہودہ باتوں سے کیا ہو سکتا ہے ——" ابرار حسن نے اپنے صوفے پر بڑی بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "میرا مقصد ہے کہ جب قاتلوں نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا ہے تو پھر خواہ مخواہ میری بچی کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ قاتلوں نے کسی خاص وجہ سے رخسانہ کا نام درمیان میں لانے کی ضرورت محسوس کی ہو۔"

"میں سمجھا نہیں کہ اس جملے سے آپ کا کیا مقصد ہے۔" ابرار حسن خان نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے یوں ہی قیاس کی بنا پر ایک بات عرض کی تھی۔" انسپکٹر سراج نے کہا۔ "بہر حال اگر رخسانہ کے بارے میں قاتلوں کا بیان غلط ہے تو آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں —— آں ...... لیکن میں اس کے باوجود اس بات کو پسند نہیں کرونگا کہ رخسانہ کا نام درمیان میں آئے۔"

"کوئی خاص وجہ ——" انسپکٹر سراج نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"یہ میری عزت کا سوال ہے انسپکٹر" ابرار حسن خان نے تیزی سے کہا پھر بولے۔ "اگر آپ رخسانہ کا نام درمیان سے نکال سکیں تو میں آپ کو منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہوں۔"

"بہت خوب ——" انسپکٹر سراج مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا پھر ابرار حسن کو گھورتا ہوا بولا۔ "آپ نے ابھی تک یہ دریافت نہیں کیا کہ نوازش کے قاتل کون لوگ ہیں۔"

"مجھے قاتلوں سے کیا سروکار۔" ابرار حسن نے ہڑبڑا کر جواب دیا۔

"لیکن قاتلوں کو آپ کی ذات سے سروکار ہے ——" انسپکٹر سراج کا لہجہ یکلخت سخت ہو گیا۔ "کیا یہ غلط ہے کہ آپ نے نوازش علی کے قتل کے سلسلے میں کچھ لوگوں کو ایک بڑی رقم دی تھی۔"

"تو کیا —— شہباز نے سب کچھ بتا دیا۔" ابرار حسن کے چہرے کی رنگت ہلدی کی طرح زرد ہو گئی۔ انہوں نے اپنا جملہ گردن جھکا کر بڑی مایوسی کی حالت میں ادا کیا تھا۔

"جی ہاں —— اور اب میں نوازش علی کے قتل کے الزام میں آپ کو بھی گرفتار کرتا ہوں۔" انسپکٹر سراج نے افسرانہ لب و لہجے میں کہا پھر اس نے دروازے پر کھڑے ہوئے اپنے ماتحت کو اشارہ کیا جس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ابرار حسن خاں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

ابرار حسن نے اپنی گرفتاری کے سلسلے میں کسی مزاحمت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

اب جبکہ تم کو سارے واقعات کا علم ہو چکا ہے تو میں اقبال جرم سے انکار نہیں کروں گا۔" ابرار حسن نے اپنا بیان دیتے ہوئے انسپکٹر سراج سے کہا۔ "یہ درست ہے کہ میں نوازش علی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا تھا لیکن جب تک اس نے میری عزت اور ناموس سے کھیلنے کی کوشش نہیں کی میں نے اس سے کوئی سروکار نہیں رکھا مگر جب مجھے اس بات کا علم ہوا کہ اس بدطینت نے رخسانہ کی زندگی برباد کر دی ہے تو میں ضبط نہ کر سکا اور میں نے اپنے فورمین شہباز کو جس کا ماضی کچھ زیادہ اچھا نہ تھا ایک بڑی رقم کا لالچ دے کر نوازش علی کو ٹھکانے لگا دینے پر آمادہ کر لیا —— مجھے یقین تھا کہ ایک معقول رقم حاصل کر لینے کے بعد وہ میرا نام درمیان میں نہیں لائیگا لیکن اس نے بھی نمک حرامی کا ثبوت دیا۔"

"آپ کو جب یہ بات معلوم تھی کہ نوازش علی برجیس سے منسلک ہے تو پھر آپ نے اسے قتل کرا دینے ہی کا خیال کیوں کیا" انسپکٹر سراج نے پوچھا۔ "رخسانہ کے سلسلے میں آپ راز داری بھی برت سکتے تھے۔"

"تم غلط نتیجہ اخذ کر رہے ہو انسپکٹر ——" ابرار حسن نے ہونٹ کاٹتے

ہوئے کہا۔ "میں نے برجیس کو کبھی رخسانہ سے کم نہیں سمجھا۔ اگر بات صرف رخسانہ کی حد تک رہتی تو ممکن ہے میں اپنی عزت کا خیال کر کے خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو جاتا۔ لیکن میں اس بات کو بھی محسوس کر رہا تھا کہ نوازش علی شادی کے بعد برجیس کو بھی غلط راستوں پر ڈال دے گا یا اس کی زندگی بھی جہنم بنا دے گا ـــــــ حالات کے پیش نظر میں خان شاہنواز کو ان حالات سے آگاہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

"کسی حد تک میں آپ کے جذبات سے متفق ہوں لیکن کیا آپ یہ بتائیں گے کہ اس جرم میں آپ نے برجیس کو ملوث کرنے کی کوشش کیوں کی تھی۔" انسپکٹر سراج نے ابرار حسن کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا مشورہ مجھے شہباز نے دیا تھا ـــــــ اس کا خیال تھا پولیس کو غلط راستے پر ڈال کر بڑی آسانی سے بچا جا سکتا ہے رہا برجیس کا معاملہ تو وہ جس بیماری میں مبتلا ہے اس کے پیش نظر دنیا کا کوئی قانون بھی اس پر قتل عمد کا جرم عاید نہیں کر سکتا تھا ـــــــ چنانچہ وہ بھی بچ جاتی۔"

"لوہے کا وہ ٹکڑا جو برجیس کی خواب گاہ سے ملا تھا وہ اسے کس نے دیا تھا۔"

"شہباز نے ـــــــ" ابرار حسن مردہ آواز میں بولا۔

"کیا آپ جائے واردات پر بذات خود موجود نہیں تھے۔"

"نہیں ـــــــ لیکن میں نے نوازش علی کے قتل کے پروگرام کے بعد برجیس پر مستقل نظر رکھی تھی چنانچہ جس رات وہ خواب بیداری کی کیفیت میں گھر سے نکلی تو میں نے طے شدہ پروگرام کے تحت فون پر اس کی اطلاع شہباز کو ضرور دے دی تھی اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کے علم میں ہے۔"

"ایک بات ابھی تشنہ رہ جاتی ہے۔" انسپکٹر سراج نے کہا۔ "اگر نوازش علی کو قتل کرانا ہی مقصود تھا تو محض لوہے کی ایک بھرپور ضرب یا خنجر کا ایک کاری وار بھی کافی ہو سکتا تھا۔ اس کے جسم کو ٹکڑے کرانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ـــــــ ممکن ہے اس میں بھی شہباز کی کوئی چال رہی ہو۔" ابرار حسن نے مضمحل آواز میں جواب دیا پھر ملتجی

ہوں سے انسپکٹر سراج کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "انسپکٹر .... اپنے جرم کا اقرار کر لینے کے بعد ظاہر ہے کہ میں پھانسی کے تختے سے نہیں بچ سکتا لیکن کیا تم مجھے شہباز سے ملنے کا ایک آخری موقع دو گے ـــــــ میں اسے مزید رقم دے کر اس بات پر آمادہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ رخسانہ کا نام درمیان میں نہ لائے ورنہ اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ بولو انسپکٹر .... کیا تم میرے اوپر یہ آخری احسان کر سکو گے۔"

"میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ رخسانہ کا نام درمیان سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔" انسپکٹر سراج نے بڑی سنجیدگی سے کہا پھر بولا۔ "رہا شہباز سے ملاقات کرانے کا مسئلہ تو اس کو گرفتار کر لینے کے بعد میں آپ کی اس درخواست پر بھی ضرور غور کروں گا۔"

"کیا مطلب ـــــــ" ابرار حسن نے پھٹی پھٹی نظروں سے انسپکٹر سراج کو گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نے ابھی تک شہباز کو گرفتار نہیں کیا۔"

"جی نہیں ـــــــ" انسپکٹر سراج نے اپنے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ "برجیس کے بیانات کی روشنی میں میں نے محض ایک امکانی پہلو کے پیش نظر اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا جس کا نتیجہ خاطر خواہ ثابت ہوا ـــــــ ویسے بھی میں رخسانہ کے علاوہ ان تمام لڑکیوں کے بارے میں فرداً فرداً چھان بین کر چکا تھا جن کے بارے میں مجھے اس بات کا مختلف ذرائع سے پتا چلا تھا کہ وہ مقتول کے ساتھ کسی نہ کسی زاویے سے جنسی تعلقات میں ملوث رہ چکی ہیں لیکن ان لڑکیوں میں سے مجھے کوئی بھی ایسی نظر نہ آئی ـــــــ جو نوازش علی کی موت کی ذمہ دار ٹھہرائی جا سکتی چنانچہ میں نے رخسانہ کو سامنے رکھ کر حالات پر غور کرنا شروع کیا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بحیثیت ٹھیکیدار کے آپ کے پاس بے شمار آدمی ملازم ہیں جن کے ذریعے نوازش علی کو بہ آسانی ٹھکانے لگوایا جا سکتا تھا۔ اسی خیال کے پیش نظر میں نے آپ کے کچھ آدمیوں کو زیر حراست لے کر ان پر سختی شروع کر دی۔ جن افراد کو میں نے اپنی حراست میں لیا تھا وہ اصل قاتل کی نشاندہی تو نہ کر سکے لیکن انہوں نے شہباز پر شبہ کا اظہار ضرور کیا تھا اس لئے کہ وہ غالباً اس کے ماضی سے باخبر تھے ـــــــ پوچھ گچھ کے دوران آپ ہی کے ایک آدمی نے مجھے رخسانہ

اور نوازش علی کے تعلقات کے بارے میں بھی ڈرتے ڈرتے بتا دیا تھا ——— اس کے بعد ہی میں ایک طے شدہ پروگرام کے تحت آپ سے ملا تھا اور مجھے خوشی ہے کہ اپنے مشن میں مجھے ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا۔"

ابرار حسن خاں حیرت بھری نظروں سے انسپکٹر سراج کا منہ تکے جا رہے تھے پھر جب انسپکٹر سراج نے اپنا جملہ ختم کیا تو انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنی نظریں جھکا لیں ———!!

○

شکستہ قبر کا مسیحا

طیارے کے رکتے ہی میرا دل چاہا کہ کھڑکی توڑ کر چھلانگ لگا دوں اور بھاگتا ہوا گھر میں پہنچ جاؤں۔

جس افراتفری کی حالت میں میں لندن کی رنگینیوں کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوا تھا وہ کچھ ایسی ہی تھیں کہ ایک ایک لمحہ میرے لئے بڑا کٹھن ثابت ہو رہا تھا۔ کسی طرح میں جلد از جلد گھر پہنچ کر اپنی چھوٹی بہن عائشہ کو دیکھنے کے لئے بے چین تھا۔ اس کی بیماری کے تار نے مجھے لندن سے فوری طور پر گھر واپس ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرے والدین نے تار میں یہی تحریر کیا تھا کہ اگر عائشہ کا آخری دیدار کرنا چاہتے ہو تو پہلے جہاز سے روانہ ہو جاؤ۔

طیارے سے اترتے وقت جب حسین و جمیل ایر ہوسٹس نے ایک دلنواز مسکراہٹ اپنے یاقوتی ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے مجھے خدا حافظ کہا تو میں نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی پھر سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے آگیا۔ ممکن ہے ایر ہوسٹس نے میری اس سرد مہری کو محسوس بھی کیا ہو لیکن مجھے اس کی مطلق کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میرا ذہن صرف عائشہ میں الجھا ہوا تھا ورنہ عام حالات میں اگر اسی ایر ہوسٹس نے مجھے ذرا بھی لفٹ دی ہوتی تو میں کم از کم کسی دوسری امکانی ملاقات کے خیال سے اس کا پتا ضرور دریافت کر لیتا اور اس کی مسکراہٹ کا جواب اس تپاک سے دیتا کہ وہ مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکتی۔ اپنے اسی تپاک سے میں نے لندن میں مس ریٹا کو اپنا مداح بنا لیا تھا ورنہ وہ چڑچڑی سی لڑکی جسے اپنے لوچ دار جسم اور خوبصورتی پر بے حد ناز تھا کبھی کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتی تھی۔ اس کے پرانے جاننے والے بھی اس سے شاکی تھے لیکن ریٹا میری خوش اخلاقی کے آگے بہت جلدی موم کی طرح

پگھل کر رہ گئی تھی ریٹا کے طلب گار مجھ سے جلنے لگے تھے شاید اس لئے کہ میں بدیسی تھا یا پھر اس لئے کہ ریٹا ان کے مقابلے میں مجھ سے بہت زیادہ قریب ہو گئی۔

لیکن ——— اس وقت نہ میرے ذہن میں طیارے کی میزبان اور خوبصورت ایر ہوسٹس کا خیال تھا جس نے بڑی دلنواز مسکراہٹ سے مجھے خدا حافظ کہا تھا اور نہ مجھے ریٹا کا خیال تھا جس نے لندن سے روانگی کے وقت میرے بے شمار رقیبوں کی موجودگی میں میری گردن میں اپنی مرمریں بانہیں ڈال کر بڑی مسرت سے کہا تھا ——— "جلدی واپس لوٹ آنا مائی ڈیر ساجد ...... میں بڑی شدت سے تمہاری راہ دیکھوں گی" ——— اگر مجھے عائشہ کی بیماری کا تار نہ ملا ہوتا تو شاید میں اپنے رقیبوں کو جلانے کی خاطر ایک گرم گرم الوداعی بوسہ ریٹا کے شیریں لبوں پر ضرور ثبت کر دیتا لیکن عائشہ کی بیماری نے مجھے اس قدر پریشان کر دیا تھا کہ میں ریٹا سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

کسٹم کرانے کے بعد میں اپنا سوٹ کیس اور ایر بیگ لئے جلدی جلدی ایر پورٹ کی عمارت سے باہر نکلا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس سمت بڑھنے لگا جدھر ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ سڑک عبور کرتے وقت جب ایک طیارہ کمپنی کی بس نے میرا راستہ روکا تو غصے کے مارے میرا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن مجبوراً" مجھے رک جانا پڑا۔ بس گزرنے کے بعد میں نے دوبارہ آگے بڑھنے کے لئے پہلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ ایک مانوس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ پلٹ کر دیکھا تو میرا عزیز دوست شکیل ایک مختصر سی اٹیچی لئے تیز تیز میری طرف آ رہا تھا۔ ہر چند کہ شکیل میرا بہترین اور انتہائی بے تکلف دوست تھا اور ہم دونوں نے ایک زمانے میں لاہور میں تعلیم بھی ایک ساتھ ہی حاصل کی تھی اور ایک ہی ہوسٹل میں چار سال ایک جان دو قالب بنے رہے تھے۔ ہماری دوستی مثالی سمجھی جاتی تھی دوسرے لڑکے ہمیں رشک کی نظروں سے دیکھتے تھے لیکن نہ جانے کیوں اس وقت مجھے شکیل کی مداخلت بھی ناگوار گزری۔ میں مجبوراً" رک گیا اور سوچنے لگا " کاش میں اس کی آواز پر دھیان دیئے بغیر آگے بڑھ گیا ہوتا۔" میں آج ہی لاہور سے آیا ہوں۔" شکیل نے میرے قریب آ کر بڑی بے تکلفی سے کہا۔ "طیارے سے اترتے ہی مجھے ایک دوست نے بتایا کہ تم لندن سے واپس آ رہے ہو چنانچہ میں رک

گیا تاکہ تم سے بھی ملاقات ہو جائے ——— اور سناؤ ...... کچھ لندن کی رنگینیوں کے بارے میں ...... سنا ہے وہاں کی لڑکیاں ———"

"عائشہ کی حالت بہت نازک ہے میرے دوست" میں نے جلدی سے کہا۔ "والد صاحب نے مجھے تار دیا تھا کہ اگر آخری دیدار کرنا ہو تو پہلے طیارے سے آ جاؤ چنانچہ میں ———"

"عائشہ تمہاری بہن کا نام ہے نا" شکیل نے میرا جملہ درمیان سے اچکتے ہوئے پوچھا پھر قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا اس نے دوسرا سوال بھی کر ڈالا۔ "کیا طبیعت خراب ہے عائشہ کی۔"

"ٹی بی کا تھرڈ اسٹیج" میری آنکھیں بھر آئیں۔

"گھبراؤ نہیں ——— خدا نے چاہا تو وہ ٹھیک ہو جائیگی۔"

شکیل نے بڑے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ اس خیال سے کہ کہیں وہ اپنی باتونی طبیعت کے باعث میرا مزید وقت ضائع نہ کر سکے میں نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو اشارے سے روکا مگر قبل اس کے کہ میں اس سے رخصتی مصافحہ کر کے گلو خلاصی حاصل کرتا وہ اپنی اٹیچی ٹیکسی میں رکھ کر بیٹھ گیا ڈرائیور نے نیچے اتر کر میرا سامان ڈکی میں رکھا تو میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر شکیل کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

میرا خیال کسی ہوٹل میں قیام کرنے کا تھا لیکن اب سوچتا ہوں کہ تمہیں پریشانی میں چھوڑ کر الگ رہنا ٹھیک نہیں ہے" شکیل نے کہا۔ "مجھے اپنے ساتھ ٹھہرانے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہو گا۔"

"مطلق نہیں ———" میں نے جلدی سے جواب دیا۔

میرا خیال تھا کہ شکیل راستے بھر اپنی اوٹ پٹانگ باتوں سے مجھے بور کرے گا لیکن وہ زیادہ تر خاموش بیٹھا رہا دو چار باتیں جو ہوئیں تو صرف عائشہ کے بارے میں اگر کوئی اور موقع ہوتا تو یقیناً" مجھے اپنے اس باتونی دوست کی خاموشی گراں گزرتی اور میں کرید کرید کر اس کی خاموشی کا سبب ضرور دریافت کرتا لیکن اس وقت مجھے اس کی خاموشی سے بے حد سکون مل رہا تھا شاید اس لئے کہ میں عائشہ کے سوا کسی اور کے بارے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے شکیل کو ملازم کے حوالے کر کے اسے مہمان خانے میں ٹھہرانے کو کہا اور خود دھڑکتے ہوئے دل سے اندر گیا جہاں میری بوڑھی ماں عائشہ کے سرہانے بیٹھی اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی میں نے چونکہ اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی اس لئے کسی کو میری آمد کا علم نہیں تھا۔

عائشہ پر نظر پڑتے ہی میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ جس موذی مرض میں وہ مبتلا تھی اس نے اسے سکھا کر کانٹا بنا دیا تھا وہ اس قدر دبلی اور زرد ہو گئی تھی کہ خون کے رشتے نے اگر میرے جذبات میں ایک ہلچل نہ مچا دی ہوتی تو شاید میں اسے پہچاننے سے بھی انکار کر دیتا۔ چار سال پہلے وہ بڑی تندرست و توانا تھی لیکن اب محض ہڈیوں کا ایک ڈھانچا نظر آتی تھی جس پر برائے نام گوشت موجود تھا۔ عائشہ کو اس کیفیت سے دو چار دیکھ کر میرا دل بے اختیار بھر آیا۔ جب میری ماں نے میری سسکیوں کی آواز سنی تو اٹھ کر مجھے سینے سے لگا لیا اور خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں ——— دو گھنٹے بعد جب والد صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹروں نے عائشہ کی طرف سے جواب دے دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ بس چند روز کی مہمان ہے۔ اپنی اکلوتی اور چہیتی بہن کے بارے میں جب مجھے ڈاکٹروں کی رائے معلوم ہوئی تو میں بے اختیار رو پڑا۔ والد صاحب نے مجھے بہتری تسلیاں دیں لیکن میرے لئے سب بے سود تھیں۔

مجھے لندن سے آئے تین روز گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں میرا بیشتر وقت عائشہ کے پاس گزرتا شکیل کو میں مطلق فراموش کر بیٹھا تھا۔ والد صاحب سے میں نے شکیل کا مختصر تعارف کرا دیا تھا لیکن وہ محض ایک سرسری اور رسمی سی ملاقات تھی والد صاحب کو بھی عائشہ سے از حد محبت تھی اس لئے وہ بھی بے حد پریشان تھے۔ انہوں نے بھی شکیل پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور عائشہ کی دوا لینے کی غرض سے باہر نکلا تو شکیل پر نظر پڑی جو احاطے میں لان پر ایک درخت کے نیچے بیٹھا اپنی کسی سوچ میں غرق تھا۔ ایک ثانیے کے لئے مجھے شرمندگی کا احساس ہوا کہ میں اپنے عزیز دوست کو تین روز سے بالکل نظر انداز کئے ہوئے ہوں لیکن پھر عائشہ کی بیماری کے خیال نے اس احساس کو دبا دیا۔ میں پورٹیکو میں کھڑی کار کی طرف بڑھا تو اچانک

شکیل کی نظر مجھ پر پڑ گئی اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ لپکتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

"کہاں جا رہے ہو۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا پھر جب میں نے اسے بتایا کہ عائشہ کی دوا لینے بازار جا رہا ہوں تو وہ میری اجازت طلب کئے بغیر ہی اگلی نشست پر میرے برابر بیٹھ گیا کچھ دور تک ہم دونوں اپنے اپنے خیالوں میں غرق رہے پھر شکیل نے مجھ سے پوچھا۔

"عائشہ کے بارے میں ڈاکٹروں کا کیا خیال ہے؟"

"وہ جواب دے چکے ہیں" میں نے مردہ سی آواز میں جواب دیا اور ان آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرنے لگا جو میری پلکوں کی اوٹ میں مچل رہے تھے۔

"تمہارے والد نے کسی بزرگ کو بھی دکھایا ہے یا نہیں۔"

"نہیں ——— کیوں" مجھے شکیل کا یہ مشورہ کچھ عجیب سا لگا شاید اس لئے کہ میں تعویز گنڈوں کا سرے سے قائل نہ تھا۔

"میری مانو تو عائشہ کو کسی بزرگ کو دکھا دو" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا میں خاموش رہا تو وہ دوبارہ بولا۔ "میں کسی بزرگ سے واقف نہیں ہوں ورنہ تم سے کبھی نہ کہتا البتہ یہاں پرانے قبرستان میں ایک ایسی قبر موجود ہے۔ جہاں حاضری دینے سے عائشہ کی بیماری دور ہو سکتی ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا ———" میں یونہی پوچھ بیٹھا۔

"تین روز سے میں برابر شہر میں کسی بزرگ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ آج صبح اتفاقیہ طور پر قبرستان کی طرف چلا گیا جہاں وہ بوسیدہ قبر موجود ہے۔"

"لیکن تمہیں یہ کیوں کر پتا چلا کہ اس قبر پر حاضری دینے سے عائشہ کی بیماری دور ہو سکتی ہے" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم میری باتوں پر یقین نہ کرو گے" شکیل نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"کیا کوئی ایسی خاص بات ہے جو میرے لئے نا قابل یقین ثابت ہو گی ——— یا پھر تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔"

جواب میں شکیل نے مجھے گھور کر دیکھا پھر ایک سرد آہ بھر کر بولا۔

"مجھے خود بھی ان باتوں پر شبہ ہو رہا ہے لیکن نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس قبر پر حاضری دینے سے عائشہ ضرور صحت مند ہو جائے گی ——— اس قبر سے یہی آواز آئی تھی۔"

"قبر سے آواز آئی تھی" میں نے حیرت سے کہا پھر قدرے ناگوار انداز میں بولا۔ "کیا تم میرا مذاق اڑانے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو۔"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ حرف بحرف حقیقت پر مبنی ہے" شکیل نے جلدی سے کہا۔ "اس بوسیدہ قبر کے قریب سے گزرتے وقت میں نے آواز بہت صاف طور پر سنی تھی۔ پہلے مجھے شبہ ہوا تھا کہ ممکن ہے وہ میرا وہم ہو لیکن جب دوسری بار وہی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں رک گیا۔ میں نے گھوم پھر کر چاروں طرف دیکھا لیکن خدا گواہ ہے کہ وہاں کسی اور شخصیت کا دور دور تک کوئی وجود نہیں تھا۔ قرب و جوار میں کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی کہ میں یہ سوچ سکتا کہ کوئی مسخرہ کہیں چھپا بیٹھا مجھے پریشان کرنے کی کوشش کر رہا ہے چنانچہ میں بڑی توجہ سے اس منہدم اور بوسیدہ قبر کو گھورنے لگا اس لئے کہ میرے اندازے کے مطابق وہ آواز اسی قبر سے آئی تھی ——— ایک لمحے کے لئے میں کسی بدروح کے تصور سے گھبرا گیا پھر وہاں سے واپسی کے ارادے سے مڑا ہی تھا کہ وہ پر اسرار آواز تیسری بار میرے کانوں سے ٹکرائی ———" شکیل نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھا پھر بولا۔

"جانتے ہو اس آواز نے مجھ سے کیا کہا تھا۔"

"اگر میں نے وہ آواز سنی ہوتی تو تم سے کیوں پوچھتا" میں نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

"اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر مریضہ کو اس کی قبر پر لے آؤں تو وہ روبصحت ہو جائے گی۔"

میں نے ایک بار پھر گھور کر شکیل کو دیکھا لیکن مجھے اس کے چہرے پر کوئی علامت ایسی نظر نہ آئی کہ میں یہ سوچ سکتا کہ وہ محض اپنی باتونی اور کھلنڈری طبیعت کی بنا پر مجھے کوئی پر اسرار من گھڑت کہانی سنا کر حیرت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے ——— اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی مسلط تھی۔ میں ایک لمحے کے لئے سوچ

میں پڑ گیا کہ ان باتوں کا کیا جواب دوں۔

"مجھے یقین تھا کہ تم میری بات پر اعتبار نہیں کرو گے" شکیل نے اپنا سلسلہ کلام دوبارہ جاری کرتے ہوئے کہا۔ "خود مجھے بھی اس آواز کو سن کر حیرت ہی ہوئی تھی لیکن بعد میں، میں نے اس قبر کے بارے میں جو معلومات حاصل کیں وہ نہ صرف یہ کہ حیرت انگیز تھیں بلکہ مجھے یقین سا آگیا کہ عائشہ کی بیماری اس قبر پر حاضری دینے سے دور ہو سکتی ہے۔"

"قبر کے بارے میں تم نے معلومات کس طرح حاصل کر لی تھیں" میں نے اس بار دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"قبرستان کے گورکن سے۔" شکیل نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "گورکن کا بیان ہے کہ اس قبر میں دو سال پہلے ایک اٹھائیس انتیس سالہ نوجوان کو دفنایا گیا تھا میت کے ساتھ چار چھ آدمی تھے۔ انہیں کی باتوں سے گورکن کو پتلا چلا تھا کہ وہ لاش کسی لاوارث کی ہے جس نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر خود کشی کر لی تھی ——— جس روز وہ لاش دفنائی گئی اس روز کے بعد سے کبھی کوئی آدمی وہاں نہیں آیا تھا اور"

"اور کیا ———" شکیل کے خاموش ہو جانے سے میرا تجسس بھڑک اٹھا۔

"گورکن کا کہنا ہے کہ اس نے اکثر اس قبر کے پاس رات کے گھپ اندھیروں میں ایک انسانی ہیولے کو بڑی بے چینی کی حالت میں چہل قدمی کرتے دیکھا ہے ...... شروع شروع میں وہ اسے اپنا وہم سمجھتا رہا پھر ایک رات جب اس نے قریب سے اسے دیکھا تو اسے یقین کر لینا پڑا کہ وہ کوئی روح ہے جو ابھی تک دنیا میں بھٹک رہی ہے ——— گورکن کا بیان ہے کہ وہ اٹھارہ سال سے اس قبرستان میں اپنے فرائض منصبی انجام دے رہا ہے لیکن اس کی زندگی میں پہلا واقعہ تھا جب اس نے کسی مردے کو اپنی قبر سے باہر نکل کر یوں ٹہلتے دیکھا تھا اس واقعے سے وہ اس قدر خائف ہو گیا کہ اس روز سے وہ کبھی دن کے اوقات میں بھی اس قبر کے قریب سے ہو کر نہیں گزرا۔"

"اور اب تمہارا مشورہ ہے کہ میں عائشہ کو اس کی قبر پر لے جاؤں۔"

"اس آواز نے مجھ سے یہی کہا تھا ——— بظاہر اس میں کوئی حرج نہیں

ہے۔"

"ہوں ———— میں والد صاحب سے مشورہ کروں گا۔" میں نے شکیل کو ٹالنے کی خاطر کہا۔

اس بات کو ایک ہفتہ گزر گیا عائشہ کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ گھر کے تمام افراد ہمہ وقت اس کے قریب بیٹھے اس کی حالت زار پر آنسو بہاتے رہتے یا پھر اس کی صحت کے لئے دعا مانگا کرتے تھے۔ آٹھویں روز عائشہ کی حالت اس قدر خراب ہو گئی کہ گھر کے سارے لوگ پریشان ہو گئے۔ ذاتی طور پر میرا یہی خیال تھا کہ میری بہن اس دنیا میں اب کوئی دم کی مہمان ہے اس کی سانس اب بڑی مدھم رفتار سے چل رہی تھی میں نے نبض پر ہاتھ رکھا تو دوران خون کی کوئی حرکت محسوس نہ کر سکا بس عائشہ کی اکھڑی اکھڑی سانسیں تھیں جو کسی لمحے بھی معدوم ہو سکتی تھیں میری والدہ جوان بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر روتے روتے بیہوش ہو گئیں۔ میرے ضعیف والد کی حسرت بھری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی اور میں حیران پریشان سکتے کے عالم میں کھڑا اپنی پیاری بہن کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا کہ معاً" مجھے شکیل کا دیا ہوا مشورہ یاد آ گیا۔ کوئی غیر مرئی طاقت مجھے بار بار اکسا رہی تھی کہ میں عائشہ کو اسی وقت اٹھا کر قبرستان لے جاؤں۔ کچھ دیر بعد میں نے ہمت کر کے جب اپنے والد سے کہا اور شکیل سے سنی ہوئی باتیں دہرائیں تو انہوں نے پہلے انکار کر دیا لیکن میرے پیہم اصرار پر اجازت دے دی۔ چنانچہ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے آگے بڑھ کر عائشہ کے کمزور اور پھول کی طرح ہلکے پھلکے جسم کو ہاتھوں پر اٹھایا اور باہر لا کر کار کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ والد صاحب عائشہ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ میں نے شکیل کو جگا کر قبرستان چلنے کو کہا تو وہ فورا" رضا مند ہو گیا۔

اس وقت رات کے کوئی دو بجے کا عمل تھا۔ قبرستان میں ہر سمت گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا ہوا کے تیز و تند جھکڑوں سے خشک جھاڑیاں اور زمین پر بکھرے ہوئے خشک پتے کھڑکتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے ہزار ہا روحیں بھیانک انداز میں قہقہہ لگا رہی ہوں۔ عام حالات میں اگر کوئی مجھے اس طوفانی رات میں قبرستان لانے کی کوشش کرتا تو ممکن تھا میں بڑی سختی سے انکار کر دیتا لیکن اس وقت عائشہ کی زندگی کے سوال نے

میرے احساسات کو جیسے مردہ کر دیا تھا۔

کار کو قبرستان کے درمیان روک کر میں پہلے شکیل کے ساتھ نیچے اترا اور جا کر اس قبر کو دیکھ آیا پھر واپس آ کر میں نے عائشہ کو گود میں اٹھایا اور اپنے باپ کے ہمراہ اسی بوسیدہ قبر کی طرف چل دیا جس کی نشاندہی شکیل نے کی تھی ———— شکیل چونکہ نامحرم تھا اس لئے میں نے اسے ساتھ لینا مناسب نہیں سمجھا اور گاڑی کے پاس چھوڑ آیا۔

بوسیدہ قبر کے قریب جا کر میں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا عائشہ بدستور میری گود میں پڑی ہوئی تھی۔ میرے بوڑھے والد چپ چاپ میرے قریب کھڑے تھے۔ میں عائشہ کو لانے کو تو قبر تک لے آیا تھا لیکن اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اس وقت خود مجھے اپنے آپ پر ہنسی آ رہی تھی۔ میں خود کو ملامت کرنے لگا۔ عائشہ کی بیماری نے اگر میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو مفقود نہ کر دیا ہوتا تو میں اس غریب کو نزع کے اس وقت آرام دینے کے بجائے یوں ہاتھوں پر اٹھائے اٹھائے کبھی نہ پھرتا۔ اتنی رات گئے کسی مریض کو قبرستان لانے ویسے بھی دانشمندی کے خلاف تھا اور پھر میں جس قبر کے نزدیک بیٹھا تھا وہ تو کسی مجذوب کی تھی اور نہ ہی کسی پہنچے ہوئے بزرگ کی بلکہ ایک ایسے شخص کی قبر تھی جس نے خودکشی کی تھی۔ کم از کم شکیل نے مجھے یہی بتایا تھا۔

"اچانک میں نے اندھیرے میں اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے اتنی زور سے بھینچا کہ خون یقینی طور پر جم کر رہ گیا ہو گا۔ مجھے اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ جو شخص بذات خود زندگی سے فرار حاصل کرنے کے لئے حرام موت مرا ہو وہ بھلا دوسروں کی زندگی کیونکر دے سکتا ہے؟" ———— اس خیال کے ذہن میں ابھرتے ہی میں اپنا ہونٹ چباتا اور دل ہی دل میں خود کو نفرین کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے شکیل پر بھی سخت تاؤ آ رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر خدانخواستہ اس وقت عائشہ کو کچھ ہوا تو میں شکیل کو کبھی معاف نہ کروں گا جس نے مجھے پریشانی میں بھی نہیں بخشا تھا اور غالبا" اپنی افتاد طبع سے مجبور ہو کر ایک بیہودہ اور انتہائی گھٹیا قسم کے مذاق کا نشانہ بنا ڈالا تھا۔

"کیا ہو گیا عائشہ کا علاج" میرے والد نے کھڑا ہوتا دیکھ کر کچھ ایسے انداز میں یہ سوال کیا کہ میں شرم اور ندامت کے احساس سے پانی پانی ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ اسی وقت شکیل کا گلا گھونٹ کر اسے یہیں قبرستان میں بے یارو مددگار چھوڑ دوں تا کہ اگر دوبارہ کسی کو اپنے گھناؤنے مذاق کی خاطر مشق ستم نہ بنا سکے لیکن اس وقت چونکہ میری بیمار بہن میری گود میں تھی اس لئے میں اپنے خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکا نہ ہی باپ کی بات کا کوئی جواب دیا۔ خون کے گھونٹ پیتا واپسی کے ارادے سے مڑا ہی تھا کہ نا جانے خوشبو کا ایک معطر جھونکا کہاں سے آ کر میرے گرد منڈلانے لگا۔ میں نے ذہن کی بکھری ہوئی قوتوں کو جمع کر کے اس جھونکے کے بارے میں غور کیا تو لرز اٹھا۔ وہ کافور اور گلاب کی ملی جلی خوشبو تھی بالکل ویسی ہی جیسی کفن سے پھوٹتی ہے میں نے چاہا اس خوشبو سے نجات پانے کے لئے بھاگ کھڑا ہوں لیکن قبل اس کے کہ میں اپنے ارادے پر عمل کرتا عائشہ نے جس کے منہ سے نہ معلوم کتنے عرصے سے ایک لفظ بھی نہ نکلا تھا ایک ڈر کی چیخ ماری۔ اگر میں نے اپنے ہوش و حواس پر قابو پا کر اسے سنبھال نہ لیا ہوتا تو وہ یقیناً" تڑپ کر میری گود سے نکل گئی ہوتی۔

"ساجد ——— کیا ہوا بیٹے" میرے والد گھبرا کر میری طرف لپکے پھر عائشہ کی نبض دیکھنے لگے اس کے بعد قدرے سخت لہجے میں بولے ——— "میں نے تمہیں اس حماقت سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی ——— چلو ...... اب گھر واپس چلو۔"

والد صاحب کی ناراضگی کے احساس نے مجھے اور زیادہ طیش دلایا۔ یہ سب کچھ شکیل کی بدولت ہوا تھا میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا کار کی طرف آ گیا۔ عائشہ کو پچھلی نشست پر والد کے سہارے آہستہ سے لٹا کر جب میں اگلی نشست پر آیا تو دیکھ کر میری جان ہی تو جل گئی کہ شکیل جس نے مجھے اتنی رات گئے پریشان کیا تھا بڑے اطمینان سے لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے اسے غصے کے عالم میں جھنجھوڑ کر جگایا تو اس نے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے پوچھا "کیا ہوا ———"

میرا دل تو چاہا تھا کہ اس سوال کے جواب میں لپک کر اس کا ٹینٹوا دبا دوں اور اس کی لاش کو گھسیٹتا ہوا لے جا کر اسی بوسیدہ قبر پر پھینک آؤں جس کی نشاندہی اس

نے کی تھی لیکن والد صاحب کی موجودگی میں ایسا نہ کر سکا۔ اس کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر میں نے اندر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر کی سمت فراٹے بھرنے لگا۔ راستے میں کئی بار شکیل نے مجھے مخاطب کرنا چاہا مگر میں نے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

گھر پہنچ کر بھی میں نے اسی سرد مہری کا مظاہرہ کیا اور اسے نظرانداز کر کے عائشہ کو لئے اندر آ گیا۔ میری والدہ ابھی تک بیہوش تھیں اور وہ نرس جو عائشہ کے لئے رکھی گئی تھی اس وقت میری ماں کو سنبھالے ہوئی تھی۔ عائشہ کو اس کے بستر پر آہستہ سے لٹا کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اس کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ والد صاحب عائشہ کے برابر بیٹھ کر اس کی نبض دیکھنے لگے میں سہما ہوا بیٹھا تھا کہ اگر خدا نخواستہ عائشہ کو کچھ ہو گیا تو والد صاحب یقیناً" اس کی موت کا ذمہ دار مجھے ٹھہرائیں گے۔ بہت دیر تک میں انہی پریشان پریشان خیالات میں الجھا بیٹھا رہا پھر جانے کب نیند کا غلبہ میرے ذہن پر طاری ہوا کہ میری آنکھ لگ گئی۔

دوسری صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں عائشہ کے کمرے کے بجائے اپنے کمرے میں اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ ملازم سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ صبح ہوتے وقت ازخود اپنے پیروں سے چل کر اپنے کمرے تک آیا تھا۔ ملازم کی زبانی یہ بات سن کر مجھے سخت حیرت ہوئی اور ساتھ ہی اس بات پر ندامت بھی کہ والد صاحب اپنے دل میں کیا سوچتے ہوں گے۔ جلدی سے اٹھ کر میں اپنے کمرے سے باہر نکلا تو برانڈے میں والد سے مڈبھیڑ ہو گئی جو میری ہی طرف آ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی سرخی اور پلکوں پر لرزتے آنسوؤں کو دیکھ کر میں کانپ اٹھا اور پلکیں جھپکائے بغیر انہیں دیکھتا رہا "ساجد بیٹے ———" والد میرے قریب آ کر کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔ "جلدی چلو ...... عائشہ تمہیں یاد کر رہی ہے۔"

فوری طور پر میرے ذہن میں جو خیال آیا وہ یہی تھا شاید میری بہن کا آخری وقت قریب آ پہنچا ہے۔ میں بھاگتا ہوا عائشہ کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ آنکھیں کھولے لیٹی ہے اور میری ماں اس کے قریب بیٹھی اس کی پیشانی کو آہستہ آہستہ دبا رہی ہے۔ قریب جا کر جب میں نے عائشہ کے چہرے کو غور سے دیکھا تو

میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کے چہرے پر مجھے آج پہلی بار زندگی کی شفق پھوٹتی نظر آئی تھی۔ میں نے نبض دیکھی تو اس کی رفتار بھی ٹھیک تھی۔

"بھیا ــــــــــ"

عائشہ کے ہونٹوں سے اتنے عرصے بعد "بھیا" کا لفظ سن کر میں بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ والد صاحب نے ٹیلیفون کر کے ڈاکٹر اخلاق کو بلایا جو عائشہ کے علاج کے سلسلے میں جواب دے چکے تھے۔ ڈاکٹر نے آکر عائشہ کو دیکھا۔ بڑی دیر تک توجہ سے معائنہ کرتا رہا پھر کمرے سے باہر آگیا۔ والد صاحب کے ساتھ ساتھ میں بھی ڈاکٹر کی رائے جاننے کی غرض سے باہر آگیا۔

"اب آپ کی کیا رائے ہے ڈاکٹر" میرے والد نے باہر آکر بڑی امید و بیم کی حالت میں دریافت کیا۔

"میں اسے معجزہ ہی کہوں گا۔" ڈاکٹر اخلاق نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مریضہ کی حالت مجھے حیرت انگیز طور پر سنبھلتی نظر آرہی ہے۔"

"خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" والد صاحب کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔

"کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ آج کل مریضہ کس کے زیر علاج ہے" ڈاکٹر نے بدستور تعجب سے پوچھا۔

"کسی کے بھی نہیں" میں جلدی سے بول پڑا۔

"پھر تو یقیناً" یہ سب کچھ ایک معجزہ ہی ہے" ڈاکٹر نے غیر یقینی انداز میں کہا پھر کچھ ضروری دوائیں اور ہدایت دے کر چلا گیا۔

عائشہ جس کی طبیعت کی طرف سے سارا گھر نا امید ہو چکا تھا حیرت انگیز طور پر روز بروز ٹھیک ہوتی جا رہی تھی والد صاحب اور میں دونوں بوسیدہ قبر کے قائل ہو چکے تھے جس پر حاضری دینے کے بعد عائشہ کو نئی زندگی ملی تھی۔ اپنی جگہ میں بے حد شرمندہ تھا کہ مفت میں' میں نے شکیل کے خلوص اور مشورے کو شبے کی نظروں سے دیکھا اور قبل از وقت اس کی طرف سے دل میں میل لایا جب کہ عائشہ کی حالت اس کے مشورے پر عمل کرنے کے بعد ہی سے سنبھلنی شروع ہوئی تھی۔ میں نے کئی بار

کوشش کی کہ خلوص دل کے ساتھ اپنے دوست سے معذرت طلب کر لوں لیکن اس کا موقع نہ مل سکا۔

جس رات میں عائشہ کو بوسیدہ قبر پر لے گیا تھا اس رات سے شکیل کے رویے میں ایک کھنچاؤ سا پیدا ہو گیا تھا شاید اس لئے کہ اس رات کی بے رخی اور ترش روئی سے اس کے دل کو شدید صدمہ پہنچا تھا۔ میں جب بھی اس سے معذرت طلب کرنے کی کوشش کرتا وہ کسی نہ کسی کام کے بہانے اٹھ کر میرے سامنے سے ہٹ جاتا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ شکیل کی خفگی جب از خود ختم ہو جائے تب اس سے معافی مانگ لوں گا فوری طور پر معذرت طلب کرنے کا خیال دل سے نکال دیا۔

عائشہ جو حیرت انگیز طور پر صحت یاب ہو رہی تھی پندرہ روز کے اندر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئی میں اس کے چہرے پر شگفتگی اور شادابی کی جھلکیاں دیکھ کر پھولا نہ سماتا میرے والدین ہر وقت اس کی دل جوئی اور تیمارداری میں لگے رہتے۔ شام کو میں اسے سہارا دے کر باہر لان پر ٹہلانے لے جایا کرتا۔ رات کو جب وہ اپنے بستر پر سونے کے ارادے سے لیٹتی تو میں اس کے قریب بیٹھ کر اسے لندن کے قصے اور کہانیاں سنایا کرتا تھا جسے وہ بڑے ذوق و شوق سے سنا کرتی تھی ایک ایک چیز کے بارے میں مجھ سے کرید کرید کر سوال کرتی۔

"آج بھی میں عائشہ کے پاس بیٹھا اسے لندن کی ہنگامہ خیز زندگی کے بارے میں بتا رہا تھا جب نرس نے مجھے بتایا کہ ملازم مجھے باہر بلا رہا ہے۔ یہ سوچ کر کہ ممکن ہے اسے کوئی ضروری کام ہو میں عائشہ کے پاس سے اٹھ کر باہر آگیا جہاں راہداری میں ہمارا پرانا ملازم رمضانی کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا اس کے چہرے پر الجھن اور بوکھلاہٹ کے ملے جلے تاثرات دیکھ کر میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اس وقت وہ مجھ سے کوئی اہم بات کہنے والا ہے۔ میرے استفسار پر اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"چھوٹے سرکار ـــــــ آپ کے دوست ...."

"کیا ہوا میرے دوست کو" ملازم کی خاموشی پر میں نے تلملا کر پوچھا۔

"وہ اپنے کمرے میں موجود نہیں ہیں۔"

"تو اس میں اس قدر بوکھلانے کی کیا ضرورت ہے" مجھے ملازم کی اس بات پر

ہنسی آ گئی "کسی کام سے گیا ہو گا۔"

"لیکن دروازہ اندر سے بند ہے" ملازم نے دبی زبان میں جواب دیا پھر سہمی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر کہا "چھوٹے سرکار .... میں نے آپ کے دوست کے کمرے سے سسک سسک کر رونے کی آواز سنی تھی یوں جیسے کوئی ہچکیاں لے لے کر سسک رہا ہو ———— میں نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ابھرنے والی سسکیاں اچانک بند ہو گئیں لیکن دستک کا کوئی جواب نہ ملا اس خیال سے کہ ممکن ہے آپ کے دوست کی طبیعت کچھ خراب ہو میں نے دوبارہ دستک دی لیکن دوسری بار بھی جب کوئی جواب نہ ملا تو میری تشویش بڑھ گئی۔ یہ سوچ کر کہ کہیں میری مداخلت مہمان کو ناگوار نہ گزرے میں چپ چاپ وہاں سے واپس چلا آیا لیکن ابھی میں کمرے سے زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ہچکیوں اور سسکیوں کی آواز دوبارہ سنائی دی ———— میں نے جلدی سے واپس آکر دوبارہ دروازے پر دستک دی مگر جواب ندارد ———— سسکیوں کی آواز اس بار پھر میرے دستک دینے پر اچانک بند ہو گئی تھی۔ میں نے عقب کی طرف جا کر کھڑکی کے پٹ کھول دیئے اور ہاتھ بڑھا کر اندر روشنی کر دی لیکن اندر مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔"

"چلو میرے ساتھ ———— میں دیکھتا ہوں" میں نے ملازم کی بات پر قدرے برہمی کا اظہار کیا پھر اس کو ساتھ لے کر مہمان خانے کی طرف آ گیا جہاں شکیل مقیم تھا۔ دروازے پر میری پہلی دستک کے ساتھ ہی شکیل کی "کون ہے" کی آواز ابھری تو میں نے ملازم کو دیکھا جس کا چہرہ نہ جانے کیوں ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

"میں ہوں ———— ساجد" میں نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

"ایک لمحے بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ شکیل میرے سامنے کھڑا مجھے وضاحت طلب نظروں سے گھور رہا تھا اس کی آنکھوں میں نیند کا ہلکا ہلکا خمار موجود تھا۔ چہرے پر اس وقت بھی وہی گھمبیر سنجیدگی اور اضمحلال مسلط تھا جسے میں کوئی دنوں سے محسوس کر رہا تھا۔

"عائشہ کی طبیعت تو خدانخواستہ خراب نہیں ہو گئی" میری طویل خاموشی کو

محسوس کر کے اس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہے" میں نے جلدی سے کہا پھر بات بنانے کی خاطر بولا۔ "میرا دل گھبرا رہا تھا اس لئے تمہارے پاس آ گیا۔"

جواب میں شکیل کے چہرے پر جو طنز بھری مسکراہٹ ابھری اس نے میرے احساس شرمندگی کو ایسا نشتر لگایا کہ میں تڑپ اٹھا۔ ملازم کو جانے کا اشارہ کرتا ہوا میں شکیل کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر ہمارے درمیان ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا دوست مجھ سے ناراض ہے اور میری باتوں کے جواب میں صرف "ہوں" اور "ہاں" پر اکتفا کر رہا ہے۔

"شکیل میرے دوست" میں نے احساس ندامت کے بوجھ تلے دب کر کہا۔ "کیا تم مجھ سے خفا ہو۔"

"بالکل نہیں" اس کے جواب میں جو تلخی تھی اسے محسوس کر کے میں اور شرمندہ ہو گیا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ دنوں سے چپ چپ سے ہو۔"

"ہاں ————" شکیل نے ایک سرد آہ بھر کر خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "میں کل واپس جانے کے لئے سوچ رہا ہوں۔"

"اتنی جلدی کیا ہے ———— عائشہ کا جشن صحت ہو جائے پھر چلے جانا۔"

"مجھے افسوس ہے میرے عزیز دوست کہ اب میں زیادہ دنوں تک نہیں رک سکتا" اس کے لہجے میں اداسی تھی جیسے اس کے دل میں سینکڑوں ناسور رس رہے ہوں۔

"کیا میری خاطر بھی تم کچھ دنوں اور نہیں رک سکتے۔"

"ضرور رک جاتا لیکن کچھ مجبوری ایسی پیش آ گئی ہے کہ میں اپنا پروگرام ملتوی نہیں کر سکتا ————"

"اچھا ————" میں نے کہا ———— "اگر کوئی اشد ضروری کام ہے تو چلے جاؤ لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ عائشہ کے جشن صحت کے موقع پر تم ضرور آؤ گے۔"

شکیل نے میری بات کا کوئی واضح جواب نہ دیا ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی پھر وہ مضمحل نظر آنے لگا۔ کچھ دیر بیٹھ کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ کپڑے تبدیل کر کے سونے کے ارادے سے لیٹا تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی تمام رات میں اپنے عزیز دوست کے بارے میں سوچتا رہا جو یقیناً" میری بے رخی پر مجھ سے ناراض تھا۔ میں نے اٹل فیصلہ کر لیا کہ صبح میں ہر قیمت پر اسے منا کر واپس جانے سے روک لوں گا۔ اس خیال سے ذہن کچھ ہلکا ہوا تو مجھے نیند آ گئی۔

دوسری صبح میں سو کر اٹھا تو نہ جانے کیوں میری طبیعت بوجھل بوجھل سی ہو رہی تھی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر میں سب سے پہلے عائشہ کے کمرے میں گیا جو خاصی ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی کچھ دیر میں اس کے پاس بیٹھا پیاری پیاری باتیں کرتا رہا پھر اٹھ کر مہمان خانے کی طرف آ گیا۔ اپنے رات والے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں نے خود کو اچھی طرح تیار کر لیا تھا لیکن جب میں شکیل کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں موجود نہیں تھا۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے وہ ہوا خوری کے لئے باہر گیا ہو میں اس کا انتظار کرنے لگا لیکن جب کافی دیر ہو گئی اور شکیل واپس نہ آیا تو مجھے تشویش لاحق ہوئی ملازموں سے اس بارے میں دریافت کیا تو وہ بھی کوئی جواب نہ دے سکے۔ بعد میں میں نے اس کے سامان کو دیکھا تو وہ بھی ندارد تھا۔ مجھے یہ سوچ کر سخت صدمہ ہوا کہ شکیل مجھ سے ملے بغیر چلا گیا۔ تمام دن میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا میں نے اپنے پرانے کاغذات میں شکیل کا پتا تلاش کرنے کی کوشش کی تاکہ بذریعہ خط اس سے معذرت طلب کر لوں لیکن تلاش بسیار کے باوجود میں اس کا پتا نہ ڈھونڈ سکا۔ شکیل کے بارے میں مجھے صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ لاہور کے قریب کسی گاؤں میں رہتا تھا۔

○

عائشہ اب مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر اخلاق نے اس کا ایکسرے لینے کے بعد اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ اب اس کے جسم میں ٹی بی کے جراثیم باقی نہیں ہیں اور اس کے پھیپھڑے بالکل تندرست حالت میں ہیں۔

ڈیڑھ ماہ بعد جب عائشہ کا جشن صحت منایا گیا تو مجھے شکیل کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دنوں بعد وہ واپس آ جائے گا لیکن اس عرصے میں نہ تو اس نے اپنی خیریت کی کوئی اطلاع دی اور نہ ہی کوئی خط لکھا تھا۔

دو ماہ بعد جب میں نے والد سے دوبارہ لندن جانے کی اجازت مانگی تو انہوں نے میرے سامنے ایک مسئلہ رکھ دیا۔ میرے والد چاہتے تھے کہ میرے لندن جانے سے پہلے عائشہ کی شادی کر دی جائے انہوں نے عائشہ کے لئے ایک لڑکے کا انتخاب بھی کر لیا تھا جو اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور ہمارا کہیں دور کا رشتہ دار بھی تھا جب والد صاحب نے مجھے اس رشتے کے بارے میں بتایا تو میں نے فوراً" اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیا۔ والدہ کو جب اس رشتے کا علم ہوا انہوں نے بڑی سختی سے مخالفت کی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ آخر والدہ نے اتنے اچھے رشتے کی مخالفت کیوں کی۔ بہر حال میں نے والد کے کہنے پر اپنے لندن جانے کا پروگرام کچھ دنوں کے لئے اور ملتوی کر دیا۔

ایک روز شام کے وقت میں کسی کام سے والد صاحب کے کمرے کی طرف گیا تو دروازے پر ہی ٹھٹھک کر رک گیا۔ اندر سے میری والدہ کی تیز تیز باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس وقت میرے والدین کے درمیان عائشہ کی شادی کے مسئلے پر گرم گرم بحث ہو رہی تھی۔ والد صاحب بار بار اس بات پر اصرار کر رہے تھے جس لڑکے کو انہوں نے منتخب کیا ہے وہ ہر لحاظ اور اعتبار سے عائشہ کے لئے موزوں ہے لیکن میری والدہ اس بات پر مصر تھیں کہ شادی وہاں کی جائے جہاں پہلے انکار کیا جا چکا تھا۔

"میں ان گنواروں میں اپنی لڑکی کسی قیمت پر نہ دوں گا" والد صاحب نے جھلا کر کہا۔" ایک تو یہ کہ وہاں انکار کیا جا چکا ہے اور دوسری بات یہ کہ انھی دنوں سے عائشہ بیمار پڑ گئی ——— خدا جانے وہ کیسے منحوس لوگ ہوں گے ——— اب میں جہاں بات طے کر رہا ہوں وہ لڑکا خاندانی بھی ہے اور اپنا عزیز بھی ہوتا ہے۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ عائشہ اس لڑکے کی قسمت سے بچ گئی ہو" والدہ نے

دلیل پیش کی۔

"کچھ بھی ہو ——— میں اس جگہ کسی قیمت پر عائشہ کی شادی نہ کروں گا ——— بات بھی پرانی ہو چکی ہے۔ خدا جانے وہ لڑکا اب بھی کنوارا ہو یا کہیں شادی ہو چکی ہو ——— اس کے علاوہ اگر میں نے اپنی طرف سے پہل کی تو وہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ لڑکی میں کوئی نہ کوئی عیب یا کھوٹ ضرور موجود ہے۔"

میرے والد کی دلیل اتنی ٹھوس تھی کہ والدہ نے پھر کوئی بات نہ کی اور دبی زبان میں کہہ دیا کہ۔ "اگر یہ بات ہے تو پھر جہاں آپ مناسب سمجھیں رشتہ کر دیں۔"

بیس روز بعد عائشہ کی شادی بڑی دھوم دھام کے ساتھ وہیں انجام پا گئی جہاں والد چاہتے تھے۔ عائشہ اپنے گھر کی ہو گئی تو میں نے والد صاحب سے اجازت حاصل کر کے لندن واپس جانے کی تیاریاں شروع کر دیں لیکن ایک بات جو مجھے بے چین کئے ہوئے تھی وہ اس راز کو جاننے کی تھی جس کی بنا پر والدہ نے عائشہ کی شادی کی مخالفت کی تھی۔ کئی بار میرا دل چاہا کہ والدہ سے پوچھ لوں کہ آخر عائشہ کی شادی کی بات پہلے کس کے ساتھ چل رہی تھی لیکن ہمت نہ ہوئی۔

میرے لندن جانے میں اب صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا۔ میں اپنی والدہ کے پاس بیٹھا ان سے باتوں میں مصروف تھا والدہ نیچے فرش پر بیٹھی اپنا صندوق ٹھیک کر رہی تھیں کپڑوں اور پرانے کاغذات کا ایک انبار ان کے سامنے بکھرا پڑا تھا جسے وہ سنبھال سنبھال کر قرینے سے صندوق میں رکھ رہی تھیں۔ میں والدہ سے گفتگو کرتے ہوئے پرانے کاغذات کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھتا جاتا تھا۔ کچھ کاغذات جائداد سے متعلق تھے کچھ پرانی دستاویز تھیں جنہیں والدہ نے بہت سنبھال کر رکھا تھا کچھ کاغذات بالکل ذاتی اور نجی نوعیت کے تھے مثلاً میرے والد کا نکاح نامہ' میری اور عائشہ کی پیدائش کے سرٹیفکیٹ وغیرہ اچانک میں نے کاغذات کے ایک مڑے تڑے ٹکڑے کو کھول کر دیکھا تو میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ سب سے پہلی میری نظر جس چیز پر پڑی وہ شکیل کا پتا تھا جو صفحے کے نیچے ایک کونے پر انگریزی میں درج تھا۔ پہلے میں یہی سمجھا کہ شاید میرے لندن جانے کے بعد والدہ نے میرے اس خط کو اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیا ہو لیکن جب میں نے اس خط کو پڑھا تو مجھ پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا وہ خط

شکیل کے والد نے میرے والد کے نام دو سال پہلے کی تاریخوں میں لکھا تھا جس میں انہوں نے شکیل کے لئے عائشہ کا رشتہ مانگا تھا۔

جوں جوں خط پڑھتا گیا میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں۔ اب میں پوری طور سے شکیل کے اچانک چلے جانے کی وجہ سمجھ گیا تھا۔ شاید اس نے میرے ہاں سے جانے کے بعد اسی وجہ سے اپنا کوئی پتا نہیں دیا تھا کہ وہ عائشہ کو دیکھ کر اسے پہچان چکا تھا۔ اسی لئے تو اس نے میرے اصرار کے باوجود میرے گھر سے چلے جانے کی ضد کی تھی اور مجھے بتائے اور مجھ سے ملے بغیر چپ چاپ رخصت ہو گیا تھا۔

میں بڑی دیر تک اس کاغذ کے ٹکڑے کو ہاتھ میں تھامے بیٹھا رہا۔ مجھے اس بات کا بے حد صدمہ تھا کہ اس خط کا راز مجھے پہلے نہ معلوم ہو سکا ورنہ میں عائشہ کے لئے ہر قیمت پر شکیل کو ترجیح دیتا اس لئے کہ وہ میرا عزیز دوست تھا اور اس لئے بھی کہ اسی کے مشورے پر عمل کرنے کے بعد عائشہ کو قدرت کی طرف سے نئی زندگی ملی تھی۔ کچھ دیر تک میں چپ چاپ بیٹھا شکیل کے بارے میں پوچھا تو میری حیرت دو چند ہو گئی والدہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اسی لڑکے کی وجہ سے میرے والد کی پسند کی مخالفت کر رہی تھیں لیکن والد صاحب کا کہنا تھا کہ یہ لڑکا ——— (شکیل) منحوس ہے اس لئے کہ جس روز انہوں نے رشتے سے انکار کیا تھا اسی روز سے عائشہ کی طبیعت خراب ہونی شروع ہو گئی تھی اور بعد میں اس کی بیماری ٹی بی جیسے موذی مرض میں بدل گئی تھی۔

میں نے والدہ کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دل پر بوجھ لئے خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور اپنے عزیز دوست کے بارے میں سوچنے لگا جسے عائشہ کی طویل بیماری کا مورد الزام ٹھہرا کر منحوس قرار دیا گیا تھا۔ میں اگر چاہتا تو والد کو تمام صورت حال سے آگاہ کر کے ان کی نظروں میں شکیل کی شخصیت کو بہت بلند کر سکتا تھا لیکن اب چونکہ ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں تھا اس لئے میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا اب میری والدہ کو اس بات کا خاصا ملال ہوتا۔

دوسرے دن میں نے لاہور میں اپنے ایک پرانے دوست کو ایک طویل خط لکھا جس میں اسے خاص طور پر یہ ہدایت کی کہ وہ شکیل کے گاؤں جا کر اس سے ملے اور

اسے ہر قیمت پر میرے پاس بھیج دے شکیل کے پتے پر میں نے جان بوجھ کر اس لئے خط بھیجنا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ اگر خدانخواستہ میرا خط اس کے والد کے یا کسی اور کے ہاتھ لگ گیا تو ممکن ہے میرے پتے کو دیکھ کر ان کا پرانا زخم تازہ ہو جائے جس کے مندمل ہونے کی اب کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اپنا خط پوسٹ کرنے کے بعد مجھے قدر سکون مل گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شکیل کے آتے ہی میں بڑے خلوص دل سے اس سے تمام سابقہ غلطیوں کی معافی مانگ لوں گا مجھے یقین تھا کہ میرا عزیز دوست مجھے حالات کا علم نہ ہونے کی وجہ سے ضرور معاف کر دے گا۔"

پانچویں روز مجھے لاہور سے اپنے خط کا جواب موصول ہو گیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے لفافہ کھولا لیکن خط پڑھتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے مجھ پر کچھ ایسی دہشت طاری ہوئی کہ خط میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ میرے دوست نے اپنے جواب میں لکھا تھا ——— "شکیل کو انتقال کئے دو سال گزر چکے ہیں۔ اس نے اپنی پسند کی جگہ شادی کرنی چاہی تھی لیکن جب لڑکی والوں نے انکار کر دیا تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ گھر سے بھاگ کر کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد شکیل کے والد کو ایک خط کے ذریعے یہ اطلاع ملی تھی کہ شکیل نے دل برداشتہ ہو کر خود کشی کر لی ہے۔ لیکن خط میں یہ درج نہیں تھا کہ اس نے کس شہر میں خود کشی کی ہے اور اس کی قبر کہاں واقع ہے۔ اس اندوہناک حادثے کی اطلاع پا کر شکیل کی والدہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی اور کچھ دنوں بعد مر گئی۔ شکیل کا باپ ان دونوں صدموں سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ بھی پاگل ہو گیا اور آجکل وہ بھی لاپتا ہے ———"

میں اس سے آگے کچھ نہ پڑھ سکا تھا ——— اسی روز میں نے اس بوسیدہ قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی جس پر حاضری دے کر عائشہ کو ایک نئی زندگی ملی تھی اگلے روز میں چپ چپاتے اپنے عزیز دوست کی قبر کو پختہ کرایا اور اس کے گرد احاطے کی دیوار کر دی۔ قبر کے سرہانے میں نے سنگ مرمر کی جو تختی لگوائی اس پر "شہید وفا" کے علاوہ کچھ اور درج نہیں تھا ——— اور مزید لکھا بھی کیا جا سکتا تھا۔

○

بلوالی کا آدم خور

پورن ماشی کا چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ گاؤں کے ہندو اور مسلمان مل جل کر خوشیاں منانے میں مصروف تھے۔ کنواری اور نوجوان لڑکیوں کی ایک ٹولی مشرق کی جانب جو ندی واقع تھی اس کے کنارے آنکھ مچولی کھیلنے میں مصروف تھی۔ بھکے بھکے جوان اور نقرئی قہقہے رات ہونے کے سبب دور دور تک گونج رہے تھے۔ بدمست جوانیاں رنگ برنگی اور شوخ و شنگ تتلیوں کی مانند اڑتی پھر رہی تھی۔

تقریباً" رات کے دو بجے تک آنکھ مچولی کا یہ کھیل جاری رہا پھر ساری لڑکیاں آشا سے ناراض ہو کر گاؤں کی سمت جانے والی پگڈنڈی پر چل پڑیں سب نے مل کر یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ آشا سے اس کی چالاکی کا بدلہ ضرور لیں گی۔ لڑکیوں کی آشا سے ناراضگی کی وجہ یہ تھی کہ اس بار وہ چور بنی تھی لڑکیاں چھپنے کی غرض سے ادھر ادھر بکھر گئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ آشا بھی طے شدہ پروگرام کے تحت پانچ منٹ بعد اپنی پٹی کھول کر ان کو تلاش میں پریشان ہو گی چنانچہ ساری ہی لڑکیاں دو دو اور تین تین کی ٹولیوں میں مختلف مقامات پر چھپی بیٹھی تھیں لیکن آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا اور کسی دوسری لڑکی کے چور بننے کی آواز نہ سنائی دی تو ایک ایک کر کے ساری لڑکیاں ندی کنارے جمع ہو گئیں۔ آشا کا دور دور تک کوئی پتا نہ تھا اس خیال سے کہ ممکن ہے آشا انہیں تنگ کرنے کی غرض سے کہیں چھپ کر بیٹھ گئی ہو گی انہوں نے کئی بار زور زور سے اسے آوازیں دیں لیکن جب آشا نے کوئی جواب نہ دیا تو انہوں نے یہی نتیجہ نکالا کہ آشا انہیں تنگ کرنے کے لئے گاؤں واپس چلی گئی ہو گی۔ چور بننے کے بعد بھی اس نے اپنی سہیلیوں کو کھیل ختم کر کے گاؤں واپس چلنے کا مشورہ دیا لیکن لڑکیاں اپنی باری لینے پر تل گئی تھیں۔ آشا نے بہت کہا کہ رات زیادہ

بیت چکی ہے اس لئے کھیل ختم کر دیا جائے مگر لڑکیوں نے ایک نہ سنی اور آشا کی آنکھوں پر دوپٹا باندھ کر چھپنے کے لئے ندی کے کنارے اگے ہوئے گھنے درختوں میں جا کر بکھر گئی تھیں۔

بہر حال واپسی کے وقت انہوں نے ٹھان لی تھی کہ آشا سے باری نہ دینے کے سلسلے میں باز پرس ضرور کی جائے گی۔ تمام راستے وہ آشا سے اس کی چالاکی کا بدلہ لینے کا پروگرام بناتی رہیں لیکن گاؤں پہنچ کر جب انہوں نے آشا کو تلاش کیا تو وہ وہاں بھی نہیں پہنچی تھی۔ آشا کے باپ کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ لڑکیوں پر برس پڑا پھر گاؤں کے چھ سات آدمی مل کر آشا کی تلاش میں دوبارہ ندی پر گئے۔ کافی تگ و دو کے بعد انہیں آشا کی لاش ایک گنجان جھاڑیوں کے قریب پڑی ملی لیکن اس حالت میں کہ اس کے جسم کا بیشتر گوشت کھایا جا چکا تھا۔ خون میں لتھڑی ہوئی لاش کو دیکھتے ہی آشا کا باپ چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے آشا کے باپ کو سنبھالا اور باقی لوگوں نے جب آشا کی موت کا کھوج لگایا تو وہ حواس باختہ ہو گئے۔ زمین پر کسی شیر کے قدموں کے واضح نشانات اس بات کا ثبوت تھے کہ آشا کا قاتل کوئی شیر ہے جس نے اسے ندی کے کنارے تنہا پا کر لقمہ اجل بنایا اور اپنی شکم سیری کے بعد چلتا بنا۔ اس ڈر سے کہ شیر کہیں قریب ہی چھپا ہو اور موقع پا کر دوبارہ حملہ آور ہو جائے سب لوگوں نے مل کر زور زور سے چلانا شروع کر دیا اور آشا کی بچی کچی لاش اور اس کے بے ہوش باپ کو اٹھا کر روتے پیٹتے واپس گاؤں کی طرف چل پڑے۔ گاؤں والوں کو جب آشا کی موت کی وجہ معلوم ہوئی تو ایک کہرام مچ گیا۔ شیر کے ڈر سے وہ اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے ------- وہ رات انہوں نے جاگ کر گزاری اور صبح ہونے پر آشا کے جسم کے بچے کچے حصوں کا کریا کرم کیا گیا۔

شوالک کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع بلوالی جنگل سے دو کوس کے فاصلے پر یہ گاؤں ایک عرصے سے آباد تھا لیکن آج تک وہاں آدم خور شیر کا تصور بھی کبھی نہیں ابھرا تھا۔ گاؤں کی آبادی سو سوا سو خاندان پر مشتمل تھی۔ ان میں زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھی لیکن ان کا برتاؤ گنے چنے مسلمان خاندانوں سے بہت اچھا اور بالکل سگے بھائیوں جیسا تھا۔ صرف ایک بار ٹھاکر بلبیر سنگھ نے جو گاؤں میں نیا نیا آ کر آباد ہوا تھا

وہاں کے ہندوؤں میں تعصب پھیلانے کی کوشش کی تھی مگر گاؤں والوں نے جواب میں اسے برا بھلا کہہ کر گاؤں سے نکال دیا تھا۔ ٹھاکر بلبیر سنگھ اسی رات اپنا مختصر سا سامان لے کر گاؤں سے نکل پڑا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا بارہ سال کا لڑکا بھی تھا۔ دوسری صبح گاؤں والوں نے ان دونوں باپ بیٹوں کو کنویں کے پاس سے جو گاؤں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا مردہ حالت میں پایا ------- بلبیر سنگھ کی دو نالی بندوق جس سے صرف ایک فائر کیا گیا تھا اس کی لاش کے قریب پڑی ملی تھی۔ زمین پر جو نشانات ملے تھے اس سے گاؤں والوں نے یہی نتیجہ نکالا تھا کہ بلبیر سنگھ کا آمنا سامنا کسی جنگلی سور سے ہوا ہو گا اور بلبیر سنگھ نے اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر اس پر فائر کیا اور سور نے زخمی ہونے کے بعد اپنا انتقام ان دونوں سے پورا کیا اور جنگل کی طرف نکل گیا۔

بلبیر سنگھ اور اس کے نوجوان لڑکے کی موت کو تین چار دن گزر چکے تھے۔ گاؤں والوں نے اس واقعے کو کوئی خاص اہمیت نہ دی تھی لیکن آشا کی موت اور آدم خور شیر کے تصور نے انہیں بری طرح ہلا دیا چنانچہ آشا کا کریا کرم کرنے کے بعد گاؤں کے پانچ آدمیوں کا ایک وفد ملحقہ گاؤں پہنچ کر بڑے زمیندار سے ملا اور درخواست کی اس آدم خور شیر کو مارنے کا فوری طور پر بندوبست کیا جائے مبادا کہ وہ مزید جانوں کی ہلاکت کا سبب بنے۔ زمیندار نے جو ایک نیک اور شریف آدمی تھا گاؤں والوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ وہ بہت جلد کسی شکاری کو آدم خور کو ٹھکانے لگانے کی غرض سے بھیج دے گا۔ گاؤں والے مطمئن ہو کر واپس آ گئے۔

تین روز تک نہ تو کوئی شکاری وہاں پہنچا نہ ہی کوئی دوسرا واقعہ پیش آیا لیکن چوتھے روز شیر نے بڑی ہوشیاری سے اپنا دوسرا شکار حاصل کر لیا۔ اس بار شیر نے گاؤں کے اندر گھس کر مادھو لال نامی ایک بوڑھے شخص کو اپنا نشانہ بنایا جو رات کو کوئی گیارہ بجے قریب پیشاب کرنے کی غرض سے اپنا مکان سے باہر نکلا تھا لیکن ابھی وہ اپنے مکان سے نکل کر بمشکل آٹھ نو گز دور گیا ہو گا کہ شیر جو غالباً" کہیں قریب ہی چھپا بیٹھا تھا' آناً" فاناً" اس پر ٹوٹ پڑا اور دو ہی جھٹکوں میں مادھو لال کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مگر شیر اس بار اپنے شکار کو لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی

وجہ یہ تھی کہ مادھولال نے گھر سے نکلتے وقت اپنی بیوی کو بھی جگا دیا تھا جو دروازے پر کھڑی تھی۔ شیر کو اچانک اپنے پتی پر حملہ آور ہوتے دیکھ کر اس نے جلدی سے دروازہ بند کر کے شور مچانا شروع کر دیا۔ اس کے شور و غل کی آواز سن کر کچھ اور لوگ بھی جاگ پڑے اور انہوں نے بھی شور کرنا شروع کر دیا۔ شیر اس اچانک شور و غل سے گھبرا گیا اور مادھولال کی لاش کو چھوڑ کر دو ہی جست میں گاؤں سے باہر نکل گیا۔

مادھولال کی لاش تمام رات کھلے آسمان کے نیچے پڑی رہی۔ گاؤں والے تمام رات شور مچاتے رہے لیکن گھر سے باہر نکلنے کی ہمت کسی ایک کو بھی نہ ہوئی۔ جنگل کی طرف سے شیر کے دہاڑنے کی خوفناک آواز صبح تک برابر تھوڑی تھوڑی دیر سنائی دیتی رہی شاید بھوکا درندہ اپنے شکار کے ہاتھ سے نکل جانے پر تمام رات گرج گرج کر اپنے غصے کا اظہار کرتا رہا تھا۔

صبح جب خاصا دن نکل آیا تب لوگ گھروں سے نکلے پہلے انہوں نے مادھولال کا کریا کرم کیا پھر دوبارہ زمیندار کے پاس گئے اور رو رو کر فریاد کی کہ اگر شیر کو مارنے کا فوری طور پر کوئی بندوبست نہ کیا گیا تو وہ اور بھی غضب ڈھائے گا۔ زمیندار جو خود بھی مادھولال کی موت کی خبر سن کر پریشان ہو رہا تھا فوری طور پر کوئی حل تلاش نہ کر سکا۔ آشا کی موت کی اطلاع ملنے کے بعد اس نے اپنے دو تین واقف کار شکاریوں کو شوالک پہنچ کر بلوالی جنگل کے اس خون آشام سے دو دو ہاتھ کرنے کی دعوت بھیج رکھی تھی لیکن ابھی تک کسی ایک کا بھی جواب نہیں آیا تھا۔

زمیندار کا جوان لڑکا جو اس وقت باپ کے ساتھ بیٹھا گاؤں والوں کے رونے دھونے کا تماشا دیکھ رہا تھا چپ نہ رہ سکا۔ اس نے دبی زبان میں باپ سے اجازت طلب کی تو زمیندار جو اپنے اکلوتے لڑکے سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا سٹپٹا کر رہ گیا۔ گاؤں والوں کی موجودگی میں وہ اشوک کو اپنی جان جوکھم میں ڈالنے سے منع کرنے سے ہچکچا رہا تھا لیکن جب گاؤں والوں کے ساتھ اشوک نے بھی باپ سے اصرار کیا تو زمیندار نے بجھے ہوئے دل سے اسے اجازت دے دی۔ زمیندار کو اپنے جوان بیٹے کی شکاری صلاحیتوں پر بے حد بھروسا تھا۔ اشوک اب تک کئی شیر اور چیتوں کو اپنی

اعشاریہ تین سات پانچ کی رائفل سے نشانہ بنا چکا تھا لیکن کسی آدم خور سے نبرد آزما ہونے کے معاملے میں اس کا تجربہ صفر کے برابر تھا۔ اسی وجہ سے زمیندار نے فوری طور پر اسے اجازت دینے سے گریز کیا تھا۔

اگلے روز اشوک کیل کانٹے سے لیس ہو کر اپنے ایک پرانے ملازم رامو کے ساتھ اس گاؤں پہنچ گیا جہاں آدم خور اب تک دو انسانی جانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ گاؤں والوں نے اشوک کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا اور دل کھول کر اس کی آؤ بھگت کی۔ ان کا اصرار تھا کہ اشوک ان کے ساتھ ہی گاؤں میں رہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پہلے ہی سے ایک صاف ستھرا مکان خالی کر رکھا تھا لیکن اشوک نے گاؤں میں ٹھہرنے کے بجائے اپنے ملازم کے ساتھ اس ڈاک بنگلے میں قیام کیا جو گاؤں سے بمشکل سو گز دور ندی والے راستے پر واقع تھا۔ یہاں پر باہر سے آنے والے پیشہ ور شکاریوں یا پھر ریاست کے کسی بڑے افسر کے ٹھہرنے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ اشوک نے گاؤں والوں کو سمجھا دیا کہ شکار کے مقصد کے لئے یہ بنگلہ زیادہ مناسب رہے گا۔ چنانچہ گاؤں والے مطمئن ہو گئے لیکن انہوں نے بڑے اصرار کے بعد اشوک کو اس بات کے لئے راضی کر لیا کہ اس کے بھوجن پانی کا بندوبست انہیں کے ذمے رہے گا۔ اشوک نے گاؤں والوں کی بات مان لی تھی۔

اشوک نے گاؤں کے کچھ لوگوں کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ چند افراد کو ساری رات باری باری جاگنے کے لئے کہہ دیں تاکہ اگر شیر کسی وقت نظر آئے تو اس کی بروقت اطلاع اسے پہنچائی جا سکے۔ گاؤں والوں نے اس کی تجویز کو فوراً ہی قبول کر لیا اور اسے اپنے تعاون کا پورا پورا یقین دلانے کے بعد واپس لوٹ آئے۔

دو روز تک اشوک بنگلے میں بیٹھا آدم خور شیر کے بارے میں کسی متوقع اطلاع کا انتظار کرتا رہا۔ تیسرے دن اس نے گاؤں والوں سے ایک بکرا حاصل کیا اور سر شام جا کر اسے ندی کے اس کنارے پر باندھ آیا جو جنگل سے ملتا تھا۔ اگلی صبح جب وہ رامو کو ساتھ لے کر بکرے کو دیکھنے گیا تو وہ وہاں موجود نہیں تھا قرب و جوار کی زمین چونکہ بھربھری اور نمی لئے ہوئے تھی اس لئے اشوک نے شیر کے قدموں کے نشانات بھی دیکھے جس جگہ بکرا باندھا گیا تھا وہاں خون کی خاصی مقدار موجود تھی۔ رامو کے

مشورے پر اشوک نے شیر کے قدموں کا تعاقب کیا اور جنگل میں اس جگہ تک پہنچ گیا جہاں بکرے کی آدھی سے زیادہ کھائی ہوئی لاش ایک برگد کے گھنے درخت کے نیچے موجود تھی۔ شیر نے اپنا پیٹ بھرنے کے بعد اپنے شکار کو وہیں چھوڑ دیا تھا اور آرام کرنے کی غرض سے جنگل میں کہیں چلا گیا تھا۔ اشوک کا خیال تھا کہ اسی وقت شیر کا تعاقب کیا جائے لیکن رامو نے جو اب تک متعدد بار پیشہ ور شکاریوں کے ساتھ گھنے جنگلات میں ہم رکاب رہ چکا تھا بڑی سختی کے ساتھ اس بات کی مخالفت کی اور یہ تجویز پیش کی کہ برگد کے درخت پر مچان باندھ کر اس پر بیٹھا جائے۔ شیر بکرے کی بچی کھچی لاش کھانے کے لئے ضرور آئے گا۔ اشوک چونکہ رامو کے وسیع شکاری تجربے سے واقف تھا اس لئے رامو کی بات مان لی۔ گاؤں والوں کو علم ہوا تو انہوں نے اشوک کی ہدایت کے مطابق برگد کے درخت پر مچان تیار کر دی۔

دن بھر آرام کرنے کے بعد شام کو اشوک نے نہا کر کپڑے تبدیل کئے اور رامو کو ساتھ لے کر مچان پر بیٹھ گیا۔ گاؤں کے ایک دو نوجوانوں نے اس بات کی پیش کش بھی کی کہ اگر اشوک چاہے تو وہ اس کے ساتھ مچان پر بیٹھ سکتے ہیں لیکن اشوک اور رامو نے ان کی یہ پیش کش قبول نہیں کی۔ جب جھٹپٹے کے وقت گاؤں والے جانے لگے تو اشوک نے انہیں اس بات کی خاص طور پر ہدایت کی کہ رات کے وقت کوئی بھی گھر سے باہر نہ نکلے اور اگر ہو سکے تو اپنے اپنے مکانوں کے سامنے الاؤ روشن رکھیں تاکہ اگر شیر زخمی ہو کر یا خطرے کی بو سونگھ کر مشتعل ہو تو آبادی کا رخ نہ کر سکے۔ گاؤں والوں کے جانے کے بعد اشوک اور رامو اپنی پوزیشن سنبھال کر بیٹھ گئے اور رات بھیگنے کا انتظار کرنے لگے۔ اشوک نے اپنی اعشاریہ تین سات پانچ کی رائفل بھر کر اپنے قریب رکھی ہوئی تھی۔ رامو کے پاس اس کی اپنی دو نالی بندوق تھی جو کسی انگریز شکاری نے اس کی خدمات سے خوش ہو کر بطور انعام اسے دی تھی۔

رات کے گیارہ بجے تک اشوک ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا دوربین کے ذریعے قرب و جوار کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے ایک طویل جماہی لیتے ہوئے دوربین رامو کے حوالے کی اور یہ کہہ کر لیٹ گیا کہ جیسے ہی کوئی آہٹ ہو اس فوراً" جگا دیا جائے۔ رامو نے اثبات میں گردن ہلا کر جواب دیا پھر دوربین سنبھال کر ندی کی طرف دیکھنے

لگا۔ مچان چونکہ بیس فٹ کی بلندی پر بندھا تھا اس لئے سوائے زہریلے کیڑے مکوڑوں کے اور کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔

اشوک کا خیال تھا کہ وہ کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کے بعد دوبارہ اٹھ بیٹھے گا لیکن ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں نے اس کے ذہن پر کچھ ایسی خوابیدہ کیفیت طاری کی کہ ارادہ نہ ہونے کے باوجود اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ کتنی دیر سویا تھا اس کا اندازہ نہ کر سکا لیکن دوبارہ آنکھ کھلنے کی وجہ شیر کی خوفناک غراہٹ تھی جو عین مچان کے نیچے سے سنائی دی تھی۔ اشوک کوئی آواز نکلے بغیر ہی کمال حیرت سے اٹھ بیٹھا لیکن مچان پر نظر ڈالتے ہی وہ کانپ اٹھا تھا۔ رامو اپنی بندوق سمیت غائب تھا۔ اشوک کو یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ رامو کا انجام کیا ہوا ہو گا۔ دوربین اٹھا کر اس نے نیچے دیکھا تو اس کی نظروں میں خون اتر آیا۔ بلوالی کا آدم خور برگد کے درخت سے کوئی دس فٹ دور اس کی نظروں کے سامنے بڑے فاتحانہ انداز میں کھڑا رامو کے جسم کو ادھیڑ رہا تھا۔ اشوک کو رامو کا انجام دیکھ کر اس قدر صدمہ ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے لیکن دوسرے ہی لمحے بڑی احتیاط اور خاموشی سے اس نے اپنی رائفل اٹھائی اور نہایت اطمینان سے شیر کی پیشانی کی شست باندھ کر لبلبی دبا دی۔ فائر کی گونج کے ساتھ ہی شیر بڑے خونخوار انداز میں دھاڑتا ہوا زمین سے کوئی دس فٹ اچھلا پھر زمین پر گر کر ڈھیر ہو گیا۔ اشوک کو یقین تھا کہ اس کی پہلی ہی گولی خون آشام کے لئے کارگر ثابت ہوئی ہے لیکن رامو کا انتقام لینے کی خاطر اس نے دوبارہ شیر کے دل کا نشانہ لیا اور دوسرا فائر بھی کر دیا۔ اس بار شیر نے ایک معمولی سی حرکت بھی نہیں کی۔ جنگل جو کچھ دیر پہلے پر سکون تھا شیر کی پہلی ہی گرج سے دہل اٹھا تھا۔ درختوں پر بسیرا کرنے والے ہزار ہا پرندے شور و غل مچاتے فضا میں پرواز کر رہے تھے۔

گاؤں والوں نے جب شیر کی دھاڑ پہلی بار سنی تو وہ یہی سمجھے تھے کہ شاید وہ شکاریوں پر غالب آگیا ہے لیکن جب یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے اور شیر کی آواز نہ سنائی دی تو وہ خوشی سے ناچ اٹھے اور اشوک کے منع کرنے کے باوجود چالیس بیالیس آدمیوں کا گروہ روشن مشعلیں ہاتھ میں لئے وہاں پہنچ گیا جہاں آدم خور مردہ پڑا تھا

لیکن مرتے مرتے بھی وہ رامو کو اپنا تیسرا شکار بنا چکا تھا۔ اشوک نے نیچے اتر کر لوگوں سے رامو کی لاش ڈاک بنگلے لے چلنے کو کہا تاکہ اس کے کریا کرم کا بندوبست کیا جا سکے۔ کچھ لوگوں نے شیر کو بھی اسی وقت اٹھا لے چلنے کو کہا لیکن اشوک کو اپنے ملازم کی موت کا بے حد صدمہ تھا اس لئے اس نے گاؤں والوں سے کہا کہ وہ ایک دو آدمیوں کو شیر کے پاس چھوڑ دیں تاکہ دوسرے جانور اس کی کھال کو برباد نہ کر سکیں۔ اسے اٹھوانے کا بندوبست صبح زیادہ بہتر طور پر کیا جا سکتا تھا۔

دوسری صبح جب رامو کے کریا کرم سے فارغ ہو کر گاؤں والوں کی ٹولی شیر کو اٹھانے کی غرض سے پہنچی تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ دونوں جوان جو رات کو مچان پر شیر کی نگرانی کے لئے تعینات کئے گئے تھے مردہ حالت میں پائے گئے۔ شیر کا دور دور تک کوئی سراغ نہ مل سکا لیکن اس کے تازہ قدموں کے نشانات ضرور دیکھے گئے تھے۔ دونوں محافظوں کی لاشیں مچان کے اوپر پائی گئی تھیں لیکن اس حالت میں کہ ان دونوں کو محض چیرا پھاڑا گیا تھا جسم کے حصے کا گوشت نہیں کھایا گیا تھا۔

شیر کو اٹھا کر لے جانے والی ٹولی جو ناچتی گاتی اور دھوم مچاتی آئی تھی غل مچاتی الٹے قدموں واپس بھاگ گئی۔ اشوک کو علم ہوا تو اس نے گاؤں والوں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا لیکن آشا کے باپ نے آگے بڑھ کر کہا۔

"میں بھگوان کی سوگند کھاتا ہوں مالک کہ جو کچھ ہم نے آپ کو بتایا ہے وہ حرف بحرف درست ہے۔"

"پھر وہ مردہ شیر کہاں گیا۔"

"کون جانے مالک ——— ہو سکتا ہے اس موذی نے رات ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے مکر کیا ہو۔"

اشوک کسی طرح گاؤں والوں کی بات مان لینے کو تیار نہ تھا چنانچہ اسی وقت کچھ آدمیوں کو لے کر روانہ ہو گیا پھر اس کے پاؤں تلے سے بھی زمین نکل گئی جب اس نے گاؤں والوں کے بیان کو درست پایا۔ دونوں محافظ اب بھی مچان پر مردہ حالت میں پڑے تھے۔ برگد کے جس درخت پر مچان باندھا گیا تھا اس کے تنے پر شیر کے پنجوں کے لاتعداد نشانات موجود تھے۔ اگر معاملہ کسی چیتے کا ہوتا تو اشوک بلاشک و شبہ تسلیم

کر لیتا کہ اس نے درخت پر چڑھ کر دونوں آدمیوں کو کمال ہوشیاری سے موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا لیکن کسی شیر کا درخت پر بیس فٹ کی بلندی تک چڑھنا ناممکنات ہی میں سے تھا اور ایسی حالت میں جب کہ وہ شیر مردہ حالت میں وہاں چھوڑا گیا تھا۔ خود اشوک نے گزشتہ رات اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اس کی پہلی ہی گولی نے شیر کی کھوپڑی میں ایک بڑا سوراخ کر دیا تھا۔ دوسری گولی عین دل کے مقام پر پیوست ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں شیر کا دوبارہ زندہ ہو جانا اور دو آدمیوں کو ہلاک کر کے بھاگ جانا یقیناً" ناقابل یقین بات تھی۔ گاؤں والوں کو بھی اس عجیب و غریب بات پر سخت حیرت ہو رہی تھی۔ اشوک نے کچھ سوچ کر اسی وقت چند جوانوں کو ساتھ لیا اور جنگل میں کافی دور تک شیر کی تلاش بسیار کے بعد شام کے وقت تھکا ماندا واپس آ گیا۔ گاؤں والے اپنے دونوں آدمیوں کی لاش اٹھا کر روتے پیٹتے واپس چلے گئے۔ ان کی زبانی جب گاؤں میں شیر کے دوبارہ زندہ ہونے کی خبر پھیلی تو پورے گاؤں میں خوف و ہراس کی لہر پھیل گئی۔ ہر شخص دبی دبی زبان میں اس پر اسرار واقعے کے متعلق چہ میگوئیاں کرتا نظر آ رہا تھا۔

دوسری طرف خود اشوک بھی شیر کے دوبارہ زندہ ہو جانے پر سخت حیران و پریشان تھا۔ شکاری زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا جب کسی شیر نے چالاک انسانوں کی طرح مکر و فریب سے کام لیا تھا۔ اشوک کا ذہن اس بات کو مان لینے کے لئے تیار نہ تھا کہ شیر دو گولیاں کھانے کے باوجود بچ گیا ہوگا لیکن دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر وہ مر چکا تھا تو پھر اچانک غائب کیسے ہو گیا؟ دونوں محافظوں کو مچان پر چڑھ کر کس نے ہلاک کیا؟

رات کو گاؤں والے حسب معمول کھانا لے کر ڈاک بنگلے پہنچے تو اشوک نے کافی دیر تک ان لوگوں سے بھی اسی مسئلے پر گفتگو کی لیکن کوئی حل نہ تلاش کر سکا۔ گاؤں والے واپس چلے گئے تو اس نے بھوجن کیا اپنے ساتھ اوم ناتھ کو لیا اور پھر خوابگاہ میں آ کر ان دونوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اشوک نے کاربائیڈ لیمپ کی روشنی بڑھائی اور اپنے بستر پر لیٹ کر ایک کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔ کافی دیر تک پڑھنے کے بعد اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ کتاب میز پر رکھ کر اس نے لیمپ کی روشنی مدھم کی پھر ایک طویل جماہی لی اور بستر پر لیٹ کر

سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ابھی اشوک کو بستر پر لیٹے کوئی پندرہ بیس منٹ ہی گذرے تھے کہ برآمدے میں کچھ ایسی آہٹ ابھری جیسے کوئی دبے قدموں چل رہا ہو۔ پہلے تو اشوک نے اس آواز کو نیند میں بوجھل ذہن کا وہم سمجھ کر ٹال دیا لیکن جب دوسری بار اس آہٹ کے ساتھ ہی ہلکی ہلکی غراہٹ کی آواز ابھری تو وہ یکلخت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اوم ناتھ کو آواز دی تو وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ آواز یقیناً کسی شیر ہی کی تھی بستر سے نیچے اتر کر اس نے جلدی سے اپنی رائفل کو لوڈ کیا اور پنجوں کے بل چلتا ہوا دروازے کے قریب آکر باہر کی آہٹ سنتا رہا۔ تیسری بار شیر کی آواز بنگلے کی پشت کی سمت سے آئی تھی غالباً" وہ دروازہ بند پا کر پچھلی طرف والے میدان میں چلا گیا تھا۔ اشوک نے ہاتھ میں دبی ٹارچ کو رائفل سے منسلک کیا پھر دبے قدموں چلتا ہوا کھڑکی کے پٹ آہستہ سے کھول کر اس نے باہر دیکھا تو مارے حیرت کے آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ بلوالی کا آدم خور باہر پھیلی ہوئی چاندنی مین بڑی لاپرواہی سے چہل قدمی کر رہا تھا اشوک نے بڑی پھرتی سے اس کا نشانہ لیا۔ ٹارچ کی تیز روشنی اچانک ہی شیر کی بائیں کنپٹی پر پڑی اس کے ساتھ ہی رائفل کی آواز گونجی تھی۔ شیر نے ایک لمبی جست لگائی اور پوری قوت سے گرجتا ہوا عین کھڑکی کے سامنے آکر زمین پر ڈھیر ہو گیا اشوک خاصی دیر تک وہاں کھڑا باہر کی سن گن لیتا رہا جب بہت دیر ہو گئی اور شیر کے غرانے یا حرکت کرنے کی کوئی آواز نہ سنائی دی تو اسے یقین ہو گیا کہ گولی نے یقیناً" شیر کا بھیجا اڑا دیا ہو گا۔ کھڑکی اونچائی پر واقع تھی اس لئے وہ شیر کو نہ دیکھ سکا لیکن اس بات کا یقین آ جانے کے بعد کہ وہ مر چکا ہے۔ اشوک تیزی سے لپک کر سامنے والے دروازے کی طرف آیا جلدی سے چٹخنی کھولی اور رائفل سنبھالے برآمدے میں آگیا۔ لیکن پھر فوراً" ہی بوکھلا کر رک گیا۔ برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب خون آشام درندہ کھڑا اسے اپنی چمک دار خونیں آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اشوک نے رائفل سیدھی کی لیکن شیر نے برق رفتاری سے چھلانگ لگائی اور پہلے ہی حملے میں اشوک کو دبوچ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ ادم ناتھ نے اس ہولناک منظر کو دیکھ کر ڈر کے مارے خود کو غسل خانے میں بند کر لیا۔

گاؤں والے جو شیر کی پر اسرار گمشدگی سے ہراساں تھے اس وقت بھی جاگ رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں جب انہوں نے ڈاک بنگلے کی طرف سے شیر کی گرجدار آواز سنی اور اشوک کی کربناک چیخ ابھری تو خوف کے مارے وہ کانپ اٹھے۔ کسی میں بھی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ ڈاک بنگلے تک جا سکتا۔ ساری رات وہ بے چینی سے جاگتے رہے۔ پو پھٹنے کے بعد جب گاؤں کے لوگ کلہاڑی اور درانتی سے لیس ہو کر شور مچاتے وہاں پہنچے تو اشوک کی ادھڑی ہوئی لاش انہیں چبوترے سے نیچے نظر آ گئی شیر کے قدموں کے نشانات اور رات کو سنی جانے والی اس کی آواز ہی اس بات کا ثبوت تھی اشوک بھی اسی آدم خور کا شکار ہو گیا جو اب تک چار انسانی جانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔

بڑے زمیندار کو جوان بیٹے کی موت کی اطلاع ملی تو وہ دیوانہ ہو کر رہ گیا۔ کریا کرم پورا کرنے کے بعد اس نے اسی وقت ہرکارے کو ہندو ریاست کے مالک کے پاس یہ پیغام لے کر روانہ کیا کہ اگر شیر کو ہلاک کرنے کا فوری بندوبست نہ ہوا تو گاؤں کی ساری آبادی اس کا شکار ہو جائے گی زمیندار کے ہرکارے نے واپس آکر بتایا کہ والئ ریاست نے بہت جلد شکاریوں کو بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔

رات آئی تو گاؤں والے سر شام ہی سے اپنے اپنے گھروں میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ مکانوں کے درمیان والے میدان میں انہوں نے لکڑیوں کا الاؤ روشن کر دیا تھا تا کہ شیر اگر آئے تو آگ سے ڈر کر بھاگ جائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے اپنے اوزار جو ان کے پاس موجود تھے پوری طرح تیار کر رکھے تھے کہ اگر شیر سے مقابلے کی کوئی صورت نکل آئے تو عین وقت پر انہیں ادھر ادھر نہ بھاگنا پڑے۔

رات جیسے جیسے بھیگتی گئی سناٹے میں اضافہ ہوتا گیا ---------- چاند کی روشنی نے پورے گاؤں کو اپنی روشنی میں نہلا رکھا تھا کبھی کبھار جنگل کی طرف سے کسی جانور کی آواز ابھر کر ہوا کے دوش پر دور تک لہراتی چلی جاتی۔ گاؤں کے تمام مرد جاگ رہے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اونچی آواز میں بولنے لگتے تھے تا کہ اگر شیر پشت کی طرف سے آئے تو لوگوں کی آواز سن کر بھاگ جائے۔

کوئی ایک یا دو کا عمل رہا ہو گا جب جنگل کی سمت سے شیر کی غراہٹ کی آواز سنائی دی اس کے کچھ دیر بعد بھیڑیوں کی آواز ابھری تھی اس کے تھوڑی دیر بعد کچھ پرندے چیختے چلاتے گاؤں کے اوپر سے مخالف سمت کو اڑتے نظر آئے جس کا مطلب یہی تھا کہ خون آشام درندہ جنگل سے گاؤں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ گاؤں کے لوگوں نے خطرے کو محسوس کیا تو اپنے اپنے گھروں کے اندر ہی سے طے شدہ پروگرام کے تحت ٹین کے کنستر اور خالی ڈبے زور زور سے پیٹنے شروع کر دیئے۔ انہیں مکمل اعتماد تھا کہ اگر شیر کہیں قریب تک آ بھی گیا ہے تو ان آوازوں کو سن کر بھاگ جائے گا۔ دس منٹ تک وہ مسلسل غل غپاڑ اچا کر شیر بھگانے کی تدبیر پر عمل کرتے رہے پھر اچانک جب شیر کی آواز گاؤں میں آبادی کے درمیان سے سنائی دی تو خوف کے مارے انہوں نے ٹین کنستر پیٹنا بند کر دیا اور اپنے اپنے ہتھیار سنبھال کر دروازے کے قریب آ کر جھریوں سے باہر دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر تک ہر طرف سناٹا طاری رہا پھر اچانک خرخراہٹ کی تیز آواز سنائی دی یوں لگ رہا تھا جیسے کسی انسان کو گلا گھونٹ کر مارا جا رہا ہو۔ گاؤں والے اس اذیتناک آواز کو سن کر بری طرح دہل گئے۔ انہیں یقین تھا کہ آدم خور نے کسی کو موقع پا کر دبوچ لیا ہے۔ خرخراہٹ کی آواز بھر کر معدوم ہوتی چلی گئی اس کے بعد مغربی حصے کی سمت سے کسی کی آواز سنائی دی۔ بچاؤ .... بچاؤ .... پانی .... پانی۔"

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گاؤں کا کوئی آدمی نزع کی حالت میں مدد کے لئے اپنے ساتھیوں کو آواز دے رہا ہو اس خیال سے کہ شیر غالباً" کسی وجہ سے اپنے شکار کو ختم کر کے چلا گیا ہے قریب کے مکانوں کے کچھ افراد درانتی اور کلہاڑا لئے باہر نکل آئے۔ آواز کے قریب شور مچاتے پہنچے تو دیکھا کہ گاؤں کے ایک مسلمان رحمت دین کا لڑکا زخمی حالت میں پڑا کراہ رہا ہے۔ شیر نے اس پر اچٹتا ہوا وار کیا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی حالت خراب تھی پسلیوں کے نیچے خاصا گہرا زخم آیا تھا بائیں جانب شانے کے پاس کا کچھ گوشت بھی غائب تھا لڑکے نے دوسروں کو نزدیک آتے دیکھا تو کربناک لہجے میں چلایا۔

"خدا کے لئے اس کا پیچھا کرو۔ وہ میرے باپ کو گلے سے پکڑ کر گھسیٹ لے گیا

ہے۔"

کچھ لوگوں نے جوش میں آ کر اسی وقت شیر کا تعاقب کرنا چاہا لیکن بڑے بوڑھوں نے منع کر دیا اور زخمی لڑکے کو اٹھا کر اندر لے آئے جو زخموں کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ دوسری صبح جب وہ رحمت دین کی تلاش میں نکلے تو اس غریب کی لاش کئی ٹکڑوں میں ندی کے کنارے ادھر ادھر بکھری ہوئی ملی خون آشام درندے نے اس بار جس ہولناک درندگی کا مظاہرہ کیا تھا اسے دیکھ کر نوجوانوں کے دل بھی کانپ اٹھے۔ جو مسلمان ساتھ آئے تھے انہوں نے اشکبار آنکھوں سے رحمت دین کی لاش کے ٹکڑوں کو جمع کیا اور اس کی تجہیز و تکفین کر دی۔ رحمت دین کا جوان لڑکا بھی شام تک زخموں کی تاب نہ لا کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ان دونوں باپ بیٹوں کی موت نے پورے گاؤں پر اداسی طاری کر دی آدم خور نے ایک ہی رات میں دو مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار کر گاؤں والوں کو بری طرح دہشت زدہ کر دیا تھا کچھ لوگوں کا ایک وفد اسی وقت ملحقہ گاؤں جا کر زمیندار سے ملا لیکن زمیندار کو اپنے جوان لڑکے کا غم ابھی تازہ تھا اس لئے اس نے روکھا سا جواب دے کر انہیں واپس لوٹا دیا۔ وفد کے اراکین نے جب واپس آ کر دوسروں کو زمیندار کے روکھے پھیکے جواب سے آگاہ کیا تو کچھ دیر کے لئے سکتہ طاری ہو گیا پھر گاؤں کے بزرگ سر جوڑ کر مشورہ کرنے بیٹھ گئے اور یہ فیصلہ کیا کہ اس طرح الگ الگ مرنے سے بہتر ہے کہ وہ سب ایک ساتھ مر جائیں یا اکٹھا ہو کر اس درندے کو ہلاک کر دیں جو ان کے لئے وبال جان بنتا جا رہا تھا۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ رات کو عورتوں اور بوڑھوں کو ایک جگہ کر دیا جائے اور جہاں ان لوگوں کو رکھا جائے ان کے اطراف کے مکانوں میں گاؤں کے تمام نوجوان باری باری جاگ کر رات گزاریں اور اگر شیر حملہ آور ہو تو اندر دبکے رہنے کے بجائے باہر نکل کر موذی کے ساتھ ایک آخری فیصلہ کر لیں۔

شام ہوئی تو طے شدہ پروگرام کے تحت گاؤں کی عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو ایک جگہ کر دیا گیا اور جوانوں نے اس مکان کے چوطرفہ پھیلے ہوئے مکانوں میں ٹولیوں کی صورت میں محاصرہ کر لیا تا کہ شیر کسی سمت سے بھی کیوں نہ آئے انہیں اطلاع ہو جائے۔ دن بھر انہوں نے اپنے اوزاروں کو چمکا کر اس پر دھار رکھ لی تھی۔ بلم'

کلہاڑیوں اور درانتیوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی تھی۔

رات کے کوئی دو بجے کا عمل رہا ہو گا جب انہوں نے جنگل کی طرف سے شیر کے غرانے کی آوازیں سنی تھیں۔ تھوڑی دیر تک یہ آوازیں سنائی دیتی رہی پھر ہر طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ نوجوان اس آواز کو سنتے ہی محتاط ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کے کان اب بھی باہر لگے ہوئے تھے۔ آدھا گھنٹا گزر گیا۔ لیکن شیر کی آواز دوبارہ سنائی نہ دی لوگوں کا خیال تھا کہ شاید شیر کسی اور طرف نکل گیا ہو گا مگر اس وقت انکے دل دہل اٹھے جب دوسری بار شیر کی خوفناک گرجدار آواز انہیں بہت قریب سے اس حصے کی طرف سے سنائی دی جو خالی کر دیا گیا تھا اس کے بعد پھر کوئی آہٹ نہ سنائی دی گاؤں والے تمام رات جاگتے رہے۔ صبح کو پوپھٹنے کے بعد وہ باہر نکلے اور اپنے اپنے مکانوں کی طرف جانے لگے۔ رحمت دین کا جوان بھتیجا عمر جس کی چوبیس سال کے لگ بھگ تھی اپنے دوست شام لال کے ساتھ ہنستا بولتا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ دونوں قریب قریب کے مکان میں رہتے تھے۔ رحمت دین کے بھتیجے کے ہاتھ میں ایک وزنی کلہاڑی تھی۔ شام لال نے بلم اٹھا رکھا تھا۔ دونوں جب اپنے گھروں کے قریب پہنچے تو عمر کے مکان کے دروازہ ٹوٹا ہوا ملا۔ ابھی وہ ٹوٹے ہوئے دروازے کو دیکھ کر پوری طرح چونکنے بھی نہ پائے تھے کہ آدم خور غالباً" ساری رات عمر کے مکان میں چھپا بیٹھا تھا بجلی کی تیزی کے ساتھ ٹوٹے دروازے کی اوٹ سے نمودار ہوا اور ایک ہی ہلے میں آناً" فاناً" عمر کو گلے سے دبوچ کر جست لگاتا جنگل کی طرف بھاگ گیا۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور غیر متوقع طور پر پیش آیا تھا کہ شام لال ہکا بکا رہ گیا پھر جب اسے عمر کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے چلانا شروع کر دیا ——— گاؤں والوں کو اس حادثے کا علم ہوا تو اپنے اپنے ہتھیار سنبھال کر جنگل کی طرف دوڑ پڑے۔ عمر کی بوڑھی ماں جو اس واقعے کے سنتے ہی اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھی بری طرح پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ دوسری عورتوں نے اسے بمشکل سنبھالا۔

عمر کے جسم سے ٹپکتے خون کے تعاقب میں جب گاؤں والے جنگل میں داخل ہوئے تو انہیں عمر کی نوچی کھسوٹی لاش ایک جگہ لمبی لمبی گھاس کے درمیان اوندھے منہ پڑی ہوئی مل گئی۔ اس کا پورا جسم خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ

درندے نے اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے مگر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہیں کھائی تھی۔ شام لال کو اپنے عزیز دوست کی موت کا اتنا صدمہ تھا کہ وہ لوگوں کے سمجھانے کے باوجود گھنے جنگل میں شیر کو تلاش کرنے پر بضد رہا۔ کچھ دوسرے جوانوں نے بھی اس بات کی تائید کی اور کہا کہ رات کے اندھیرے کے بجائے دن کے اجالے میں آدم خور سے نپٹنا زیادہ آسان ہو گا چنانچہ پچاس آدمیوں پر مشتمل ایک ٹولی اس موذی درندے کا کھوج لگانے کے لئے گھنے جنگل میں گئی۔ دوسرے لوگ عمر کی لاش کے ٹکڑے اٹھا کر واپس لوٹ آئے۔ شام ہونے سے کوئی دو گھنٹے پیشتر شام لال کی پارٹی بھی واپس آ گئی انہوں نے جنگل کا ایک وسیع علاق چھان مارا تھا لیکن آدم خور کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

عمر کی جوان موت کے دوسرے ہی دن ریاست کی طرف سے مقرر کردہ شکاریوں کی ایک جماعت جو آٹھ افراد پر مشتمل تھی۔ گاؤں آ کر اسی ڈاک بنگلے میں مقیم ہوئی جہاں اشوک اور رامو نے قیام کیا تھا شکاریوں کی آمد سے گاؤں والوں کی کچھ ڈھارس بندھی۔ شکاریوں نے گاؤں والوں کو اس بات کا اطمینان دلایا کہ آدم خور ان کی موجودگی میں آبادی کا رخ نہیں کرے گا۔

سات روز تک کوئی خاص واقعہ رونما نہ ہوا۔ شکاریوں نے یہ انتظام کیا تھا کہ ان کی جماعت کے دو افراد رات گاؤں والوں کے ساتھ گزارتے۔ چار شکاریوں پر مشتمل ٹولی ندی کے کنارے سر شام سے اس مچان پر جا بیٹھتی جو اشوک کے لئے تیار کی گئی تھی باقی دو افراد ڈاک بنگلے پر رہتے۔ ان سات دنوں میں شکاریوں کی جماعت نے ہر وہ طریقہ اور حربہ استعمال کر ڈالا جو کسی آدم خور کو مارنے کے لئے موثر ثابت ہوتا ہے لیکن نہ تو اس عرصے میں شیر نے ان جانوروں پر ہاتھ صاف کیا جو اسے دعوت دینے کی خاطر مختلف مقامات پر باندھے گئے اور نہ ہی اس مدت میں جنگل کی طرف سے اس کی کوئی آواز سنائی دی۔

اس خیال سے کہ شیر کسی اور طرف نکل گیا ہے گاؤں والوں نے اپنے اپنے مکانوں میں سونا شروع کر دیا۔ شکاریوں کی موجودگی نے بھی انہیں بڑی حد تک مطمئن کر دیا تھا۔ پھر بھی چار آدمی باری باری ان دونوں شکاریوں کے ساتھ رات کو ڈیوٹی

دیتے تھے جو گاؤں میں رات گزارتے تھے۔

یہاں ایک بات یہ بھی بتا دینی نہایت ضروری ہے کہ مسلمانوں کے گنے چنے مکانات ہندوؤں کے مکان سے الگ تھلگ اور گاؤں کی آبادی والے علاقے میں مغربی حصے میں واقع تھے۔ یہ حصہ دوسرے حصے کے نسبت جنگل سے زیادہ قریب تھا۔ چنانچہ گاؤں پر تعینات دونوں شکاری اس طرح پہرہ دیتے تھے کہ ایک پارٹی مغربی حصے میں ڈیوٹی دیتی تھی اور دوسری پارٹی اس راستے پر چوکنی رہتی تھی جو ندی کی سمت سے گاؤں کو آتا تھا۔ شمال اور جنوب کا علاقہ چونکہ میدانی تھا اس لئے ادھر سے شیر کے حملہ آور ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

آٹھویں روز ایک ایسا حیرت انگیز واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف گاؤں والوں کو انگشت بدنداں ہونے پر مجبور کر دیا بلکہ شکاریوں کی جماعت بھی بری طرح حیرت زدہ رہ گئی۔ اس رات جو شکاری مغربی حصے پر دو آدمیوں کے ساتھ موجود تھا وہ حسب معمول باتوں میں مصروف تھا۔ نصف رات گزر جانے کے بعد مشرقی حصے کی طرف سے شور و غل کی آواز سنائی دی اس کے ساتھ ہی شیر کی خوفناک چیخ کے ساتھ فائر کی ایک آواز بھی گونجی۔ مغربی حصے پر تعینات شکاری یہ سوچ کر کہ شاید اس کے ساتھی نے شیر کو مار لیا ہے اپنے دونوں آدمیوں کے ساتھ باہر نکلے اور دوڑتے ہوئے اس حصے میں آ گئے جہاں ان کے ساتھی موجود تھے لیکن اس وقت ان تینوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دوسری پارٹی کو بڑے آرام سے اپنی پناہ گاہ میں گپ شپ لڑاتے دیکھا۔ وہاں شور مچانے والوں کا بھی کوئی وجود نہیں تھا۔

"یہ فائر کی آواز کیسی تھی؟" پہلے شکاری نے اپنے دوسرے ساتھی سے دریافت کیا۔

"فائر کی آواز۔ میں نے تو کوئی آواز نہیں سنی۔" دوسرے شکاری نے تعجب سے جواب دیا۔

"میں نے شیر کی آواز اور لوگوں کا شور و غل بھی سنا تھا۔" پہلا شکاری بڑی سنجیدگی سے بولا۔ اس کے بیان کی تصدیق ان دونوں نوجوانوں نے کی جنہیں گاؤں کی طرف سے تعینات کیا گیا تھا۔ "یقیناً" یہ تمہارا وہم ہے یا پھر تمہارے کان بجے ہوں

گے۔" دوسرے شکاری نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ اس کے ساتھ جاگنے والے گاؤں کے دونوں نوجوان بھی زیر لب مسکرا دیئے تھے لیکن پھر اچانک وہ سارے کے سارے چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس بار شیر کی خوفناک دھاڑ مغربی حصے کی طرف سے سنائی دی تھی۔ دونوں شکاریوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اپنے ساتھیوں کو لے کر بھاگتے ہوئے مغربی حصے کی طرف آ گئے لیکن یہاں بھی انہیں آدم خور کہیں نظر نہ آیا تاہم اتنا ضرور تھا کہ جب پارٹی کے افراد نے دو مکانوں کے دروازے ٹوٹے ہوئے دیکھے اور اندر داخل ہوئے تو ان دونوں مکانات کے اندر انہیں سات مسلمان مرد اور عورتوں کی مسخ شدہ لاشیں ملی تھیں۔ باہر نکل کر ٹارچ کی روشنی میں جب شکاریوں نے زمین کا جائزہ لیا تو آدم خور کے پنجوں کے نشانات انہیں بہت نمایاں نظر آئے لیکن سوال یہ تھا کہ جب پہلی بار آدم خور کی آواز مشرقی حصے کی طرف سنائی دی تو وہ شکاریوں کو نظر آئے بغیر مغربی حصے کی طرف کس طرح آ گیا اور پھر سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ شیر کی خوفناک آواز سننے کے باجود گاؤں کا کوئی دوسرا آدمی بیدار کیوں نہیں ہوا۔ ان سات مرنے والوں نے بھی کسی قسم کا کوئی شور و غل نہیں مچایا تھا۔ لاشیں جس انداز میں پائیں گئیں تھیں اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ خون آشام درندہ نہایت چالاکی سے وہاں آیا اور اس طرح ان لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر چلتا بنا کر ایک دوسرے کو کان و کان خبر تک نہ ہو سکی۔ دروازہ ٹوٹنے کی آواز سے بھی وہ بیدار نہیں ہو سکے تھے۔

گاؤں کے ان چار نوجوانوں نے جو دونوں شکاریوں کے ساتھ رات کی ڈیوٹی پر فائز تھے جب گاؤں کے دوسرے افراد کو جگا کر اس خونیں واقعے کی اطلاع دی تو پوری بستی میں کہرام مچ گیا۔ سب ہی کے چہرے خوف و دہشت سے زرد ہو گئے۔ اس خیال سے کہ آدم خور نے اپنی سات روز کی غیر حاضری کی کسر ایک ہی رات میں پوری کر دی تھی وہ خوف و ہراس سے کانپنے لگے۔ دونوں شکاریوں نے اسی وقت ڈاک بنگلے پہنچ کر اپنے باقی دو ساتھیوں کو اس حادثے کی اطلاع دی پھر وہ چاروں اسی وقت آدم خور کے قدموں کے نشانات کا تعاقب کرتے ہوئے جنگل کی طرف روانہ ہو

گئے۔ گاؤں والے مرنے والوں کے غم میں شریک ہو کر رونے دھونے لگے۔

دوسری صبح ان ساتوں لاشوں کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ شکاریوں کی ٹولی جو رات کو شیر کے تعاقب میں گئی تھی جب دن چڑھے واپس لوٹی تو ان کی تعداد صرف سات تھی آٹھواں شکاری جو مسلمان تھا ان میں موجود نہیں تھا۔ شکاریوں کے چہرے بھی اترے اترے نظر آ رہے تھے۔ گاؤں والوں کے اصرار پر جب ایک انگریز شکاری مسٹر رچرڈ نے انہیں آٹھویں شکاری کا حال سنا دیا تو سب ہی کے چہرے مارے حیرت اور خوف کے زرد پڑ گئے۔

رچرڈ کا بیان تھا کہ جب رات کو چاروں شکاری جنگل کی طرف آئے اس وقت وہ اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ مچان پر بیٹھا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے آدم خور کی کارستانی سن کر وہ سب متفقہ طور پر اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ اسی وقت گھنے جنگل میں شیر کا تعاقب کیا جائے چنانچہ وہ آٹھوں شیر کے قدموں کے تازہ نشانات کا تعاقب کرتے ہوئے جنگل میں اس جگہ تک آ گئے جہاں شیر کے قدموں کے نشان لمبی لمبی جنگلی گھاس میں جا کر غائب ہو گئے تھے۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے وہ موذی درندہ گھاس میں کہیں روپوش ہو اور اچانک تاریکی میں حملہ آور ہو جائے ہم نے اپنی رائفلیں پوزیشن میں لے رکھی تھیں اور ایک ایک قدم بڑی احتیاط اور خاموشی سے اٹھا رہے تھے مبادا کہ آہٹ پا کر آدم خور اپنی آرام گاہ سے نکل کر کسی دوسری طرف فرار ہو جائے۔ ہم نے اشاروں اشاروں میں ایک دوسرے کو یہ پروگرام بتایا کہ اسی طرح آگے پیچھے چلتے ہوئے جنگلی گھاس والے ٹکڑے کو چاروں اطراف سے گھیر لیا جائے تاکہ شیر کے فرار کی راہیں مسدود ہو کر رہ جائیں۔ اس وقت ہم اس طرح کھڑے تھے کہ ہماری پشت ایک دوسرے کی طرف تھی اور نظریں جنگل کی طرف۔ جس وقت ہم نے گھاس والے ٹکڑے کو گھیرنے کا پروگرام بنایا اس وقت تقریباً سب ہی افراد بہت قریب آ گئے۔ مسلمان شکاری جس کا نام کیپٹن نواز تھا ہمارے درمیان میں اس طرح پھنسا کھڑا تھا کہ اگر کوئی زہریلا سانپ بھی اس تک رینگتا ہوا پہنچنے کی کوشش کرتا تو ہماری ٹانگوں کو مس کئے بغیر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پروگرام ایک دوسرے کو سمجھانے کے بعد ہم جیسے ہی ایک قطار کی صورت میں آئے لمبی گھاس میں کوئی

بھاری جانور یک لخت ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور ہم نے یہ سمجھ کر آدم خور ہے بے دریغ اس پر فائر جھونک مارے۔ وزنی جانور جو بھاگنے کے ارادے سے پلٹا تھا ایک ساتھ چھ گولیاں کھا کر کوئی آواز نکالے بغیر ہی گھاس میں الٹ گیا۔ ہم نے جلدی سے ٹارچ روشن کی تو معلوم ہوا کہ جس کو ہم آدم خور سمجھ بیٹھے تھے۔ وہ دراصل چتیل تھا جو ہماری سن گن لینے کے بعد بوکھلا کر بھاگنے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ چتیل کو وہیں چھوڑ کر جب ہم نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ کیپٹن نواز ہم میں نہیں ہے۔ ٹارچیں دوبارہ روشن کی گئیں تو گھاس کی مخالف سمت زمین پر تازہ خون کے چھینٹے نظر آئے ہم نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس طرف کا رخ کیا اور کچھ دور جا کر کیپٹن نواز کی لاش کو پا لیا جو خار دار جھاڑیوں میں الجھی پڑی تھی۔ آدم خور نے اپنے خونیں دانت اس کی گردن میں اس قدر سختی سے گڑ-تھے کہ گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی اور سر ایک طرف کو جھول گیا تھا۔ مرنے کے بعد بھی کیپٹن نواز کے ہاتھ میں اس کی اعشاریہ پانچ سو کی جرمن ساخت کی وہ رائفل بڑی مضبوطی سے دبی تھی جس کو استعمال کرنے کا موقع اس بدنصیب کو نہیں مل سکا تھا۔

رچرڈ اپنے آٹھویں ساتھی کی لاش کو ڈاک بنگلے پر چھوڑ کر گاؤں والوں کو تجہیز و تکفین کی غرض سے بلانے آیا تھا جس کا بندوبست فوراً کر دیا گیا۔ لیکن اس حادثے نے گاؤں والوں کو اس درجہ خوفزدہ کر دیا کہ وہ مردہ بدست زندہ کی مصداق بن کر رہ گئے تھے۔ شکاریوں نے ان کے چہروں سے ان کے دلوں کی کیفیت کا اندازہ لگایا تو یہ دلاسا دے کر ڈاک بنگلے چلے گئے کہ بہت جلد وہ اس خون آشام درندے کا صفایا کر کے گاؤں والوں کو اس موذی درندے سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا دیں گے۔ انہوں نے اس بات کا وعدہ بھی کیا تھا کہ شام ہونے سے پہلے پہلے وہ اپنا کیمپ گاؤں میں منتقل کر لیں گے اور رات گاؤں والوں کے درمیان رہ کر گزاریں گے تاکہ شیر کو مزید لوگوں کو ہلاک کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

رات آئی تو ساتوں شکاری حسب وعدہ گاؤں میں آ گئے۔ ان لوگوں نے اسی مکان میں قیام کیا جس میں گزشتہ رات آدم خور نے سات آدمیوں کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا تھا۔ گاؤں والوں نے اس یقین دہانی کے باوجود کہ انہیں کسی قسم کا کوئی خطرہ

پیش نہیں آئے گا شکاریوں کے ساتھ رات گزارنے کا اصرار کیا تھا۔ کچھ لوگوں کو عورتوں بچوں اور بوڑھوں کی نگرانی پر معمور کر دیا گیا اور مکانوں کے درمیان والے میدان میں لکڑیاں جمع کر کے الاؤ روشن کر دیا گیا۔ شکار پارٹی کے افراد نے رات گزارنے کی خاطر گاؤں والوں سے باتیں شروع کر دی تھیں اور سابقہ اموات کے بارے میں تفصیل دریافت کر رہے تھے ہر چند کہ یہ طریقہ کسی خون آشام درندے کے شکار کے اصول کے منافی تھا لیکن گزشتہ رات کے حادثے نے شکاریوں کو بھی اندرونی طور پر حیرت زدہ کر رکھا تھا۔

رچرڈ جو ایک مانا ہوا شکاری تھا اس وقت سب سے الگ تھلگ بیٹھا بڑی سنجیدگی سے اس موذی درندے کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے ایک ہی رات میں آٹھ آدمیوں کو نہایت چالاکی اور مکاری سے لقمہ اجل بنا دیا تھا۔ رچرڈ سے کچھ فاصلے پر کریم نامی ایک نوجوان بیٹھا بڑی توجہ سے اس انگریز شکاری کے چہرے کو تکے جا رہا تھا اچانک وہ کچھ سوچ کر اٹھا اور رچرڈ کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"کیوں ---- -- تم کو ڈر معلوم پڑتا" رچرڈ نے نوجوان کو دیکھ کر بڑی ہمدردی اور دوستانہ آواز میں دریافت کیا۔

"نہیں صاحب ------- میں کچھ اور سوچ رہا تھا" کریم نے دبی آواز میں جواب دیا۔

"کریم ------ گھبراؤ مت۔ ہم شیر کو جرور مارے گا" رچرڈ نے ٹوٹی پھوٹی اردو زبان میں کریم کو یقین دلانے کی کوشش کی پھر اپنا بجھا ہوا پائپ دوبارہ جلا کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔

"صاحب۔ "کریم نے کچھ توقف کے بعد سرگوشی کی۔" "کیا آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اشوک بابو کی موت کے بعد سے شیر نے جتنے آدمیوں کو شکار کیا ہے وہ سارے کے سارے ہی ذات کے مسلمان تھے۔"

"اتفاق ہو سکتا۔ کوئی بات نہیں" رچرڈ نے کریم کی بات کا مفہوم نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"لیکن صاحب ------ کیا آپ نے کبھی پہلے بھی کسی شیر کو مرنے کے بعد

دوبارہ زندہ ہوتے دیکھا ہے۔"

"تم کیا بولنا مانگتا جوان" رچرڈ اس بار سنجیدہ تھا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ یقیناً" کوئی بھوت ہے جو گاؤں کے مسلمانوں کے پیچھے پڑ گیا۔"

"بھوت ------ ہو ہو .... نان سنس" رچرڈ نے قہقہہ لگایا پھر لاپرواہی سے شانے اچکا کر پائپ پینے میں مصروف ہو گیا۔

کریم نے انگریز شکاری کو قہقہہ لگاتے دیکھا تو اٹھ کر دوسرے لوگوں کے پاس چلا گیا لیکن اس کی آنکھوں میں جو اضطرابی کیفیت موجود تھی وہ اس بات کی ترجمانی کر رہی تھی کہ وہ کسی ذہنی الجھن میں مبتلا ہے۔

رات کے کوئی ایک ڈیڑھ کا وقت ہو گا جب کھلے میدان کی طرف سے کچھ آہٹ سنائی دی اور سارے لوگ چپ ہو گئے۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی دبے قدموں قریب آ رہا ہو۔ شکاریوں نے بڑی پھرتی سے اپنی رائفلیں سنبھالیں پھر اٹھ کر دروازے کے قریب آ گئے انہوں نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا جو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اسی طرف آ رہا تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے اس بوڑھے اجنبی کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا جو اتنی رات گئے اس قدر بے خوف انداز میں نہ جانے کہاں سے آ رہا تھا۔ پھٹے پرانے مگر سفید کپڑوں میں ملبوس وہ کچھ عجیب پر اسرار لگ رہا تھا۔ سر کے بال بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ لمبی داڑھی کے روئی کے گالوں جیسے نرم بال اس کے سینے پر لہرا رہے تھے۔ عمر کے اعتبار اور جسمانی حالت سے وہ بہت ضعیف اور لاغر نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ نورانی تھا اور اس کے ہاتھ میں موٹے موٹے دانوں کی ایک تسبیح تھی۔ کچھ لوگوں نے اسے کوئی راہ بھٹکا ہوا مسافر سمجھ کر اندر بلا لیا پھر جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

بوڑھا اجنبی اندر آ کر کسی سے کوئی بات کئے بغیر زمین پر بیٹھ گیا اور یوں کانپنے لگا جیسے کوئی لمبی مسافت طے کرنے کے بعد وہاں تک پہنچا ہو۔ کمرے میں موجود شکاری دوبارہ اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے لیکن گاؤں کے نوجوان بدستور اس بوڑھے کو دیکھ رہے تھے جو آنکھیں بند کئے اور گردن جھکائے اپنے ہاتھ سے تسبی کے دانوں کو گھما رہا تھا۔

"تم کون ہو بابا۔" ایک نوجوان نے بوڑھے سے پوچھ لیا۔

"مسافر ————" بوڑھے نے آنکھیں کھول کر نوجوان کو دیکھا پھر نحیف آواز میں بولا۔ "راہ بھٹک گیا تھا۔ ادھر روشنی دیکھی تو رات گزارنے کی غرض سے آ گیا۔"

"کہاں جانا تھا تمہیں۔" نوجوان نے دوسرا سوال کیا۔

"میرے بارے میں کوئی غلط رائے مت قائم کرو" بوڑھا آہستہ سے بولا "صبح تک یہاں پناہ لینے کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔"

"پر تم رہنے والے کہاں کے ہو" ایک دوسرے نوجوان نے بوڑھے کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے قدرے خشک لہجے میں پوچھا۔

قلندر اپنی دنیا خود بناتے ہیں۔ بوڑھے نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا پھر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ "کیا اتنی رات کو جنگل کے قریب سے گزرتے ہوئے تمہیں کوئی خوف نہیں محسوس ہوا۔" ایک ہندو نے بوڑھے کے قریب آتے ہوئے سوال کیا لیکن بوڑھا بدستور گردن جھکائے بیٹھا ہانپتا رہا یوں لگا جیسے اس نے نوجوان کا سوال سنا ہی نہ ہو یا پھر جان بوجھ کر نظر انداز کر گیا ہو۔

کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی اس اجنبی کو حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک اس حصے سے شور و غل کی آواز سن کر سب افراد حیرت سے اچھل پڑے جدھر عورتوں کو رکھا گیا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ باہر نکل کر اس شور شرابے کا مطلب دریافت کرتے شیر کی خوفناک گرج اتنی زور سے سنائی دی کہ زمین کا سینہ تک دہل اٹھا۔ شکاری تیزی سے اٹھ کر دروازے کی طرف لپکے۔ گاؤں کے دوسرے لوگوں نے جو شکاریوں کے ساتھ وہاں موجود تھے اپنے اپنے کلہاڑے اور دوسرے ہتھیار سنبھال لئے۔ رچرڈ نے سب سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور ٹارچ روشن کئے باہر آ گیا۔ دوسرے شکاری بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل کر اس طرف دوڑنے لگے جدھر سے شیر کی گرجدار آواز سنائی دی تھی۔ گاؤں کے لوگ بھی اپنے اپنے ہتھیار لئے شکاریوں کے ساتھ تھے۔ عورتوں والے مکانات کے قریب پہنچ کر انہوں نے جو منظر دیکھا وہ بڑا ہی خوفناک تھا اس بار آدم خور نے ایک مسلمان لڑکی کو

اپنی درندگی کا شکار بنا ڈالا تھا جو رفع حاجت کی غرض سے باہر نکلی تھی شیر نے اس پر اچانک حملہ کر کے پلک جھپکتے میں چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ جن عورتوں نے اس خونیں منظر کو دیکھا وہ خوف سے چلانے لگیں۔ آدم خور عورتوں کی چیخ و پکار سن کر بڑے غصے میں گرجا پھر ایک ہی جست میں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

بد نصیب لڑکی کی لاش زمین پر خون میں لتھڑی پڑی تھی۔ شیر نے پہلے ہی حملے میں بھرپور پنجہ مار کر اس کے پیٹ کو پھاڑ دیا تھا چنانچہ انتڑیاں ابل کر باہر آ گئی تھیں گاؤں والوں نے اس منظر کو دیکھا تو دہشت کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ شکاریوں نے اسی وقت موذی درندے کے تعاقب کا پروگرام بنایا۔ گاؤں کے کچھ سر پھرے نوجوان ان کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئے۔ لڑکی کے ورثا دھاڑیں مار مار کے رونے میں مصروف تھے۔ رچرڈ نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں لوگوں کو گھروں کے اندر بند ہو کر بیٹھنے کا مشورہ دیا مبادا کہ عیار درندہ دوبارہ اچانک نمودار ہو کر ان پر حملہ کر بیٹھے پھر وہ شیر کے قدموں کے نشانات کے تعاقب میں صرف ایک ہی قدم اٹھا پایا تھا جو لاش کے قریب موجود تھے کہ وہی بوڑھا اچانک آ گیا جسے بھاگتے وقت لوگ پیچھے کمرے میں تنہا چھوڑ آئے تھے۔ انگریز شکاری کے قریب آ کر اس نے اسے بازو تھام کر روکا پھر بڑی نحیف آواز میں بولا۔

"شیر کے تعاقب کا خیال دل سے نکال دو ———— ورنہ تم لوگ بھی مفت میں مارے جاؤ گے۔"

"وہاٹ ———— کیا بولتا ٹم اولڈ مین" رچرڈ نے بوڑھے کو نفرت سے گھور کر کہا پھر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

اچانک بوڑھے کی خوابیدہ آنکھیں مارے غصے کے جلتے انگاروں کی طرح دہک اٹھیں اس کے چہرے پر بڑی جلالی کیفیت ابھری تھی۔ ایک ثانئے کے لئے اس نے پاس کھڑے شکاریوں کو بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے دیکھا پھر چہرہ آسمان کی طرف اٹھا کر یوں تھرتھرانے لگا جیسے تشنج کی کیفیت طاری ہو گئی ہو اور کسی لمحے بھی وہ اسی عالم سرمستی یا دیوانگی میں چکرا کر زمین پر الٹ جائے گا۔ گاؤں کے بیشتر لوگ اب اسے خوفزدہ نگاہوں اور سہمے سہمے انداز میں دیکھ رہے تھے۔ رچرڈ نے بوڑھے کے چہرے

سے نظر ہٹا کر اپنے ساتھیوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا لیکن ٹھیک اسی وقت جنگل کی سمت سے آدم خور کی خوفناک گرج سنائی دی اور رچرڈ چونک اٹھا۔

گاؤں والوں نے خون آشام درندے کی دل ہلا دینے والی گرج سنی تو ان کے چہرے زرد پڑ گئے اور ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ شکاریوں نے بھی اپنے اپنے مورچے سنبھال لئے۔ آدم خور کی خوفناک غراہٹ ہر لمحے تیز ہوتی جا رہی تھی او رفتہ رفتہ آبادی سے قریب ہو رہی تھی۔ پلک جھپکتے میں سارے لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو گئے لیکن باریش بوڑھا بدستور اپنی آنکھیں سختی سے بند کئے اور آسمان کی طرف چہرہ اٹھائے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

جوں جوں آدم خور کی آواز گاؤں کے نزدیک آتی گئی لوگوں میں خوف و ہراس بڑھتا گیا۔ پھر اچانک ایک نئی کیفیت نے انہیں اور پریشان کر دیا۔ ہوا کے طوفانی جھکڑوں نے پورے گاؤں کو جیسے گھاس پھوس کے تنکوں کی طرح نیست و نابود کرنے کی ٹھان لی تھی۔ کھلے ہوئے صاف آسمان پر اچانک بجلیاں کڑکنے لگی تھیں اور اس کے ساتھ آدم خور کی غضبناک گرج ہر لمحہ گاؤں سے قریب آتی جا رہی تھی لیکن سفید لباس میں ملبوس لاغر اور نحیف بوڑھا اب بھی ان تمام باتوں سے بے نیاز میدان میں کھلے آسمان کے نیچے کھڑا اجلالی کیفیت میں بید مجنوں کے کسی ایسے پودے کی طرح کپکپا رہا تھا۔ جو طوفانی ہواؤں کے اندر پھنس کر رہ گیا ہو۔ بجلی کی چمک جب اس کے چہرے کی جھریوں کے نشیب و فراز کو اجاگر کر کے غائب ہوتی تو اس کا وجود بڑا ہولناک اور پر اسرار بن کر رہ جاتا۔

اچانک گاؤں والوں نے جو دروازے کے پیچھے پیچھے جھریوں سے کسی متوقع خوفناک حادثے کو دیکھنے کے منتظر تھے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ بلوالی کا خون آشام درندہ جو اب تک تقریباً بیس زندگیوں کو ختم کر چکا تھا میدان میں غضبناک انداز میں گرجتا ہوا نمودار ہوا اور بوڑھے کے سامنے کھڑا ہو کر انتہائی خونخوار انداز میں زمین کھرچنے لگا۔ مکان میں چھپے ہوئے شکاریوں نے بھی اس پر اسرار منظر کو حیرت سے دیکھا۔ آدم خور غضبناک آواز میں دھاڑ رہا تھا لیکن ابھی تک اسے بوڑھے پر چھلانگ لگانے یا حملہ کرنے کی جرات نہیں ہو سکی تھی۔

رچرڈ نے اس خیال سے کہ شاید دوبارہ آدم خور کو مارنے کا اس قدر سنہری موقع ہاتھ نہ لگ سکے رائفل سیدھی کی لیکن قبل اس کے کہ وہ نشانہ درست کر کے لبلبی دبا سکتا بوڑھے نے آنکھیں کھول کر سامنے کھڑے شیر کو اپنی بھیانک نظروں سے گھورا پھر گونجتی ہوئی آواز میں بولا۔

"بلبیر سنگھ کی پلید روح ———— بول اب میں تجھے کیا سزا دوں۔"

رچرڈ نے سفید ریش بزرگ کو خون آشام درندے سے یوں مخاطب ہوتے دیکھا تو جیسے اس پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ رائفل نیچی کر کے وہ آنکھیں پھاڑے اس منظر کو دیکھنے لگا۔ گاؤں کے دوسرے تمام افراد بھی بلبیر سنگھ کا نام سن کر چونک اٹھے تھے۔

آدم خور نے جو انتہائی غضبناک ہو رہا تھا۔ اپنی خون آلود نگاہوں سے بزرگ کو دیکھا پھر ایک زور دار جست لگائی لیکن درمیان میں ہی کسی غیر مرئی قوت سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑا ———— اپنی ناکامی پر وہ اس قدر بھیانک آواز میں گرجا تھا کہ زمین تک دہل اٹھی۔ شکاریوں نے جلدی سے اپنی اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں لیکن سفید باریش بزرگ کسی خوف کے بغیر اپنی جلالی نظروں سے شیر کو دیکھ رہا تھا۔

"ناپاک ———— مردود .... اتنے بیگناہوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد بھی کیا تو اپنے کئے پر شرمندہ نہیں ہے۔" بزرگ نے غصیلی آواز میں کہا۔

شیر نے اب تلملا کر زور زور سے زمین پر پنجے مارنے شروع کر دیئے تھے۔ بار بار وہ جست لگانے کی خاطر اپنے بدن کو تولتا لیکن ہر بار کوئی طاقت اسے روک لیتی اور وہ حلق پھاڑ کر غرانے لگتا۔

"نابکار ———— جہنمی .... اگر تجھے اپنی طاقت پر اتنا ہی گھمنڈ ہے تو کھل کر سامنے آ اور مجھ سے مقابلہ کر۔"

شیر نے ایک بار پھر اچھلنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہو کر زمین کھرچنے لگا۔ "لے اب اپنا انجام دیکھ۔"

اچانک شیر نے پیٹ زمین سے لگا کر پنجوں کے بل پیچھے کھسکنا شروع کیا۔

"اب موت کے ڈر سے سہم کر کہاں بھاگ رہا ہے۔" اچانک سفید ریش بزرگ

نے جھک کر زمین سے مٹھی بھر ریت اٹھائی۔ کچھ پڑھ کر اس پر دم کیا پھر غضب ناک کیفیت میں ریت شیر پر پھینک دی۔

شیر غراتا ہوا تڑپ کر اچھلا پھر زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ چند لمحوں تک وہ بڑی اذیت ناک کیفیت سے دو چار رہا پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ سفید ریش بزرگ نے ایک بار نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا پھر گردن جھکائے قدم بڑھاتے ایک سمت کو چل دیئے۔

رچرڈ اور اس کے دوسرے ساتھی شکاریوں نے جب کچھ دیر بعد شیر کے قریب آ کر اسے دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ بلوالی کا آدم خور نہ صرف یہ کہ مردہ پڑا تھا بلکہ اس کے جسم سے تعفن پھوٹ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس موذی خون آشام درندے کو مرے ہوئے چند منٹ نہیں بلکہ کئی ہفتے گزر چکے ہیں۔ رچرڈ اور اس کے ساتھیوں نے ایک دوسرے کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور دیکھتے رہے۔

گاؤں والوں نے سیفد ریش بزرگ کو تلاش کرنے کی خاطر اسی وقت پورے علاقے کا کونا کونا چھان مارا لیکن بزرگ کا کوئی پتا یا نشان نہیں ملا۔

○

شیطانی جزیرہ

میجر ڈکسن سے میری ملاقات 1891ء میں برما کے دارالخلافہ رنگون میں ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے ڈاکٹروں کے مشوروں پر رنگون میں قیام پذیر تھا۔ میری ملاقات کی بنا محض یہ تھی کہ میں بھی ذاتی طور پر مہم جو واقع ہوں۔ میجر ڈکسن کے بارے میں یہ اطلاعات مجھے اخباروں کے ذریعے مل چکی تھیں کہ وہ اپنی مہم جو طبیعت کی وجہ سے وسط افریقہ کے ایک ایسے وحشی قبیلے میں جا چکا ہے۔ جہاں سیاحوں کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھیں۔ میجر ڈکسن نے یہ خطرناک مہم حکومت کے علم میں لائے بغیر چوری چھپے سر کی تھی۔ میجر ڈکسن کی زبانی جو حالات میرے علم میں آئے وہ عجیب و غریب تھے۔ میں خود ایک مہم جو ہوں' اور میری بیس سالہ مہم جوئی کی زندگی میں ان حیرت انگیز اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات سے نہ تو میرا کبھی سابقہ پڑا اور نہ کبھی میں نے سنے۔

میجر ڈکسن کی رنگون میں موجودگی کی اطلاع پا کر میرے شوق اور تجسس نے سر ابھارا۔ میں نے پہلی فرصت میں اس سے ملنے کی کوشش کی۔ تین روز تک اس کا ذاتی معالج میری راہ میں حائل رہا لیکن چوتھے روز اس نے مجھے صرف پانچ منٹ کی اجازت دے دی۔ اس نے مجھے بڑی سختی سے تاکید کی کہ میں دوران گفتگو بوگاما قبیلے کے خونیں حادثات کے بارے میں کوئی بات نہ کروں' لہٰذا میں نے پہلی ملاقات میں ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق محض اپنا رسمی تعارف کرایا اور میجر ڈکسن کی مزاج پرسی کر کے واپس لوٹ آیا۔ رنگون میں قیام کے دوران میری اور میجر کی ملاقات بڑی مختصر رہی۔ میں اس سے غالباً" چار یا پانچ بار ملا لیکن ہر بار اس خیال سے بوگاما قبیلے کا تذکرہ گول کر گیا کہ کہیں میجر کے ذہن پر اس تذکرے سے برا اثر نہ پڑے۔ مجھے

چونکہ ایک ضروری کام تھا اس لئے میں میجر سے معلومات حاصل کرنے کی تمنا دل میں لئے اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد تقریباً" ڈیڑھ سال تک میجر ڈکسن سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔

ہماری دوسری ملاقات بھی بالکل اتفاقیہ ہوئی۔ میں ان دنوں فرانس کے ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ ایک روز جب میں دن بھر کی مصروفیات کے بعد واپس لوٹا تو میجر ڈکسن کو اپنے ہوٹل کے ڈائنگ ہال میں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ مجھے شناخت کر لے گا۔ مگر ڈکسن نے نہ صرف یہ کہ مجھے پہچان لیا بلکہ بڑی گرم جوشی سے ملا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بھی اسی ہوٹل میں مقیم ہے چنانچہ ہماری ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ میجر اب مکمل طور پر تندرست ہو چکا تھا اس لئے ایک روز میں موقع دیکھ کر بوگاما قبیلے کا ذکر چھیڑ دیا' میجر ڈکسن ایک لمحے کے لئے یوں خاموش ہو گیا جیسے اسے اس تذکرے سے کوئی شدید ذہنی الجھن ہوئی' لیکن کچھ دیر بعد وہ پرسکون ہو گیا اور میرے اصرار پر مجھے اپنے اس خطرناک سفر کے حیرت انگیز واقعات سنانے پر آمادہ ہو گیا۔ اسکی کہانی گو بہت طویل ہے مگر میں اسے مختصراً" اور خود اسی کی زبان میں بیان کرنا زیادہ پسند کروں گا۔ اس طرح آپ یہ واقعہ پڑھ کر صحیح معنوں میں لطف اندوز ہو سکیں گے۔

"30 جون 1889ء کی وہ خوش گوار صبح مجھے آج بھی بخوبی یاد ہے جب میں اور مونیکا بوگاما قبیلے کی سرحد میں داخل ہوئے تھے۔ اس جزیرے میں جانے کے سلسلے میں حکومت نے سخت پابندی لگا رکھی تھی۔ اس لئے مجھے حکومت کی نظر سے چھپ کر اپنا سفر کرنا پڑا۔ جزیرہ موزمبیق تک ہم باقاعدہ طور پر گئے پھر وہاں سے میں نے ایک موٹر بوٹ کے مالک سے رابطہ قائم کیا اور اسے اپنے اعتماد میں لینے کے بعد درخواست کی کہ اگر وہ مجھے بوگاما جزیرے تک چھوڑ آئے تو میں اسے منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہوں۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری پیشکش بخوشی قبول کر لے گا لیکن اس نے میری پیشکش ناگواری سے رد کر دی اور یہی نہیں بلکہ اس نے مجھے اپنے ارادے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش بھی کی۔ بوگاما قبیلے کے جنگلی افراد کے بارے میں اس نے مجھے جو کہانی سنائی وہ میرے لئے نئی نہ تھی۔ انہی پر اسرار اور نا قابل یقین واقعات کو

سن کر میرے شوق مہم جوئی نے مجھے اس قبیلے کے رسم و رواج کو قریب سے دیکھنے پر اکسایا تھا۔ چنانچہ ملاح کی زبانی جو واقعات میرے علم میں آئے میں نے ان پر کوئی نوٹس نہیں لیا لیکن مونیکا جو شروع ہی سے اس مہم سے کترا رہی تھی میرے سر ہو گئی۔ ایک روز اس نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"ڈکسن پیارے ------- میں نے کل رات ایک بھیانک خواب دیکھا ہے اس لئے میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ بوگاما کے سفر سے باز آ جاؤ ورنہ میری موت کا صدمہ تم تمام عمر نہیں بھلا سکو گے۔"

فوری طور پر میں نے یہی سوچا کہ شاید مونیکا کسی فرضی خواب کا سہارا لے کر مجھے میرے ارادے سے روکنا چاہتی ہے اس لئے میں اس کی سادہ لوحی پر مسکرا کر بولا۔

"تم نے اپنا خواب نہیں بیان کیا۔"

"اوہ -------" مونیکا نے ایک وفا شعار بیوی کی طرح میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم غالباً" میری بات کو اہمیت دینے کے بجائے مذاق سمجھ رہے ہو لیکن میں مقدس مریم کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں اس وقت غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی۔ کل رات میں نے دیکھا کہ ہم دونوں بوگاما قبیلے میں داخل ہو گئے ہیں۔ وحشی اور ننگ دھڑنگ جنگلیوں نے ہمیں گھیر لیا اور پھر انہوں نے تمہاری موجودگی میں مجھے برہنہ کیا۔ میرے ساتھ ذلت آمیز سلوک کیا اس کے بعد میرا جسم بھالوں سے چھلنی کر ڈالا یقین کرو پیارے ڈکسن کہ میں یہ خواب دیکھ کر چیخ اٹھی تھی۔ میں نے تمہیں رات ہی جگانے کی کوشش کی مگر تم گہری نیند میں تھے اس لئے میں نے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا تمام رات میں نے جس کرب اور بے چینی سے کاٹی ہے وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔"

مونیکا اتنا کہہ کر مجھ سے بے اختیار لپٹ گئی اور التجا کرتی رہی کہ میں اپنے سفر کا ارادہ ترک کر دوں لیکن میں نے اسے سمجھا بجھا کر ٹال دیا۔ اس روز سے مونیکا ہر وقت اداس اداس سی رہنے لگی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس نے خواب والی بات غلط نہیں کہیں لیکن میں چونکہ توہم پرست نہیں ہوں اس لئے میں نے اس کی بات کو کوئی

خاص اہمیت نہیں دی مجھے یقین تھا کہ بوگاما جزیرے سے واپسی پر مونیکا کی خوش مزاجی لوٹ آئے گی۔

میجر ڈکسن یہاں تک اپنی کہانی بیان کر کے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا غالباً اسے اپنا خوفناک ماضی یاد آ گیا تھا۔ چند ثانیے تک وہ اداس اداس نظروں سے خلا میں گھورتا رہا پھر اس نے گلاس میں بچی ہوئی جو کی بہترین شراب ایک ہی سانس میں ختم کر دی اور کچھ دیر بعد دوبارہ اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"موزنبیق میں کسی موٹر بوٹ کے حصول کے سلسلے میں میری کوششیں برابر جاری رہیں۔ تین ہفتے تک مجھے اپنے ارادے میں کامیابی نہیں ہوئی، لیکن پھر میں نے ایک لمبی رقم کے عوض ایک موٹر بوٹ حاصل کر لی۔ اسی رات میں ——— ساحلی پولیس کی نظروں سے چھپتا چھپاتا اپنی مہم پر روانہ ہو گیا۔ اپنا سامان میں نے دوپہر ہی میں موٹر بوٹ کے مالک کے ذریعے روانہ کر دیا تھا۔ اس سے میں نے یہی کہا تھا کہ میری روانگی کے بعد وہ مقامی پولیس میں لانچ کی چوری کی اطلاع درج کرا کے گلو خلاصی کرا سکتا ہے۔ خدا جانے اس نے میری روانگی کے بعد اپنے بچاؤ کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا۔

"بہر حال میں اور مونیکا بوگاما جزیرے کی سمت رواں دواں تھے مونیکا بدستور افسردہ تھی۔ اس نے میری راہ میں حائل ہونے کی کوشش ختم کر دی تھی اور خود کو حالات کے حوالے کر کے صبر و شکر کر لیا تھا ——— بوگاما جزیرہ موزنبیق سے تقریباً ایک سو بیس میل دور سمندری چٹانوں کے درمیان واقع تھا۔ لانچ میں میری ہدایت کے مطابق پٹرول کا فاضل اسٹاک چونکہ پہلے ہی سے فراہم کر دیا گیا تھا اس لئے مجھے کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔

"موزنبیق سے میری روانگی رات گیارہ بجے ہوئی تھی۔ چنانچہ چھ گھنٹے بعد میں صبح کے پانچ بجے بوگاما کے ساحل پر واقع چٹانوں کے درمیان پہنچ گیا۔ اپنی مہم جوئی کا منصوبہ چونکہ میں پہلے ہی سے مرتب کر چکا تھا اس لئے میں نے لانچ کو چٹانوں کے درمیان ایک تنگ سے راستے میں چھپا دیا جہاں دونوں اطراف گھنے درخت موجود تھے۔ پھر سفری تھیلے اٹھا کر جزیرے کی سمت روانہ ہو گیا۔ ہم دونوں کے پاس ریپڈ فائرنگ

والی اعشاریہ بائیس کی رائفلیں موجود تھیں۔ میں نے مونیکا کو بڑی سختی سے ہدایت کی تھی کہ رائفل کا استعمال اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک حالات بدترین صورت نہ اختیار کر لیں اور بچاؤ کا کوئی دوسرا راستہ باقی نہ رہے۔ میرا ارادہ تھا کہ سورج طلوع ہونے سے پیشتر کوئی ایسا محفوظ مقام تلاش کر لیا جائے جہاں چھپ کر اور قبیلے کے جنگلی لوگوں کے درمیان آئے بغیر ہم وہاں کا بغور مطالعہ کر سکیں۔

"قبل اس کے کہ میں اپنی داستان کا باقی حصہ سناؤں ان باتوں کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنکی وجہ سے بوگاما جزیرے کو قریب سے دیکھنے کے لئے بے چین تھا۔ ایک عام روایت یہ مشہور تھی کہ بوگاما قبیلے کے جنگلی لوگوں کی عمر خاصی طویل ہوتی ہے اور عمر طویل کرنے کے لئے انہوں نے ایک ہولناک رسم اپنا لی تھی جو بعد میں عقیدے کی صورت اختیار کر گئی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر نومولود بچے کو قبیلے کے سب سے معمر شخص کے خون سے غسل دیا جائے تو وہ طویل عمر حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ جب بھی وہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اس عقیدے کے مطابق قبیلے کا معمر آدمی زبردستی (اس کی مرضی کے خلاف) پکڑ کر بڑے سفاکانہ انداز میں قتل کر دیا جاتا۔ پھر اس کے خون سے نومولود کو غسل دیا جاتا۔ اس رسم کو جنگلی لوگ بڑی دھوم دھام سے جشن کی صورت میں مناتے تھے۔ دوسری بات یہ مشہور تھی کہ قبیلے میں عورتوں کا مصرف صرف اس وقت تک ضروری سمجھا جاتا جب تک ان کی جوانی برقرار رہتی۔ عمر ڈھلتے ہی انہیں ذبح کر دیا جاتا اور ان کے خون سے ان پتھروں کے بتوں کو غسل دیا جاتا تھا جنہیں جنگلی اپنا دیوتا سمجھتے تھے۔ قبیلے کے لوگوں میں شادی بیاہ کا طریقہ سرے سے رائج نہیں تھا۔ لڑکیاں جب تک سن بلوغت تک نہ پہنچ جائیں کوئی انہیں ہاتھ نہیں لگاتا تھا لیکن جب قبیلے کا معمر ترین شخص ان لڑکیوں کو بالغ قرار دے دیتا تو پھر وہ پورے قبیلے کی میراث بن جاتی تھیں۔ قبیلے کا ہر فرد ان سے زبردستی جنسی تسکین حاصل کرنے کا مجاز ہوتا تھا۔ اکثر کچھ لوگ لڑکیوں کے ساتھ پہلی بار جنسی رابطہ قائم کرنے کے سلسلے میں ایک دوسرے سے بھڑ جاتے تھے لہٰذا لڑکی کا پہلا حقدار اسے تسلیم کیا جاتا جو اپنے حریفوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا۔ اس قسم کی لڑائی کو بھی وہ جشن کی صورت میں مناتے تھے۔ جو شخص جیت جاتا تھا وہ سربلند خیال کیا جاتا لیکن

جو لوگ مرجاتے انہیں بزدل تصور کر کے ان کے جسموں کے ٹکڑے کر کے گوشت خور پرندوں اور آبی جانوروں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ باہر سے آنے والے سیاحوں اور دوسرے افراد کے ساتھ ان کا سلوک انسانیت سوز ہوتا تھا لیکن ایسے افراد کو اس وقت تک قتل نہیں کیا جاتا جب تک دیوتاؤں کی طرف سے شگون نہ مل جائے۔ غرضیکہ اسی قسم کی اور بہت ساری پر اسرار حیرت انگیز روائتیں مشہور تھیں جو میری دلچسپی کا باعث بنیں اور میں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اس سفر پر آمادہ ہو گیا۔"

میجر ڈکسن نے یہاں تک کہنے کے بعد شراب کا دوسرا پیگ خالی کیا اور پھر ایک سرد آہ بھر کر بولا۔

"اب میں دوبارہ اپنی داستان وہاں سے شروع کرتا ہوں جہاں سے چھوڑی تھی۔ لانچ کو محفوظ مقام پر چھوڑ کر میں کوئی ایسی جگہ سورج طلوع ہونے سے قبل تلاش کر لینا چاہتا تھا جہاں سے چھپ کر میں ان وحشی قبائلی درندوں کی زندگی اور ان کے عجیب و غریب رسم و رواج کا بغور جائزہ لے سکوں مونیکا میرے شانہ بشانہ چل رہی تھی لیکن اس وقت وہ بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کی گہری لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ میں اس موقع پر اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتا تھا لیکن پھر نہ جانے کیوں میں نے اس سے پوچھ لیا۔

"مونیکا ------- تم کیسی رہی ہو؟؟"

"آں -------" وہ اس طرح چونکی جیسے کچی نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ میری طرف خالی نظروں سے دیکھا پھر ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "کچھ نہیں ------- یوں ہی تکان سی محسوس ہو رہی ہے۔"

مجھے اس کے جواب پر رحم آ گیا۔ میں اس کی دلی کیفیت بخوبی بھانپ رہا تھا۔ چنانچہ سیکنڈ تک میں اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر میں نے اسے لپٹا لیا اور اس کے کپکپاتے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے لیکن افسوس ------- ابھی ہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے ہی تھے کہ مونیکا کی دلدوز چیخ سن کر میرے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہو گئیں۔ میں نے تیزی سے گھوم کر دیکھا تو مونیکا کی اضطرابی چیخ کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی۔ جزیرے پر اس وقت ہلکی ہلکی کہر باتی

تھی۔ اس کے باوجود میں ان ننگ دھڑنگ جنگلیوں کا جتھا بخوبی دیکھ سکتا تھا جو ہم سے سات آٹھ گز کے فاصلے پر نیزے تانے کھڑے ہمیں خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ ان کے مکروہ اور ہیبتناک چہرے دیکھ کر مجھے جھرجھری آ گئی۔ مونیکا مجھ سے لپٹی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"میں ان وحشیوں کی صحیح تعداد نہ جان سکا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے رائفل کے ٹریگر پر اپنی گرفت سختی سے جما لی تھی لیکن اس بات کا اندیشہ بھی مجھے پریشان کر رہا تھا کہ کیا میں رائفل کا استعمال کر سکوں گا؟ ایسی صورت میں پورا قبیلہ ہماری موجودگی سے باخبر ہو سکتا تھا اور پھر اس کے بعد وہ یقینی طور پر ہمارے اوپر ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑتے۔ میں اپنے اگلے اقدام کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ مونیکا نے جو خوفزدہ انداز میں مجھ سے لپٹی ہوئی تھی مجھے چھوڑ دیا۔ شاید اس نے جنگلی قبیلے کے افراد کو آہستہ آہستہ آگے بڑھتے دیکھ کر کوئی حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ حالات ہر لمحے مخدوش ہوتے جا رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب ہمارا انجام بھی ان لوگوں سے مختلف نہ ہو گا جو اس جزیرے پر پہلے قدم رکھ چکے تھے لیکن بعد میں ان مسخ شدہ لاشیں سڑی گلی حالت میں تیرتی نظر آئی تھیں جنہیں جہاز رانوں نے تلاش کیا تھا۔

وحشیوں کے قدم ہر لمحے سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ تعداد میں دس بارہ سے کسی طرح کم نہیں تھے۔ موت اور زندگی کا فاصلہ گھٹتا جا رہا تھا لیکن پھر اچانک میں نے ان وحشیوں میں سے تین کو تیورا کر گرتے دیکھا مونیکا نے مجھ سے پوچھے بغیر رائفل کا دہانہ کھول دیا تھا۔ تین آدمیوں کے گرتے ہی باقی افراد اچھل کر دائیں بائیں آگے ہوئے درختوں کے پیچھے لپکے مگر اس عرصے میں ایک وحشی اور ڈھیر ہو گیا۔ مونیکا نے جلد بازی کر کے حالات پر میری گرفت اس قدر کمزور کر دی تھی کہ میں بوکھلا گیا۔ ایک سیاح کی حیثیت سے میں وحشی قبائل کے رسم و رواج سے کسی قدر واقف تھا۔ اسی غرض سے میں نے مونیکا کو تاکید کی تھی کہ رائفل کا استعمال انتہائی خطرناک صورت میں کیا جائے چنانچہ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی ------- چارہ نہیں تھا کہ راہ فرار اختیار کی جائے ایک طرف تو مجھے حالات کے بگڑنے کا اندیشہ لاحق تھا۔ دوسری طرف اس بات کا افسوس بھی تھا کہ میری برسوں کی کوشش منٹوں

میں ضائع ہو رہی ہے۔ بہر حال میں نے مونیکا سے لانچ کی طرف بھاگنے کو کہا اور خود بھی بے تحاشا دوڑنے لگا۔ مونیکا کو میں نے آگے رکھا تھا کہ اگر کوئی خطرہ پیش آئے تو میں اس کی حفاظت کر سکوں۔ ناہموار زمین پر جہاں جا بجا خار دار جھاڑیاں اگی تھیں ہمارا عام حالات میں تیز رفتاری کا مظاہرہ کسی خطرے کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتا تھا لیکن اس وقت جان بچانے کے پیش نظر میں یہ خطرہ مول لینے پر مجبور تھا۔ جنگلی کہاں روپوش ہوئے تھے میں یہ نہ دیکھ سکا لیکن میرا اندازہ تھا کہ جب تک وہ قبیلے کے دوسرے افراد کو ہماری موجودگی سے باخبر کریں گے ہم ان کی دسترس سے دور جا چکے ہوں گے۔ مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ جنگلی دھماکے والے ہتھیاروں سے بہت جلد خوفزدہ ہو جاتے ہیں لیکن میری یہ خوش فہمی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔

"ہم لانچ کی طرف بے تحاشا دوڑ رہے تھے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ مونیکا کی رفتار بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی پھر اچانک میں نے اسے کراہتے ہوئے ایک جھاڑی میں الجھ کر گرتے دیکھا۔ قبل اس کے کہ میں اس کے قریب پہنچ پاتا یا اس کے گرنے کی وجہ جان سکتا میرے بائیں سمت والی جھاڑیوں سے سات آٹھ وحشی نیزے تانے سامنے آ گئے۔ ان کی آنکھوں میں نفرت جھلک رہی تھی۔ میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ مونیکا کو ان جنگلیوں سے بچانے کا فیصلہ کر کے میں نے رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کی ہی تھی کہ پشت سے آواز آئی۔

"رمیکا ------- رمیکا ------- لی اورا ------- لی اورا۔"

"گو مجھے وحشی قبائل کی بولی پر زیادہ دسترس نہیں ہے لیکن اس میں شدبد ضرور رکھتا ہوں۔ چنانچہ میں نے رمیکا اور لی اورا کے الفاظ سنتے ہی اپنی رائفل زمین پر گرا دی۔ وحشیوں نے اپنی زبان میں غالباً" مجھے یہی حکم دیا تھا۔ غرضیکہ اب جنگلی درندوں کے رحم و کرم پر تھا۔ زندگی میں وہ پہلا موقع تھا۔ جب مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ موت کا تصور کس قدر تلخ اور جان لیوا ہوتا ہے۔

"رائفل سے دستبردار ہوتے ہی مجھے اور مونیکا کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ اس کے بعد ہمیں نیزوں کے اشارے سے ایک سمت چلنے کا حکم ملا۔ تعمیل کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ وحشیوں نے ہمیں تین اطراف سے گھیر رکھا تھا۔

فرار کی راہیں مسدود ہو چکی تھی۔ اگر ہم آگے بھاگنے کی کوشش کرتے تو شاید پلک جھپکتے میں ہماری پشت نیزوں سے چھد گئی ہوتی۔ مونیکا کی حالت اس وقت قابل رحم تھی۔ وہ میرا ہاتھ تھامے وحشیوں کے نرغے میں آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک بار اس سے میری نگاہیں چار ہوئیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔

"ڈکسن پیارے! کیا تمہیں اب بھی اس بات کا احساس نہیں ہو رہا کہ جو کچھ میں نے کہا تھا کس قدر ٹھیک ہے۔"

میجر ڈکسن نے یہ الفاظ قدرے بھرائی ہوئی آواز میں ادا کئے اسے غالباً" مونیکا یاد آ گئی تھی۔ چند ثانئے تک وہ خاموش بیٹھا واقعات کی بکھری ہوئی کڑیاں یکجا کرتا رہا۔ پھر اس نے جیب سے رومال نکال کر آنکھوں کے بھیگے ہوئے گوشے خشک کئے اور گلاس کی باقی ماندہ شراب ایک ہی گھونٹ میں حلق کے نیچے اتار کر بولا۔

"میرے عزیز ------- مجھے مونیکا کی وہ حسرت ناک اداسی آج بھی یاد ہے۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی بے بسی میرے دل و دماغ پر تیر و نشتر بن کر چبھ رہی تھی لیکن میں وہ سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ وحشی قبائلیوں کے عقیدے کے مطابق مجھے یہ احساس بھی تھا کہ وہ مونیکا کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ اس کے باوجود مجھے ایک موہوم سی امید تھی کہ میں اپنے ساتھ مونیکا کو بھی کچھ عرصے تک زندہ رکھنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

"وحشیوں کے نرغے میں ہمیں قبیلے کی بستی کے درمیان کھلے میدان میں لے جایا گیا جہاں ہزاروں ننگ دھڑنگ وحشی ہمارے منتظر تھے۔ مونیکا کی گولیوں کی آواز سن کر انہیں اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ کوئی نیا دشمن ان کے جال میں پھنسنے والا ہے۔ میں ان سب لوگوں کی نگاہوں میں نفرت اور حقارت دیکھ رہا تھا۔ مونیکا نے نظریں زمین پر گاڑ رکھی تھیں۔ وہ بری طرح خائف اور سہمی سہمی نظر آ رہی تھی۔

"کھلے میدان میں لا کر ہمارے ہاتھ پاؤں اس طرح باندھ دیئے گئے کہ ہم اپنی جگہ سے ایک انچ بھی جنبش نہ کر سکتے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہمیں لانے والے بھی مجمع میں شریک ہو گئے۔ اس کے بعد دو معمر وحشی جنہوں نے اپنی ناکوں میں ہاتھی دانت کے بڑے بڑے بالے پہن رکھے تھے اور جسم کے زیریں حصے بڑے بڑے

پتوں سے چھپا رکھے تھے۔ مجمع سے نکل کر ہمارے قریب آئے اور ہمیں مشتعل نظروں سے گھورنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ اب باز پرس کا سلسلہ شروع ہو گا۔ کچھ دیر تک دونوں ہیبتناک شکل والے جنگلی مجھے اور مونیکا کو باری باری گھورتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک نے جو دوسرے کے مقابلے میں زیادہ عمر کا تھا۔ تالی بجائی' جو غالباً" کسی قسم کا اشارہ تھا۔ یہ اشارہ پا کر وہی افراد جو ہمیں گرفتار کر کے لائے تھے دوبارہ مجمعے سے نکل کر سامنے آ گئے۔ دونوں معمر وحشیوں نے اپنی زبان میں ان لوگوں سے گفتگو شروع کر دی ------- گفتگو کے درمیان بھی بولنے والے ہماری طرف گھور گھور کر دیکھتے جاتے تھے ------- جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں مجھے جنگلی قبائل کی زبان سے شدبد ہے اس لئے میں ان کی باتیں پورے طور پر تو نہ سمجھ سکا' مگر اتنا ضرور سمجھ گیا کہ ہمیں گرفتار کرنے والے ہمارے بارے میں تفصیل بیان کر رہے ہیں۔ کچھ دیر تک ان کے درمیان یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر دونوں معمر وحشیوں کے علاوہ باقی لوگ واپس پلٹ کر مجمعے کے ساتھ جا کھڑے ہوئے۔ اب وہ دونوں مجھے اور مونیکا کو دوبارہ قہر آلود نگاہوں سے گھور رہے تھے لیکن زیادہ توجہ مونیکا کی طرف تھی۔ جس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ اس نے چار وحشیوں کو جان سے مار ڈالا تھا۔"

"ڈیکا مارا ------- ریگا لیا۔ مونو ساماں (تمہاری عورت نے قتل کیا ہے وہ مجرم ہے)" زیادہ عمر والے نے براہ راست مجھ سے سوال کیا' جسے میں بمشکل سمجھ سکا۔"

"ہا مارو------ آشوریکا (میں تسلیم کرتا ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں") میں نے ٹوٹ پھوٹے لفظوں میں سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میرا جواب سن کر ان دونوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا پھر وہ مجھے اور مونیکا کو گھورتے ہوئے اپنے جتھے سے جا ملے۔ میری نگاہیں برابر ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں جو سر جوڑے کچھ آدمیوں کے ساتھ ہاتھ ہلا ہلا کر آپس میں مشورے کر رہے تھے۔ یکلخت وہ دوبارہ ہماری سمت دیکھنے لگے غالباً" وہ ہمارے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کر چکے تھے۔ ایک لمحے تک ماحول پر پر ہول خاموشی طاری رہی پھر ڈھول پیٹنے کی تیز آواز

ابھرنے لگی۔ ڈھول بجتے ہی ------- چار ہٹے کٹے وحشی خوفناک انداز میں آگے بڑھے اور انہوں نے مونیکا کو بالوں سے پکڑ کر زمین پر گرا دیا اس کے بعد ان درندوں نے بڑے ظالمانہ انداز میں اس کے بدن کے تمام کپڑے تار تار کر کے علیحدہ کر دیئے مونیکا کی کربناک چیخیں میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو منہ کے بل زمین پر آ رہا اور بے بسی سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ مونیکا دلخراش چیخوں سے مجھے مدد کے لئے پکار رہی تھی۔

"مونیکا کو برہنہ کرنے کے بعد چاروں وحشی بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس سے لپٹ کر اسے بھنبھوڑنے لگے۔ مونیکا کی چیخ رفتہ رفتہ مدھم پڑتی گئی اس کی قوت مدافعت جواب دے گئی تھی لیکن ان بے رحموں نے اس پر ترس نہ کھایا۔ ڈھول کی آواز کے ساتھ ساتھ ان چاروں کی بربریت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر جب وہ اپنے ناپاک فعل سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے اس کے روندے ہوئے بدن کے چاروں طرف ناچنا شروع کر دیا مجمع سے خوشی کے نعرے لگائے جا رہے تھے میں پتھرائی ہوئی نظروں سے وہ وحشت ناک رقص دیکھ رہا تھا اچانک ڈھول کی آواز بند ہو گئی جس کے ساتھ ہی ہر طرف موت کا سناٹا طاری ہو گیا۔

"میں نے ان دونوں معمر وحشیوں کو پھر مجمع سے نکل کر آگے بڑھتے دیکھا جنہوں نے مونیکا کے بارے میں فیصلہ کیا تھا۔ اس بار وہ نہتے نہیں تھے۔ ان دونوں وحشیوں نے ایک نظر مونیکا پر ڈالی پھر منہ آسمان کی سمت اٹھا کر اپنی زبان میں زور زور سے کچھ کہنے لگے' میں پوری بات تو نہ سمجھ سکا مگر وہ چار لفظ جو میری سمجھ میں آئے ان کا مفہوم یہ تھا کہ وہ اپنے دیوتاؤں کی شان میں کچھ الفاظ ادا کر رہے تھے۔

"میرے عزیز تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس وقت میری حالت کیا تھی۔ میری بیوی کو میری نگاہوں کے سامنے مادر زاد برہنہ کیا گیا۔ اس کا نازک بدن وحشتناک انداز میں روندا گیا مگر میں اس کی کوئی مدد نہ کر سکا اور پھر۔ اس کا خواب پورا ہو گیا .... میرے خدا کس قدر ہولناک تھا وہ منظر جب دعائیں پڑھتے پڑھتے اچانک بڑی عمر والے نے سر نیچا کر کے اپنا سیدھا ہاتھ بلند کیا اور دوسرے ہی لمحے نیزہ مونیکا کے سینے میں پیوست کر دیا۔ خون کا فوارہ اس غریب کی چھاتی سے بلند ہوا تو میں نے ہونٹ

دانتوں تلے سختی سے بھینچ کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے بعد کیا ہوا میں اسے نہ دیکھ سکا لیکن جب دوبارہ ڈھول بجنے شروع ہوئے اور وحشیوں کی چیخ پکار ابھری تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

مقدس ابن مریم کی قسم۔ اگر اس وقت میرے ہاتھ پاؤں آزاد ہوتے تو میں اپنے انجام کی فکر کئے بغیر ان درندوں پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑتا لیکن حالات نے مجھے مجبور و بے بس کر دیا تھا۔ جانتے ہو دوبارہ آنکھیں کھولنے پر میری نظروں نے کیا منظر دیکھا؟ آج بھی میں سوچتا ہوں تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ ان وحشی جنگلی درندوں نے معصوم اور بیگناہ مونیکا کا بدن سینکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک سنگدل نے اس کا سر نیزے پر اٹھا رکھا تھا اور رقص جاری تھا۔ میں اس منظر کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو گیا۔ کاش میں مرگیا ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔“

میجر ڈکسن کی آنکھیں دوبارہ ڈبڈبا آئیں۔ ماضی کی کربناک یادوں نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ میں چپ چاپ بیٹھا اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتا رہا۔ مجھے اس بات کا احساس نہ تھا کہ میں نے میجر کا ماضی کرید کر اسے روحانی کرب سے دوچار کیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی کہانی اس قدر حیرت انگیز اور پر اسرار تھی کہ میں اپنے تجسس کا گلا نہ گھونٹ سکا اور اس بات کا منتظر رہا کہ میجر کب اپنی داستان کا تسلسل دوبارہ قائم کرتا ہے۔

کمرے میں موت کا سناٹا طاری رہا۔ میجر کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے دامن پر گرتے رہے۔ وہ خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک اس کی یہ کیفیت رہی پھر اس نے رومال سے آنسو پونچھے اور اپنے لئے دوسرا پیگ تیار کرنے لگا۔ دو چار لمبے لمبے گھونٹ لینے کے بعد اس نے پہلو بدلا پھر میری طرف دیکھ کر کہنا شروع کیا۔

”مونیکا کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مجھے بھی کبھی معاف نہیں کریں گے۔ قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق مجھے ٹھکانے لگانے سے پہلے ان کا اپنے دیوتاؤں سے شگون لینا ضروری تھا۔ زندگی کی تمنا کسے نہیں ہوتی میرے دوست لیکن یقین جانو میں دل ہی دل میں برابر یہی دعا کرتا رہا تھا کہ میرا کام

بھی جلد سے جلد تمام ہو جائے۔ لیکن قدرت کو میری بے بسی کے یہ ایام چونکہ طویل کرنے مقصود تھے۔ اس لئے تین بار شگون میری تمنا کے خلاف نکلا‘ چنانچہ میں قید تنہائی میں ڈال دیا گیا۔ اکثر رات کو سوتے سوتے میں خوف سے چیخ مار کر بیدار ہو جایا کرتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے مونیکا کی روح میرے ارد گرد منڈلا رہی ہے۔ اکثر خواب کی حالت میں دیکھتا کہ وہ میرے سامنے کھڑی ہے اور ہاتھ جوڑے ملتجیانہ لہجے میں مجھ سے کہہ رہی ہے۔ ”ڈکسن میرے پیارے ڈکسن! خدا کے لئے میری بات مان لو اور بوگا جزیرے کا خیال ذہن سے نکال دو“ اور کبھی وہ پریشان ہو کر کہتی ”ڈکسن! میری روح آج بھی تمہارے لئے بے چین ہے۔ جب تک تم درندوں کی اس بستی میں جو وادی موت سے بھی بدتر ہے چھٹکارا نہیں پالیتے‘ میری روح کو سکون نہیں مل سکے گا۔“

”غرضیکہ میں بڑی کسمپرسی کی حالت میں زندہ رہنے پر مجبور تھا۔ مجھے ایک علیحدہ جھونپڑے میں رکھا گیا‘ جہاں کوئی نہ کوئی محافظ اس خیال سے ہر وقت موجود رہتا کہ کہیں میں خودکشی نہ کر لوں۔ ان وحشیوں نے مستقل طور پر میرے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے تھے۔ کھانے اور پانی کے لئے بھی مجھے ہاتھ استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کھانے کا بڑا تھال میرے سامنے لا کر رکھ دیا جاتا جسے میں زمین پر اوندھا لیٹ کر جانوروں کی طرح بمشکل کھایا کرتا تھا۔ پانی پینے کے لئے بھی مجھے یہی طریقہ اختیار کرنا پڑتا‘ پیشاب اور پاخانے کے لئے بھی مجھے باہر نہیں نکلنے دیا جاتا تھا۔ البتہ ان ظالموں نے اتنا رحم ضرور کیا کہ جب میرے کپڑے غلاظت سے لت پت ہو گئے اور جھونپڑے میں تعفن پھوٹنے لگا تو ان لوگوں نے میرا جسم بھی کپڑوں کی قید سے آزاد کر دیا تھا۔

”بائیس روز تک میں موت اور زندگی کی کشمکش سے دو چار رہا۔ اس عرصے میں مجھے ایک بار بھی آسمان دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ تاریکی میں رہتے رہتے میری بینائی بھی متاثر ہو رہی تھی اس کے علاوہ جھونپڑے کی سیلن اور گھٹن کی وجہ سے میری صحت بھی رفتہ رفتہ گرتی جا رہی تھی۔ میں تمباکو نوشی کا ہمیشہ سے شائق رہا ہوں۔ بائیس روز تک اس سے محروم رہا بہرحال تیئسویں روز مجھے جھونپڑے سے نکالا گیا۔ میرے

ہاتھ پاؤں کھول دیئے گئے تھے۔ میں یہ نہ جان سکا کہ مجھے باہر نکالنے کے لئے نیزوں سے کچوکا کیوں جا رہا ہے۔ جب میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو لڑکھڑا کر گر پڑا میرے دونوں ٹخنے پھوڑے کی مانند درد کر رہے تھے۔ بہر حال میں بمشکل اپنا توازن سنبھالتا ہوا اٹھا اور جھونپڑے سے باہر آگیا۔ تین وحشی نیزے ہاتھ میں لئے میرے ساتھ ساتھ تھے۔ مجھے اسی میدان کی طرف لے جایا گیا جہاں مونیکا کو میری نگاہوں کے سامنے عبرتناک موت نصیب ہوئی تھی۔ میدان میں اس وقت پورے جزیرے کے تمام افراد دائرے کی صورت میں جمع تھے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں ایک محافظ سے دریافت کیا۔

"میکو کارا بالو۔ (مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔)"

"ابش ———— ابش (خاموش رہو۔)"

"وحشیوں میں سے ایک نے مجھے حقارت سے گھورتے ہوئے جواب دیا پھر اتنا شدید دھکا مارا کہ میں منہ کے بل زمین پر آگیا اور پھر مجھے دوبارہ اٹھا کر کھڑا کیا گیا اور نیزوں کے اشارے سے آگے بڑھنے کو کہا گیا۔ میں نے ایک سرد آہ بھری اور لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

مجمع میں مجھے سب سے آگے لے جایا گیا لیکن وہاں پہنچ کر میں نے جو کچھ دیکھا وہ انتہائی انسانیت سوز تھا۔ قبیلے کا وہی سب سے معمر شخص جس نے مونیکا کے سلسلے میں فیصلہ صادر کیا تھا اس وقت میری آنکھوں کے سامنے فضا میں اوندھا معلق تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں ان چاروں بلیوں سے جکڑ کر باندھ دیئے گئے تھے جو اسے سنبھالے رکھنے کے لئے گاڑی گئی تھیں۔ کسی کمان کی طرح وہ جھول جھول کر چلا رہا تھا۔ زمین سے اس کا جسم تقریباً" سات فٹ اونچا تھا۔ اس کے معلق جسم کے عین نیچے ایک بڑا سا لکڑی کا ہودا رکھا ہوا تھا۔ ہودے کے قریب ہی ایک نومولود بچہ پتوں کے ڈھیر پر موجود تھا۔ میں سمجھ گیا کہ آج اس نومولود کو اس معمر شخص کے خون سے غسل دینے کی شیطانی رسم ادا کی جائے گی۔ ایک طرف میرے دل میں اس رسم کے خلاف بغاوت کا لاوا ابل رہا تھا لیکن دوسری طرف مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ اس ذلیل بوڑھے کو اپنے کئے کی سزا ملنے والی ہے جس نے مونیکا کے ضمن میں کسی

ہمدردی یا رحم کا اظہار نہیں کیا تھا۔

"میں نے اس خونیں رسم کے بارے میں جو کچھ سن رکھا تھا وہ حرف بحرف درست ثابت ہوا۔ میرے وہاں پہنچنے کے بعد حسب دستور دو بوڑھوں نے سب سے پہلے بلند آواز میں دیوتاؤں سے مخاطب ہو کر اپنی زبان میں کچھ کہا پھر ڈھول بجنے لگے۔ ڈم ڈم۔ ڈما۔ ڈم۔ ڈم کی دل ہلا دینے والی آواز کے ساتھ ساتھ وحشیوں کا شیطانی رقص بھی تیز ہونے لگا۔ ننگ دھڑنگ مرد فضا میں معلق معمر شخص کے گرد دیوانوں جیسے انداز میں اچھل اچھل کر نہ جانے کیا گیت گا رہے تھے۔ شیطانی رقص کا یہ سلسلہ کوئی آدھے گھنٹے جاری رہا۔ وحشیوں کے جسم جو پسینے میں شرابور تھے دھوپ میں یوں چمک رہے تھے جیسے تیل میں نہائے ہوئے ہوں۔ اچانک ڈھول بجنے کی آوازیں بند ہو گئیں جس کے ساتھ ساتھ شیطانی رقص کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ قبیلے کے تمام افراد پھر دائرے کی صورت میں دور دور ہٹ گئے۔ معمر شخص کے پاس صرف چار آدمی رہ گئے تھے۔ میں دم بخود کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ یکلخت ایک جنگلی نیزا لہراتا ہوا آگے بڑھا اور بڑی ماہرانہ چابکدستی سے اسے معلق وحشی کے شکم میں گھونپ کر تیزی سے باہر نکال دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس بد نصیب کے شکم سے خون کا نلکا جاری ہو گیا۔ وہ دردناک انداز میں چیخ رہا تھا۔ اس کا کمان کی طرح جھولتا ہوا جسم بار بار جھٹکے لینے لگا۔ وہ تشجنی کیفیت سے دو چار تھا۔ اس کی خوفناک نظریں خود اپنے ہی جسم سے ابلتے ہوئے خون پر جم کر رہ گئی تھیں جو نیچے رکھے ہوئے ہودے میں جمع ہو رہا تھا۔

"چاروں وحشی نیزے فضا میں لہرا لہرا کر اس کے گرد ناچنے لگے۔ ناچتے ناچتے وہ اچانک اس معمر شخص پر حملہ آور ہو جاتے اور ہر نئے زخم سے جہاں نیزا پیوست کیا جاتا خون کا فوارہ ابل پڑتا۔ بلیوں سے بندھے ہوئے وحشی کے چہرے کی رنگت بڑی تیزی سے زرد پڑ رہی تھی۔ اس کی کربناک چیخوں میں بھی اب وہ پہلی جیسی شدت باقی نہ رہی تھی۔ یہ خوفناک سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک معمر وحشی کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک ہودے میں منتقل نہ ہو گیا پھر ان درندوں نے اس نومولود بچے کو اٹھا کر خون سے بھرے ہوئے ہودے میں ڈال دیا۔ جنگلی عورتوں نے اپنی زبان

میں خوشی کا گیت شروع کر دیا۔

"جب بچے کو غسل دیا جا چکا تو معمر وحشی کی اکڑی ہوئی لاش نیچے اتاری گئی۔ وہ چاروں وحشی جو وہاں پہلے سے موجود تھے۔ کسی بات پر تکرار کرنے لگے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اچانک نیزا تان کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کچھ دیر تک وہ اونچی آواز میں ایک دوسرے سے لڑتے رہے پھر ان میں سے تین وحشی جو چوتھے کے مقابلے میں کمزور نظر آ رہے تھے خاموش ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ چوتھے جنگلی نے غالباً" اپنی فتح کے اعلان کے طور پر ایک نعرہ بلند کیا پھر نیزا دور پھینک کر اپنی کمر سے وہ خنجر کھولا جو ایک رسی سے بندھا ہوا تھا۔ خنجر نکال کر اس نے بڑے مہذب انداز میں تین بار بوسہ دیا۔ گھوم کر مجمعے کی طرف دیکھا پھر اکڑی ہوئی لاش پر جھک گیا۔ میں اس کا ہاتھ تیزی سے متحرک دیکھ رہا تھا۔ دوبارہ جب وہ کھڑا ہوا تو اس کے ہاتھ میں معمر وحشی کی کھوپڑی جھول رہی تھی جسے اس نے بڑی بے دردی کے ساتھ لاش سے جدا کر لیا تھا اور اب فاتحانہ انداز میں اسے سر سے بلند کئے مجمع کی طرف جا رہا تھا۔

یہ خونیں رسم پوری ہو جانے کے بعد مجھے واپس لا کر اسی جھونپڑے میں ڈال دیا گیا۔ میرے پاؤں کو رسیون سے دوبارہ جکڑ دیا گیا۔ اس رات میں عجیب و غریب اور بھیانک خواب دیکھتا رہا۔ صبح بیدار ہوا تو میرے سر میں شدید درد تھا بخار کی تپش سے میرا جسم پھنکا جا رہا تھا۔ دو روز تک میری یہی کیفیت رہی لیکن کسی نے مجھ پر کوئی توجہ نہ دی۔ ان دنوں میں مجھے بھوک پیاس کا بھی ہوش نہ رہا۔ میرا بخار شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ تیسرے روز دو جنگلی مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے جھونپڑے سے باہر لے آئے جہاں مجھے ناہموار زمین پر ڈال دیا گیا۔ ایک جنگلی کے اشارے پر جو وہاں پہلے سے میرا منتظر تھا میرے گلے پر بائیں جانب تیز دھار چاقو سے ہلکا سا شگاف کیا گیا پھر اس شگاف میں کوئی سفوف بھر دیا گیا جو میرے لئے انتہائی ناقابل برداشت اور اذیت ناک تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میرے زخم میں پسی ہوئی مرچیں بھر دی گئی ہوں۔ بخار کی شدت کے باوجود میں درد سے بلبلا اٹھا اور زمین پر لوٹنے لگا۔ جو جنگلی مجھے باہر لائے تھے،، مجھ پر دوبارہ ٹوٹ پڑے اور مجھے بڑی بے رحمی سے کھینچ کھانچ کر دوبارہ

اسی تاریک جھونپڑے میں پھینک دیا گیا جہاں میں گزشتہ پچیس روز سے پڑا اپنی موت کی راہ دیکھ رہا تھا۔"

میجر ڈکسن نے گلاس میں بچی ہوئی شراب کو دو چار گھونٹ لے کر ختم کیا پھر پرنس ہنری کا تمباکو پائپ میں بھر کر سلگایا۔ دو تین طویل کش لے کر پھر اپنی عجیب و غریب داستان شروع کر دی جسے سننے کے لئے میری بے چینی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"میں نہیں کہہ سکتا کہ ان جنگلیوں نے کس سفوف یا جڑی بوٹی کے ذریعے میرا علاج کیا تھا۔ بہر حال دوسرے ہی روز میرا بخار اتر گیا مگر نقاہت برقرار رہی۔ سات روز بعد میں اس قابل ہو گیا کہ اپنے جسم کو حرکت دے سکوں۔ مجھے حیرت تھی کہ اب تک مجھے زندہ کیوں رکھا گیا شاید ابھی تک دیوتاؤں کی طرف سے میری موت کا شگون نہیں ملا تھا۔ جبکہ میں ہر لمحے موت کی دعائیں مانگا کرتا تھا لیکن ایک روز میں نے اچانک فرار کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ مونیکا کی موت کا اثر میرے ذہن سے کسی قدر ہلکا ہو چکا تھا۔ جنگلیوں نے اب تک مجھ سے یہ سوال نہیں کیا تھا کہ میں جزیرے تک کس طرح پہنچا جس کے معنی یہی تھے کہ وہ لانچ ابھی تک محفوظ ہو گی جو میں نے سمندری چٹانوں کے درمیان گھنے درختوں کی اوٹ میں چھپا دی تھی۔ فرار کی راہیں میرے لئے ہر چند کہ مسدود تھیں لیکن زندگی کی امید نے مجھے بہت کچھ خطرے مول لینے پر مجبور کر دیا۔ اگر میں کسی طرح خود کو ان رسیوں سے آزاد کرا سکتا جنہوں نے مجھے بے دست و پا کر رکھا تھا تو میں اپنی جان بچانے کے لئے کسی منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔

جھونپڑے میں جہاں مجھے رکھا گیا تھا بظاہر کوئی ایسی چیز موجود نہیں تھی۔ اس کے باوجود میری سوچوں کے زاویے صرف فرار کے امکانات پر محدود ہو کر رہ گئے تھے۔

تین چار روز تک مجھے ایسی کوئی ترکیب نہ سوجھی جو میرے فرار کے سلسلے میں میری معاونت کر سکتی لیکن ایک روز اچانک امید کی ایک کرن میرے تاریک ذہن میں روشن ہو گئی۔ مجھے پتھر کے جس برتن میں کھانا دیا جاتا تھا اگر کسی طرح میں اسے توڑنے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر رسیاں کاٹنے کا مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ دوسرے روز جب دوپہر کا کھانا میرے لئے آیا تو میں وہ برتن غور سے دیکھتا مجھے امید ہو

چلی تھی کہ اگر میں نے ہمت سے کام لیا تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر میں سو گیا۔ رات کا کھانا آیا تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میرے محافظ کا معمول تھا کہ وہ رات کے کھانے کے برتن صبح لے جاتا تھا۔ گویا میرے پاس صرف آٹھ گھنٹے تھے اور ان آٹھ گھنٹوں میں مجھے ایک کار نمایاں انجام دینا تھا۔ چنانچہ محافظ جیسے ہی برتن رکھ کر باہر نکلا' میں نے زمین پر لڑھک کر جانوروں کی طرح کھانا معدے میں منتقل کیا۔ پانی پینے کے بعد میں کچھ دیر تک باہر کی سن گن لیتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کمر سے زور لگا کر گھومنے لگا۔ پانچ منٹ کی جدوجہد کے بعد میرے پاؤں اس طرح برتن کی سیدھ میں آ گئے کہ اگر میں ضرب لگاتا تو وہ برتن پر پڑتی۔ مجھے اپنے فرار کا منصوبہ پورا کرنے کے لئے ہر قسم کا خطرہ پیش آ سکتا تھا جس کے لئے میں خود کو تیار کر چکا تھا۔ بچ نکلنے کی صورت میں میں پوپھٹنے سے پہلے پہلے ان جنگلیوں کی دسترس سے بہت دور جا سکتا تھا اور پکڑے جانے کی صورت میں جو مظالم مجھ پر کئے جاتے میں ان کے لئے بھی تیار تھا۔

"میں موت اور زندگی کے اس دوراہے پر بے حس و حرکت پڑا کچھ دیر تک باہر کان لگائے رہا پھر میں نے گھٹنے جوڑ کر اپنی ٹانگیں بلند کیں اور انہیں زور سے برتن پر مارا۔ برتن ٹوٹا یا نہیں لیکن میری ایڑیوں میں جو شدید ٹیس اٹھی اس نے مجھے تڑپا دیا۔ اس خیال سے کہ کہیں میرے منہ سے کربناک چیخ نہ نکل جائے۔ میں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے سختی سے دبا رکھے تھے۔ دو منٹ کے انتظار کے بعد میں نے اپنا عمل دہرایا لیکن مجھے مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ تیسری بار ایڑیوں میں ہونے والی تکلیف میرے لئے ناقابل برداشت ہو گئی مگر پھر جیسے مجھ پر جنون طاری ہو گیا میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اپنا عمل دہراتا رہا۔

کافی دیر تک یہ عمل جاری رکھا لیکن اس وقت میری آنکھیں چمک اٹھیں اور درد کی شدت کا احساس بھی جاتا رہا جب ایک بار برتن ٹوٹ کر دو ہو گیا میرے جسم میں مزید توانائی آ گئی۔ فرار کے منصوبے کی پہلی منزل سر کر لینے کے بعد میں تیزی سے دوبارہ گھومنے لگا اور کھسکتا ہوا ٹوٹے ہوئے برتن کے قریب آ گیا۔ میری آنکھیں اس ٹوٹے ہوئے حقیر برتن کے ٹکڑے پر جم گئیں جو مجھے بوگاما قبیلے کے جنگلیوں کے

ہاتھوں ظلم کا نشانہ بننے سے چھٹکارا دلانے کا ایک ذریعہ ہو سکتا تھا۔ چند ثانئے تک میں اگلا منصوبہ ذہن میں ترتیب دیتا رہا پھر میں نے زمین پر اوندھا لیٹ کر دوبارہ اپنے جسم کو حرکت دینا شروع کر دی۔

"پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں سے رسی کاٹنے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ اگر میں برتن کا کوئی ایک ٹکڑا اپنے بندھے ہوئے پاؤں کے درمیان پھنسانے میں کامیاب ہو جاتا تو گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ہاتھ کی رسی آسانی سے کاٹ سکتا تھا۔ مجھے اس کوشش میں جن تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا وہ میرا دل ہی جانتا ہے لیکن جب میری محنت دو گھنٹے کی مسلسل جد و جہد کے بعد بار آور ثابت ہوئی تو میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ میں نے ہاتھوں کو آزاد کرنے کے بعد پاؤں کی رسیاں جلدی جلدی کھولیں پھر توازن سنبھالتا ایک مدت کے بعد آزادی کی سانس لیتا ہوا اپنے پیروں پر اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے خطرے کا احساس تھا' اس لئے پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا میں جھونپڑے کے دروازے تک آیا۔ قدرت شاید مجھ پر مہربان تھی اس کا اندازہ مجھے اپنے محافظ کو دیکھ کر ہوا جو جھونپڑے سے تھوڑی دور ایک پتھر سے ٹیک لگائے محو خواب تھا۔ اس کا نیزہ پتھر کے سہارے اس کے قریب ہی موجود تھا۔ اسے غالباً" اس بات کا مکمل اطمینان تھا کہ میں کسی طرح بھی فرار نہ ہو سکوں گا۔"

کچھ دیر تک میں سانس روکے کھڑا اس سیاہ فام وحشی کو دیکھتا رہا پھر جھونپڑے کا دروازہ کھول کر آہستہ سے باہر نکل آیا۔ اندھیری رات میں فرار ہو جانا کوئی ایسی دشوار گزار بات نہ تھی لیکن معاً" مجھے خیال ہوا کہ جب میں اس علاقے کے راستوں سے ناواقف ہوں تو اس گھپ اندھیرے میں بھلا کس طرح اس مقام تک پہنچ سکوں گا جہاں میں نے لانچ چھپائی تھی۔ اس بات کا اندیشہ بھی ابھر رہا تھا کہ ممکن ہے جنگلیوں نے میری گرفتاری کے بعد لانچ تباہ کر ڈالی ہو۔ ایسی صورت میں میرا بچ نکلنا ناممکن تھا۔ اور پھر میرے ساتھ جنگلیوں کا جو برتاؤ ہوتا اس کے تصور ہی سے مجھے جھرجھری آ گئی مگر آزادی کی خواہش اور جینے کی تمنا جانوروں کو بھی جدوجہد پر مجبور کر دیتی ہے۔ چنانچہ میں پیش انے والے خطرات کا امکان ذہن سے جھٹک کر آگے بڑھنے لگا۔ اپنے اندازے کے مطابق میں نے وہی راستہ اختیار کیا تھا جو ساحل کی سمت جاتا تھا۔

"میں اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتا' اپنی ہمت کے مطابق تیز تیز قدم اٹھاتا رہا۔ قبیلے پر ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا گھنے درخت اور بڑے بڑے پتھر میری پشت پناہی کر رہے تھے۔ مجھے وقت کا ٹھیک اندازہ نہیں تھا لیکن میرا خیال ہے کہ تقریباً" چالیس منٹ تک میں اسی طرح آگے بڑھتا رہا۔ پھر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ سمندری موجوں کی آوازیں اب بہت قریب سے آ رہی تھی۔ میں اپنی منزل مقصود سے ہر لمحے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ میری رفتا اور تیز ہو گئی۔ آزادی کے تصور نے میری ہمت بڑھا دی تھی مجھے یقین تھا کہ جب قدرت نے یہاں تک میری رہبری کی ہے تو میں ساحل کے قریب پہنچ کر لانچ تلاش کرنے میں بھی ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ خار دار جھاڑیاں اور گھنے درخت میری راہ میں رکاوٹ بن رہے تھے مگر میں یہ رکاوٹیں روندتا ہوا گرتا پڑتا آگے بڑھتا رہا۔ اچانک کسی الو کی تیز اور مکروہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک کر رک گیا۔ گو میں نے شگون کے اچھے برے ہونے کے امکانات پر غور نہیں کیا تھا۔ میرے نزدیک یہ تمام باتیں مہمل اور بیکار تھیں۔ لیکن اس وقت نہ جانے کیوں الو کی آواز سن کر میں سہم گیا۔ میری چھٹی حس مجھے کسی آنے والے خطرے کا پتا دے رہی تھیں۔ تیزی سے ایک درخت کی آڑ لے کر میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر قرب و جوار میں کسی شخص کی موجودگی کا انداز لگانے لگا۔ وقت کی رفتار اچانک بڑی مدھم پڑ گئی تھی۔ میں دم سادھے کچھ دیر تک درخت کی آڑ میں چھپا کھڑا رہا پھر اس خیال سے کہ خطرے کا احساس میرا وہم تھا میں دوبارہ اسی پگڈنڈی پر آ گیا جو بل کھاتی ہوئی سمندر تک چلی گئی تھی۔"

"ابھی میں دس قدم ہی آگے بڑھ سکا تھا کہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔ تین چار وحشی اچانک جھاڑیوں سے نکل کر میرے سامنے آ گئے' اندھیرے میں ان کی سرخ سرخ چمکدار آنکھیں دیکھ کر میں لرز اٹھا۔ میری نظروں کے سامنے اندھیرا پھیلنے لگا۔ آزادی کا تصور ذہن کی گہرائیوں میں گھٹ کر رہ گیا۔ پھر وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ چار وحشی مجھے بڑی بے دردی سے مارتے پیٹتے اور نیزے سے میرے جسم کو کچوکے دیتے واپس گھسیٹ لائے۔ میرا خیال تھا کہ فرار کی کوشش کی سزا مجھے

صبح دی جائے گی لیکن یہ سزا پہلے ہی سے تجویز کی جا چکی تھی۔ جھونپڑے میں واپس لا کر میرے پاؤں پہلے کے مقابلے میں زیادہ موٹی رسیوں سے جکڑ کر باندھے گئے۔ پھر ایک جنگلی نے اپنی کمر سے چاقو کھولا اور مجھے خونخوار نظروں سے گھورتا ہوا میرے اوپر جھک آیا۔ آنے والے خطرے کا احساس مجھے دم بخود کئے ہوئے تھا۔ آزادی کے تصور کے فوراً" ہی بعد موت کے بھیانک سائے اپنے سامنے دیکھ کر میں گنگ سا ہو گیا لیکن اس وقت میں اپنے حلق سے نکلنے والی کربناک چیخ نہ روک سکا جب مجھ پر جھکے ہوئے وحشی نے ایک گھٹنا میری ران پر رکھ کر بڑی تیزی سے میری بائیں پنڈلی کا گوشت ایک ہی جھٹکے میں میرے جسم سے علیحدہ کر دیا۔ پھر اس درندے نے یہی عمل میری دوسری پنڈلی پر کیا۔ تیز چاقو کا پھل میرا گوشت چیرتا پھاڑتا میری ہڈیوں سے ٹکرایا تو میں بلبلا اٹھا۔ میں نے تڑپ کر بچنا چاہا لیکن میری کوشش رائیگاں ثابت ہوئی۔ قوی ہیکل حبشی وحشی نے اپنے دونوں گھٹنے میری رانوں پر مضبوطی سے جما کر مجھے بے بس کر رکھا تھا۔ کچھ دیر تک میں اس قصائی سے نجات پانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا پھر میری قوت مدافعت کم ہوتی گئی۔ میں تکلیف کی شدت سے بیہوش ہو گیا۔"

اتنا کہہ کر میجر ڈکسن نے پتلون کے دونوں پائنچے اٹھا کر مجھے اپنی پنڈلیاں دکھائیں جہاں شدید گھاؤ کے نشانات موجود تھے۔ چند ثانئے تک میجر اپنے خیالوں میں گم رہا پھر اس نے پائپ کا کثیف دھواں حلق سے اڑاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

فرار کی کوشش ناکام ہو جانے کے بعد جہاں مجھے اذیت ناک سزا دی گئی وہاں میری کڑی نگرانی بھی شروع کر دی گئی۔ مجھے اب محض اپنی موت کا انتظار تھا لیکن افسوس کہ موت بھی میری کسمپرسی اور بے بسی دیکھ کر مجھ سے دامن بچا رہی تھی۔ دیوتاؤں کے لئے مجھے بھینٹ چڑھانے کی خاطر مزید دو بار شگون لئے گئے لیکن نتیجہ میرے حق میں نہیں نکلا۔ قدرت شاید مجھے بچانا چاہتی تھی۔

میں مزید دس پندرہ دنوں تک شدید کرب میں مبتلا رہا۔ میری پنڈلیوں کے زخم کا کوئی علاج نہیں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے میرے زخموں میں پیپ پڑ گئی اور تکلیف بھی زیادہ ہو گئی۔ خونخوار مچھر اور جنگلی مکھیاں ہمہ وقت میرے زخموں سے لپٹی رہتی تھیں۔ جب تک میں بے ہوش رہتا مجھے سکون رہتا لیکن ہوش میں آتے ہی میں پھر

اسی اذیت سے دو چار ہو جاتا ایک روز جب چار جنگلیوں نے آکر مجھے خواب غفلت سے بیدار کیا اور چیخیں مارتے ہوئے جھونپڑے سے باہر نکالا تو میں یہی سمجھا کہ شاید قدرت نے میری موت کی دعاؤں کو قبولیت کا شرف بخشا ہے۔ میری کمزوری حد سے بڑھ چکی تھی۔ چنانچہ میں بار بار لڑکھڑا کر منہ کے بل گرتا لیکن پھر اٹھ کر چلنے لگتا اس روز کھلے میدان میں پھر قبیلے کے وحشیوں کا ہجوم تھا۔ میں پہلی صف سے آگے آگیا۔ مایوسی کے جذبے نے میری موت کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

"قبیلے کے وحشیانہ رسم و رواج کے مطابق ایک ایسی عورت درندگی کے نشانہ بنانے کے لئے میدان کے درمیان ایک بلی سے باندھی گئی تھی جو اب جنگلیوں کے جنسی مقصد کے اعتبار سے ناکارہ ہو چکی تھی۔ دس بارہ وحشی اس عورت کے گرد شیطانی رقص کرنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں تلوار جیسا کوئی تیز دھار ہتھیار سنبھال رکھا تھا جسے وہ رقص کرتے کرتے عورت کے بدن کے انتہائی قریب سے لے جاتے پھر اچھل کود کرتے ہوئے دور ہٹ جاتے۔ اس بدنصیب عورت کے چہرے پر موت کی خوفناک پرچھائیں لرز رہی تھیں لیکن اس کی آنکھیں خوف اور دہشت کے مارے حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں لیکن وہ اس انسانیت سوز ظلم کے خلاف کوئی آواز بلند کرنے سے قاصر تھی۔ اس کا منہ گھاس پھونس ٹھونس کر سختی سے باندھ دیا گیا تھا۔

"وحشی درندوں کے شیطانی رقص کے ساتھ ساتھ ڈھول کی آواز بھی بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں پھٹی پھٹی نظروں سے اس بے بس عورت کو دیکھ رہا تھا کہ یکلخت ایک جنگلی وحشیانہ انداز میں اپنا ہتھیار ہلاتا ہوا عورت کے قریب گیا۔ اس بار اس نے عورت کو خوفزدہ کرنے کے بجائے اس پر بھرپور حملہ کیا تھا۔ میرے خدا .... کس قدر ہولناک تھا وہ منظر جب میں نے اس بدنصیب عورت کی ایک چھاتی بدن سے جدا ہو کر زمین پر گرتے دیکھی تھی۔ ابھی میں اپنے ہوش و حواس برقرار رکھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ دوسرے جنگلی نے اس مجبور عورت کی دوسری چھاتی پر وار کر دیا۔ میں نے اس عورت کا سر نیچے ڈھلکتے دیکھا۔ یا تو وہ مر چکی تھی یا پھر بیہوش ہو گئی تھی لیکن ان خونی بھیڑیوں کو اس پر رحم نہ آیا۔ یکے بعد دیگرے وہ

بڑے سفاکانہ انداز میں اس کے بدن کے ایک ایک عضو کو اپنی درندگی کا نشانہ بناتے رہے پھر جب اس کا سر تن سے جدا کیا گیا تو میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں حلق کے بل چلایا۔

"حرامزادو ——— کمینو ——— یہ ظلم ہے۔ تم انسان نہیں درندے ہو۔ سنگدل اور خون آشام بھیڑیو۔ ایک دن تمہارا حشر اس سے بھی بدتر ہو گا۔"

"میں نے ٹوٹی پھوٹی جنگلی زبان میں دل بھر کر ان لوگوں کو لعن طعن کیا۔ شعوری اور لاشعوری طور پر میری خواہش یہ تھی کہ وہ غصے میں آکر مجھے جان سے مار ڈالیں۔ میرے چیخنے چلانے سے شیطانی رقص کا وحشتناک سلسلہ رک گیا۔ میرے گرد جمع تمام مرد اور عورتیں مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگے۔ پھر ایک معمر وحشی مجمع سے نکل کر میرے قریب آگیا۔ چند ثانئے تک وہ مجھے گھورتا رہا۔ اس کی نظروں میں نہ جانے کیوں مجھے ایک لمحے کے لئے ہمدردی اور دوستی کا جذبہ نظر آیا مگر دوسرے ہی لمحے اس کی بھرپور ٹھوکر میرے منہ پر اتنی شدت سے پڑی کہ میں زمین پر الٹ گیا۔ ہونٹ پھٹے تو خون کی دھار پھوٹ پڑی۔ میں سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ غالباً" اسی معمر وحشی کے اشارے پر چار پانچ جنگلی مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مجھے اس بری طرح زدوکوب کیا کہ میں بیہوش ہو گیا۔

"ہوش آنے پر میں نے خود کو اسی تاریک جھونپڑے میں پایا جہاں میری زندگی بڑے اذیت ناک دور سے گزر رہی تھی۔ میرا ایک ایک جوڑ پھوڑے کے مانند دکھ رہا تھا۔ پنڈلی کے زخم پھر ہرے ہو گئے تھے۔ ان میں ہونے والی ٹیس ناقابل برداشت تھی۔ نقاہت حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ بخار کی وجہ سے میرے سوچنے اور سمجھنے کی قوت بھی جیسے معطل ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے باوجود میں ایک بات کا بڑی شدت سے خواہاں تھا۔ اپنی موت کا!"

میجر ڈکسن نے پائپ صاف کر کے میز پر رکھا پھر اس نے اپنے لئے شراب کا پیگ تیار کیا لیکن اسے پئے بغیر اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ماضی کی کربناک یادوں کے سائے اس کے چہرے پر لرزاں تھے۔ اس خیال سے کہ شاید میجر ڈکسن اپنی داستان کا باقی حصہ سنانے کے موڈ میں نہیں ہے میں نے دبی زبان میں خود اس بات کا

اظہار کیا کہ اگر اس وقت اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تو پھر کبھی سہی مگر میجر نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا۔ کچھ دیر تک وہ کمرے میں ٹہلتا رہا۔ دوبارہ کرسی پر آکر بیٹھا اور شراب کا ایک لمبا گھونٹ لے کر بولا۔

"میرے عزیز ــــــــــ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ میں اپنی داستان سنانے سے اکتا گیا ہوں یا گریز کر رہا ہوں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں تمہیں پہلے ہی دن ٹال دیتا لیکن میرا خیال ہے کہ تم میرے ایک اچھے رفیق ثابت ہو گے۔ اپنی داستان تمہیں سنا کر اب میں اپنا ذہنی بوجھ کچھ ہلکا محسوس کر رہا ہوں اور اب تو میری داستان بڑی مختصر رہ گئی ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے ہوش آنے پر خود کو اسی تاریک جھونپڑے میں پایا' جہاں مجھے قید کیا گیا تھا۔ میری حالت ناگفتہ بہ حد تک خراب ہو چکی تھی۔ مجھے بڑی شدت سے اس دن کا انتظار تھا جب جنگلیوں کے پتھر کے دیوتا میری بھینٹ کے سلسلے میں نیک شگون دیتے اور میں موت کی پر سکون آغوش میں پہنچ کر اس اذیت سے چھٹکارا پا لیتا جس نے مجھے مردوں سے بھی بدتر حالت میں زندہ رکھا تھا۔

"مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں کہ میں کتنے دنوں یا مہینوں تک اس قید کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا۔ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ قبیلے میں جب بھی کوئی انسانیت سوز رسم منائی جاتی مجھے زبردستی اس میں شریک کیا جاتا۔ قبیلے میں قید کے دوران مجھے تین چار ایسے جشن مین شریک کیا گیا جس میں یا تو کسی معمر شخص کے خون سے کسی نومولود بچے کو غسل دیا گیا یا پھر کسی ایسی عورت کو ظلم کا نشانہ بنایا گیا ہے جس کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ اس کے علاوہ قبیلے کے عجیب و غریب رسم و رواج بھی میری نظروں سے گزرے لیکن مجھے اب ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی جس کی بنا پر میں نے اس وادی موت کا سفر اختیار کیا تھا۔ مجھے اپنی موت کا انتظار تھا۔ موت اور صرف موت جس کے بعد مجھے سکون مل سکتا تھا۔ لیکن بعد میں حالات نے جس انداز میں پلٹا کھایا وہ میرے لئے بہت بہتر اور حیرت انگیز ثابت ہوئے۔

"زندگی بڑی عزیز اور قیمتی شے کا نام ہے میرے عزیز۔ جانور بھی خود کو موت کے دام میں پھنسا دیکھ کر آزادی کے منصوبے بنانے لگتا ہے۔ چنانچہ یہی کچھ میرے ساتھ

بھی پیش آیا۔ ایک روز میں نیم بیہوش کی حالت میں جھونپڑے میں پڑا تھا کہ وہی معمر اور سنگدل وحشی جس نے ظلم کے خلاف احتجاج بلند کرنے پر میرے منہ پر ٹھوکر ماری تھی۔ تنہا میرے پاس آیا۔ قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق چونکہ ہر قسم کے فیصلوں کا حق صرف دو معمر ترین وحشیوں کے ہاتھوں میں ہوتا تھا۔ اس لئے میں یہی سمجھا کہ غالباً" اب میرا وقت بھی آ گیا ہے۔ معمر وحشی میرے قریب کھڑا مجھے گھورتا رہا۔ اس روز بھی میں نے نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں درندگی کے بجائے خود غرضی کی عیارانہ چمک دیکھی تھی لیکن میں نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ عام طور پر ہر ظالم اور سنگدل شخص عیار ہوتا ہے۔ خصوصاً" وہ جنگلی تو بڑے شاطرانہ انداز میں اپنا شکار پھانسنے کے عادی تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ میرے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کیا جا چکا ہے۔ کچھ دیر تک معمر وحشی جس کا نام لوکارٹا تھا وہیں کھڑا رہا۔ پھر اس نے پلٹ کر باہر کھڑے ہوئے محافظ سے کچھ کہا۔ میں ٹھیک طور پر اس جملے کے معنی نہ سمجھ سکا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ اس نے محافظ کو کسی کام سے بھیجا ہے۔ محافظ کے قدموں کی آواز ابھر کر دور ہوتی چلی گئی تو وہ بڑے نفرت انگیز انداز میں میرے قریب بیٹھ گیا۔ ایک نظر جھونپڑے پر ڈالی پھر مدھم آواز میں مخاطب ہوا۔

"رابی ہولو آما (اب تمہاری طبیعت کیسی ہے)۔"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے درندے۔" میں نے ٹوٹی پھوٹی جنگلی زبان میں نفرت سے جواب دیا۔

"آہستہ بولو مردود" لوکارٹا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پھر سرگوشی کرتے ہوئے بولا "میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔"

"کیوں آئے ہو میرے پاس۔" میں نے نقاہت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بکو مت۔ غور سے سنو۔" اس نے اپنی زبان میں جواب دیا۔ "تم اگر چاہو تو میں تمہیں یہاں سے بھاگ نکلنے کا موقع فراہم کر سکتا ہوں۔"

مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا۔ جال میں پھنسے ہوئے بے بس شکار کو کوئی خونی درندہ بھی معاف کر سکتا ہے یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے وہ مجھ سے کچھ اگلوانا چاہتا ہو میں اسے محتاط نظروں سے گھورنے

لگا۔ تاریک جھونپڑے میں کچھ دیر تک موت کا بھیانک سکوت طاری رہا پھر لوکارٹا نے بڑی راز داری سے اپنا مدعا بیان کرنا شروع کر دیا جسے میں جو سمجھ سکا اس کا متن یہ ہے:

"تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے دستور کے مطابق ہر نومولود بچے کو قبیلے کے معمر ترین شخص کے خون سے غسل دیا جاتا ہے۔ اس وقت صرف ایک آدمی ایسا ہو گا جو مجھ سے زیادہ عمر کا ہے لیکن اسے کل تک اپنے انجام کو پہنچ جانا ہے پھر میری باری ہو گی۔ میرا اندازے کے مطابق سات آٹھ روز بعد مجھے بھی ایک دوسرے پیدا ہونے والے بچے کے سلسلے میں ذبح کر دیا جائے گا۔ میں اس وقت کے آنے سے پیشتر ہی یہاں سے دور چلا جانا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے • معمر وحشی سے پوچھا۔

"تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔" لوکارٹا نے سرگوشی کی۔" مجھے یقین ہے کہ تم یہاں کسی خاص ذریعے سے آئے ہو گے ——— کسی کشتی کے ذریعے' تمہاری گرفتاری کے بعد یہ مسئلہ اٹھا تھا لیکن میں نے دور اندیشی کے پیش نظر یہ کہہ کر دوسروں کو مطمئن کر دیا تھا کہ تم کسی جہاز سے آئے ہو جو تمہیں قبیلے کے قریب چھوڑ کر چلا گیا۔ اتفاق سے جس روز تم پکڑے گئے اس کے دوسرے روز ہمیں ایک کشتی شکستہ حالت میں ساحل کے قریب مل گئی تھی چنانچہ بات بن گئی مگر مجھے یقین ہے کہ تم اس کشتی کے ذریعے یہاں تک نہیں پہنچے تھے۔"

لوکارٹا کی خود غرضی بھانپ کر زندگی کی رمق نے ایک بار پھر زندہ رہنے کا حوصلہ بخش دیا۔ میں کچھ دیر تک سنجیدگی سے اپنے منتشر ذہن کی قوتیں سمیٹے حالات پر غور کرتا رہا پھر دبی زبان میں بولا۔

"میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں لیکن اس کے لئے تمہیں ایک کام کرنا ہو گا۔"

"وہ کیا؟"

"جس وقت ہمیں گرفتار کیا گیا تھا ہمارے پاس دو رائفلیں تھیں کیا تم وہ مجھے واپس کر سکتے ہو؟"

"تمہارا اشارہ ان ہتھیاروں کی طرف تو نہیں جن سے دھماکے بلند ہوتے ہیں۔"

"ہاں ——— ہاں! وہی۔ کیا تم وہ مجھے واپس کر سکتے ہو۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔ امید کی ایک کرن میرے دل میں چمک رہی تھی' مجھے یقین تھا کہ اگر میری رائفلیں واپس مل گئیں تو میں بہ آسانی اس منحوس قبیلے سے فرار ہو سکتا ہوں۔ رائفلوں کی واپسی کا مطالبہ میں نے یہ سوچ کر کیا تھا کہ اگر لوکارٹا بعد میں کسی چالبازی کا مظاہرہ کرے تو میں اسے بھی ٹھکانے لگا سکوں۔

میری بات سن کر وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا لیکن اس کی خونخوار نظریں اس عرصے میں برابر میرے چہرے پر مرکوز رہیں۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ امید و بیم کی کیفیت سے دو چار بڑی بے چینی سے اس کے جواب کا منتظر تھا۔ اس کی خاموشی میرے لئے بڑی اذیتناک ثابت ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد لوکارٹا نے کہا۔

"میں دھماکے پیدا کرنے والے ہتھیار تمہیں واپس لا دوں گا۔ لیکن کیا بعد میں تم میرے ساتھ کوئی دھوکا تو نہ کرو گے۔"

"ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ اس لئے تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔ "جہاں تک دھوکے بازی کا سوال ہے تو جب تک تم کوئی پہل نہیں کرو گے میں کسی قسم کی بد دیانتی کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔"

"اچھا ——— میں تیار ہوں" لوکارٹا نے اٹھتے ہوئے کہا پھر جاتے جاتے بولا۔ "میں ایک دو روز بعد تم سے ملوں گا۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ میں اس عرصے میں تمہارے علاج کے لئے بھی کچھ کر سکوں گا۔ فرار ہونے کے لئے تمہارے جسم میں طاقت کا ہونا بھی اشد ضروری ہو گا۔"

لوکارٹا اتنا کہہ کر تیزی سے جھونپڑے سے باہر چلا گیا۔ میں اس کے جانے کے بعد گھنٹوں فرار کے منصوبے پر غور کرتا رہا پھر مجھے غنودگی طاری ہو گئی۔ دوسرے روز لوکارٹا کے بیان کے مطابق قبیلے کے سب سے معمر ترین شخص کو ہلاک کر کے اس کے خون سے ایک نومولود بچے کو غسل دیا گیا۔ حسب معمول مجھے بھی زبردستی اس ہولناک جشن میں شریک کیا گیا۔ اس جشن کے دوسرے روز قبیلے کے ایک شخص نے جو علاج کرنے کا ماہر تھا۔ میرے زخموں پر نہ جانے کیا کیا سفوف اور جڑی بوٹیاں آزما

ڈالیں۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ایک ہفتے کے مختصر عرصے میں میری نقاہت یا زخموں کی جان لیوا تکلیف دور ہو گی لیکن میرے عزیز تمہیں یہ سن کر یقیناً" حیرت ہو گی کہ تیسرے ہی روز میری طبیعت حیرت انگیز طور پر سنبھل گئی۔ زخموں کا درد غائب ہو گیا اور پہلے کے مقابلے میں میری نقاہت بھی بڑی حد تک دور ہو گئی لیکن اس کے لئے مجھے جو بدبودار اور لیس دار رقیق محلول روزانہ حلق کے نیچے اتارنا پڑتا تھا۔ اس کا مزا محسوس کر کے آج بھی میری حالت غیر ہو جاتی ہے۔

"غرضیکہ میری حالت پر اسرار اور حیرت انگیز طور پر سنبھلتی جا رہی تھی اس عرصے میں لوکارٹا ایک بار بھی مجھ سے نہ ملا۔ پانچ روز یونہی گزر گئے میری امیدیں ٹوٹتی جا رہی تھیں۔ میں شب و روز سوچتا رہا کہ دیکھیں قسمت آئندہ کیا گل کھلاتی ہے؟ میں اس منحوس جزیرے سے زندہ نکل بھی سکوں گا یا نہیں؟ میرے لئے اب ایک لمحہ کاٹنا دوبھر ہو رہا تھا۔ باہر ذرا بھی کوئی آہٹ ہوتی تو میرے کان کھڑے ہو جاتے۔ میں بڑی سنجیدگی سے سوچتا کہ جب لوکارٹا ہی کی ایما پر میرا علاج ہو رہا ہے تو پھر وہ خود سامنے آنے سے کیوں کترا رہا ہے۔ کیا اس نے اپنے بچاؤ کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کر لیا ہے؟ اگر ایسا ہوا تو میرا کیا بنے گا کیا میں اسی طرح بے یار و مددگار اس تاریک جھونپڑے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاؤں گا؟"

چھٹے روز میری وحشت میں اضافہ ہو گیا۔ رات کا کھانا میں نے جوں توں کر کے کھایا پھر تھکے ہوئے ذہن کو سکون دینے کی خاطر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھ پر تھوڑی تھوڑی غنودگی طاری تھی کہ معاً باہر سے کسی کے کراہنے کی آواز ابھر کر اتنی تیزی سے بند ہو گئی کہ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے کراہنے والے کا منہ دبا دیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جھونپڑے کا دروازہ کھلا اور دو سائے تیزی سے اندر داخل ہوئے لیکن ان میں سے ایک سایہ دوسرے سائے کو گھسیٹتا ہوا اندر لا رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میں کوئی حرکت کر کے اپنے جاگنے کا ثبوت فراہم کرنے کے بجائے دم سادھے پڑا رہا۔ باہر سے مدھم مدھم روشنی اندر آ رہی تھی۔ آنکھوں کے ———— درمیان ذرا سا خلا پیدا کر کے میں سب کچھ دیکھتا رہا۔ دونوں سائے بڑی سرعت سے اندر داخل ہوئے۔ پھر ایک نے

دوسرے کو زمین پر گرا دیا۔ اور اس کی چھاتی پر سوار ہو گیا۔ چند ساعت تک اس قسم کی آوازیں میری سماعت سے ٹکراتی رہیں جیسے کوئی پاؤں زمین پر مار رہا ہو۔ پھر یہ آوازیں آنی بند ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا سایہ تیزی سے اٹھا اور جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔ میں نے آنکھ کھول کر گردن گھمائی اور اس سائے کو دیکھنے لگا جو میرے بائیں جانب فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ غالباً" اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ مگر قبل اس کے کہ میں مرنے والے کے بارے میں کچھ سوچ سکتا جھونپڑے کا دروازہ جسے زندہ بچ جانے والے نے باہر جاتے وقت بند کر دیا تھا دوبارہ کھلا اور خوشی سے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ روشنی گو بہت مدھم تھی لیکن میں نے آنے والے کے ہاتھوں میں رائفلیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں غلطی نہیں کی کہ وہ لوکارٹا تھا۔ ایک لمحے بعد ہی لوکارٹا میرے قریب آ کر بولا۔

"کیا تم جاگ رہے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔

میرا جواب سن کر اس نے مجھے ان رسیوں کی قید سے آزاد کیا جنکی سخت بندشوں نے میری کلائیوں اور ٹخنوں پر گہرے گہرے نیل ڈال دیئے تھے۔ رسیوں سے نجات پاتے ہی میں نے اپنی طاقت سمیٹی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میری سانس تیز ہو رہی تھی۔ آزادی کے تصور نے میرے اندر ایک نئی امنگ پیدا کر دی تھی۔

"کیا تم رائفلیں لے آئے ہو؟" میں نے سرگوشی کی۔

"ہاں ————" لوکارٹا نے کسی زہریلے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ پھر دونوں رائفلیں اور کارتوس کی پٹیاں مجھے دیتے ہوئے کہا "لو انہیں سنبھالو اور خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ لیکن خبردار۔ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میرے ساتھ ساتھ تم بھی نہ بچ سکو گے۔ دھماکے والا ہتھیار چھپا کر جسم سے چپکا لو تاکہ اگر کوئی تمہیں میرے ساتھ دیکھ لے تو بھی اس بات کا شبہ نہ کر سکے۔ کہ ہم جزیرے سے فرار ہو رہے ہیں۔"

"لوکارٹا کے باہر نکلتے ہی میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ رائفلیں فی الحال میں نے

دونوں کاندھوں سے لٹکا کر اپنے ہاتھوں سے جسم کے ساتھ چپکا لیں۔ کار توس کی دونوں پٹیاں میری کمرے سے بندھی ہوئی تھی۔ کچھ دور تک ہم دونوں آگے پیچھے چلتے رہے۔ لوکارٹا کی رفتار خاصی تیز تھی۔ اس لئے میرا سانس جلد پھولنے لگا لیکن کسی نہ کسی طرح میں خود کو گھسیٹتا رہا۔ کئی بار میری نگاہوں کے نیچے اندھیرا بھی پھیلا لیکن میں خود کو سنبھالے رہا۔ میدانی علاقہ عبور کر کے گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے بری ہوشیاری سے پیٹی سے کارتوس نکالے اور چلتے چلتے دونوں رائفلوں کے میگزین بھر کے کسی بھی آنے والے خطرے کے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ میرا ذہن نقاہت کی وجہ سے بار بار چکرانے لگتا مگر میں حتی الامکان یہی کوشش کر رہا تھا کہ خود کو سنبھالے رکھوں۔ کہیں یہ سنہری موقع میرے ہاتھ سے نکل نہ جائے میں نے دل میں یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اگر کوئی خطرناک صورت پیش آئی تو میں مقابلے کی پوری کوشش کروں گا لیکن اگر بچاؤ کی صورت نظر نہ آئی تو خود کو ہلاک کر لوں گا۔ مگر خدا کا کرم اور احسان ہے کہ مجھے خود کشی نہیں کرنی پڑی۔"

یہاں تک کہہ کر میجر ڈکسن نے ایک طویل سرد آہ بھری پھر شراب کے مزید دو لمبے گھونٹ لے کر بولا۔

"لوکارٹا کسی آدم خور چیتے کی مانند خار دار جھاڑیوں اور گھنے درختوں کے درمیان سے گزر رہا تھا اور میں بمشکل اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ ساحل سے ٹکراتی ہوئی موجوں کی آواز ہر لمحے ہم سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ یکلخت لوکارٹا چلتے چلتے یوں ٹھٹھک کر رک گیا جیسے اس نے کسی خطرے کی بو سونگھ لی ہو۔ اس سے پیشتر کہ میں اس کے رکنے کی وجہ دریافت کرتا اس نے اشارے سے مجھے زبان بند رکھنے کی ہدایت کی اور اپنا نیزہ تان کر بڑی برق رفتاری سے سامنے والی جھاڑیوں کا نشانہ لے کر پھینکا۔ دوسرے ہی لمحے کوئی کربناک انداز میں کراہتا ہوا جھاڑیوں میں گرا۔ بوڑھے لوکارٹا نے غالباً" چھپے ہوئے دشمن کو دیکھ لیا تھا یا ممکن ہے اس نے محض اپنے اندازے کی بنا پر ایسا کیا ہو۔ بہرحال کراہ کی آواز ابھرتے ہی اس نے مجھے ہاتھ تھام کر گھسیٹا پھر دوڑنے لگا۔ میں ہانپتا کانپتا اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ لیکن جب ایک ڈھلان کو عبور کرنے کے بعد میں نے خود کو ساحل کے قریب دیکھا تو میری ساری تکان دور

ہو گئی۔

"اب مجھے بتاؤ کہ تم نے اپنی کشتی کہاں چھپائی ہے۔" لوکارٹا نے سرگوشی کی۔

"جلدی کرو۔ میں نے ایک محافظ کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے لیکن دوسرے محافظ بھی یہاں موجود ہوں گے۔ اگر انہیں ہمارے فرار کی کوشش کا علم ہو گیا تو پھر ہمارا بچ نکلنا مشکل ہو گا۔ اندھیرے سے پھینکے جانے والے نیزے ہم دونوں کے جسم چھلنی کر سکتے ہیں۔"

"میں نے کوئی جواب دینے کے بجائے ذہن پر زور دے کر قرب و جوار کا جائزہ لیا پھر ایک سمت اشارہ کر کے آگے بڑھنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں میری لانچ گھنے درختوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ لوکارٹا نے بڑی تیزی سے لانچ گھسیٹ کر باہر نکالی اور کود کر اس میں بیٹھ گیا۔ میں نے بھی حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ لانچ میں پہنچ کر میں نے انجن کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن انجن ایک پھریری لے کر خاموش ہو گیا۔ غالباً" پٹرول بند ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے جلدی سے انجن کا اوپری حصہ بند کر کے دوبارہ اسٹیرنگ کے قریب آ گیا جہاں لوکارٹا موجود تھا۔ اس کی نظریں اس وقت بھی جزیرے کی سمت مرکوز تھیں۔ میرے ذہن میں دو ہی خیال ابھرے۔ یا تو وہ محافظوں کی سن گن لینے کی خاطر اس طرف متوجہ تھا یا پھر جزیرے پر الوداعی نظر ڈال رہا تھا۔ بہرحال یہ وقت ان باتوں کا نہیں تھا لہٰذا میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے دوبارہ انجن اسٹارٹ کرنے کے لئے سوچ آن کیا اسٹارٹر کو دبایا تو انجن پھر پھریری لے کر خاموش ہو گیا۔ دوسری اور تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا لیکن چوتھی بار انجن اسٹارٹ ہو گیا۔

"جلدی کرو۔ کوئی اوپر موجود ہے۔" لوکارٹا نے میرے شانے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

میں نے لانچ کا سٹیرنگ تیزی سے گھمایا۔ پانی میں شدید ہلچل پیدا ہوئی اور ٹھیک اسی وقت لوکارٹا خوفناک آواز میں چیختا ہوا میرے داہنی جانب اس طرح گرا کہ اس کا نصف دھڑ انجن کے اوپر تختے پر رہا اور باقی حصہ نیچے جھول گیا۔ اس کی پشت پر ایک نیزہ اڑسا ہوا تھا۔ اس کی موت ایسے وقت ہوئی جب وہ اگر محض چند منٹ اور زندہ

رہتا تو میں یقیناً" اسے وحشیوں کی دنیا سے نکال کر مہذب دنیا میں لے آتا۔ لیکن اس وقت میرے لئے یہ بھی دشوار تھا کہ میں یہ جان سکتا کہ میرا محسن زندہ ہے یا مرگیا ہے۔ اوپر سے جنگلیوں نے ہمیں فرار ہوتا دیکھ کر نیزوں کی بارش شروع کر دی تھی میں نے بوکھلا کر لانچ کی رفتار اور بڑھا دی لیکن دوسرے لمحے ہی میری نظروں کے سامنے گھپ اندھیرے لہرا گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے پگھلتا ہوا سیسہ میرے بازو میں اتار دیا ہو۔ میں چکرا کر ایک سمت جھول گیا اور عین اسی لمحے ایک اور سنسناتا ہوا نیزہ لانچ سے ٹکرا کر سمندر میں غرق ہوگیا۔ اس کے بعد میں محفوظ تھا۔ لانچ برق رفتاری سے سمندر کی موجوں کا سینہ چیرتی جزیرے سے کافی دور نکل آئی تھی۔

"میں بازو میں ہونے والی اذیت ناک تکلیف شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ موت کی سرحدیں چھوڑ آنے کے بعد میں نے خود کو سنبھال کر حالات کا جائزہ لیا تو مجھے جھرجھری آ گئی۔ میرے بازو میں ہونے والی تکلیف کی وجہ اندھیرے میں دشمنوں کی طرف سے پھینکا ہوا نیزہ ہی تھا جو میرا گوشت چھیدتا ہوا لوکارٹا کے جسم میں پیوست ہوگیا تھا۔ اگر قدرت نے مجھے نہ بچا لیا ہوتا تو اس وقت شاید میں بھی لوکارٹا کی طرح بے جان ہو چکا ہوتا اور لانچ ہم دونوں کی لاشیں لئے سمندر میں چکرا رہی ہوتی۔

"میں بمشکل ایک ہاتھ سے لانچ چلا رہا تھا۔ دوسرا ہاتھ جو آہستہ آہستہ شل ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے جھک کر انجن کی سطح پر رکھ دیا تھا تاکہ ہلکی ہلکی گرمائی پہنچتی رہے! میرے عزیز! قبیلے سے میرا بچ نکلنا اور پھر گھپ اندھیرے میں سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کا زخمی حالت میں مقابلہ کرنا ایک مہم جو سیاح کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ مصائب سے الجھنا اور خطرے سے کھیلنا ہی ہماری شان ہے لیکن اس وقت میں جن تکلیف دہ حالات سے دوچار تھا انہیں الفاظ میں بیان کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ میرا ذہن ہر لمحے میرا ساتھ چھوڑتا جا رہا تھا۔ میری کیفیت اس بدنصیب مسافر سے مختلف نہ تھی جو بیچ ریگستان میں پہنچ کر منزل کا پتا بھول جائے۔ مجھے اتنا بھی ہوش نہ تھا کہ میں کم سے کم قطب نما کے ذریعے یہ بھی دیکھ لیتا کہ آیا میں صحیح راستے پر ہوں یا کسی نامعلوم منزل کی طرف جا رہا ہوں۔ اگر احساس تھا تو بس اتنا کہ میں جلد از جلد

اپنی منزل مقصود موزنبیق یا پھر مدغاسکر تک پہنچ جاؤں۔ جہاں سے آگے کا سفر میں آسانی سے طے کر سکتا تھا۔ اسی مقصد کے پیش نظر میں لانچ کی رفتار آہستہ آہستہ بڑھاتا جا رہا تھا۔

"دو گھنٹے تک میں کس طرح اپنا ڈوبتا ہوا ذہن جگائے رکھا یہ میرا ہی دل جانتا ہے لیکن اس کے بعد میری قوت زائل ہوگئی۔ ہوا کے تندو تیز جھونکوں نے میرا ذہن معطل کر کے مجھے بیہوشی کی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ میں کب تک بیہوش رہا اس کا اندازہ مجھے نہیں مگر جب دوسری بار مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ سورج میرے سر پر آ چکا ہے۔ میرا ہاتھ بدستور اس طرح اسٹیرنگ میں پھنسا ہوا تھا کہ اگر میں بیہوش ہو جاؤں تب بھی لانچ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے۔ انجن کی آواز بند ہو چکی تھی اور لانچ سمندری موجوں پر ہچکولے کھا رہی تھی۔ دور دور تک خشکی کا کہیں نشان تک نہ تھا میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے بازو میں رات جو زخم آیا تھا وہاں اب شدید ٹیس اٹھ رہی تھی لیکن میں نے اپنی تکلیف بھول کر پٹرول کا جائزہ لیا تو موت کا تصور ایک بار پھر میرے اعصاب پر خزاں کے منحوس موسم کی طرح مسلط ہوگیا۔ لانچ میں اب پٹرول کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ ٹینکی سوکھ چکی تھی۔ میں نے قطب نما پر نظر ڈالی تو پتا چلا کہ میں جنوب کی سمت جا رہا ہوں جبکہ قاعدے سے مجھے شمال کی طرف ہونا چاہئے تھا۔

موقع کی نزاکت بھانپ کر میرا ذہن چکرا گیا۔ میں نے انجن کا اوپری تختہ کھول کر اس سے چپو کا کام لینا چاہا۔ لیکن یہ ترکیب کارگر نہ ہو سکی۔ دوسری تمام ترکیبیں جو ایسے موقع پر میں اختیار کر سکتا تھا میں نے کیں لیکن نتیجہ صفر رہا۔ تھک ہار کر میں نے خود کو موجوں کے سپرد کر دیا۔ لوکارٹا کی اکڑی ہوئی لاش رات کے کسی وقت لڑھک کر لانچ کے اندر الٹ چکی تھی۔ میں نے سوچا اپنے محسن کی لاش اٹھا کر موجوں کے حوالے کر دوں۔ لیکن معاً" کچھ خیال کر کے میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے اپنے ساتھ رکھوں۔ اس طرح نفسیاتی طور پر مجھے اپنی تنہائی کا ایک سہارا مل سکتا تھا۔ لیکن کیا تم اس بات پر اعتبار کرو گے کہ وہی لوکارٹا جو میرا محسن تھا جس نے وحشی قبیلے کے ظالمانہ ہاتھوں سے مجھے نجات دلائی تھی۔ وہی تین روز تک

میری شکم سیری کا باعث بنتا رہا۔"

میجر ڈکسن نے اپنی حیرت انگیز داستان کے اس حصے پر پہنچ کر جھرجھری لی پھر کچھ توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔

"میں آج بھی ان لمحوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگتا ہے۔ مگر میں اس وقت مجبور تھا۔ بھوک کی شدت نے مجھے جانوروں کی قطار میں لا کھڑا کیا تھا۔ چھتیس گھنٹوں تک میں بھوک برداشت کرتا رہا پھر میں خونخوار اور آدم خور گدھوں کے مانند اپنے محسن کی سرد اور اکڑی ہوئی لاش پر ٹوٹ پڑا اور تین روز تک اس کے جسم کے مختلف حصوں کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا رہا اور سمندر کے پانی سے پیاس کی شدت کم کرتا رہا مگر چوتھے روز مجھے مجبوراً" اس کی لاش سمندر کی موجوں پر اچھال دینا پڑی اس لئے کہ اب اس کے جسم کا گوشت سڑنے لگا تھا اور ان مقامات پر جہاں جہاں سے میں نے گوشت کھایا تھا چاول کے برابر چھوٹے چھوٹے ہزاروں کیڑے بجبجانے لگے تھے۔ اپنے محسن کی لاش سمندر میں پھینک کر میں تن بہ تقدیر تھکے ہارے انداز میں لانچ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس رات میں نے محض سمندر کا کھارا پانی معدے میں منتقل کر کے بھوک کی اشتہا کو دھوکا دیا تھا۔ دوسرے دن بھی اسی عمل کو دہراتا رہا لیکن تیسرے روز میری حالت غیر ہو گئی۔ کھارا پانی پیتے پیتے میرا معدہ اس قدر متاثر ہو چکا تھا کہ سمندری پانی پینے کے تصور ہی سے مجھے ابکائیاں سی آنے لگتیں اور جی متلانے لگتا۔ کھلے آسمان کے نیچے بپھری ہوئی موجوں کے اوپر تن تنہا میں آٹھ روز تک موت سے جنگ کرتا رہا۔ اس عرصے میں میری حالت اتنی ابتر اور ناگفتہ بہ ہو چکی تھی کہ مجھ سے اٹھ کر اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہ ہوا جاتا تھا نویں روز میں اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو گیا۔ میرے حلق میں کانٹے پڑ چکے تھے اور معدہ سوکھ چکا تھا۔ اس روز میں نے آخری بار کھلے سمندر میں چاروں طرف نظر دوڑائی پھر آسمان پر نظر ڈالی۔ اس خیال سے کہ یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے بہتر ہے کہ میں خود کو سمندر کی موجوں کے حوالے کر دوں اور کسی آبی جانور کا لقمہ بن جاؤں میں نے اٹھنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایک بار میں ہمت کر کے گھٹنے کے بل اٹھ بیٹھا۔ لانچ کا سرا تھام کر میں نے اس

بات کی کوشش کی کہ خود کو اوپر اٹھا کر اپنا منحوس وجود سمندر میں منتقل کر دوں لیکن میرا ذہن چکرایا اور میں نڈھال ہو کر دوبارہ لانچ میں آ رہا۔ اس کے بعد میری نگاہوں کے سامنے اندھیرے پھیل کر دبیز ہوتے چلے گئے۔

"میں کتنے دنوں تک لانچ میں ایک زندہ لاش کی حیثیت سے دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا رہا۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن جب میں ہوش میں آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس وقت میں سنگاپور کے ایک اسپتال میں زیر علاج ہوں۔ پولیس اور ڈاکٹروں کے بیان کے مطابق ایک جہاز کے کپتان نے مجھے بازیاب کیا تھا اور سنگاپور پہنچا دیا تھا۔ گویا میں نے بیہوشی کی حالت میں تقریباً" نو سو میل کا سمندری سفر ایک ایسی لانچ پر طے کیا تھا جو موجوں کے رحم و کرم پر تھی۔ میں اکثر اس بارے میں سوچتا ہوں تو میرا ذہن الجھنے لگتا ہے۔ مجھے یہ ساری باتیں خواب کی مانند لگتی ہیں۔"

"بہر حال تقریباً" تین ماہ تک میں سنگاپور میں زیر علاج رہا۔ اس عرصے میں مجھ سے اصل واقعات کی چھان بین کی خاطر متعدد بار باز پرس کی گئی لیکن میں اصل واقعات بتانے سے متواتر گریز کرتا رہا۔ اول تو مجھے اس بات کا خطرہ تھا کہ بوگاما جزیرے کا نام آتے ہی مجھ سے جواب طلب کیا جائیگا کہ جب اس ضمن میں حکومت نے سیاحوں کے لئے اس جزیرے میں داخلے پر پابندی لگا دی تھی تو میں نے کیوں وہاں کا قصد کیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مجھے شبہ تھا کہ شاید میری داستان پر کسی کو یقین نہ آئے۔ چنانچہ میں نے ایک من گھڑت کہانی سنا کر چھان بین کرنے والوں کو مطمئن کر دیا۔ تین مہینے کے مسلسل علاج کے باوجود میری صحت پر کوئی خوش گوار اثر نہ پڑا۔ لہٰذا ڈاکٹروں کی تجویز پر آب و ہوا کی تبدیلی کی خاطر مجھے بنکاک جانا پڑا جہاں توقع کے خلاف میرے ذہن پر کچھ زیادہ برا اثر پڑا اور مجھے ذہنی امراض کے اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص یہی تھی کہ میرے ذہن پر کوئی شدید بوجھ ہے جسے وہ بہرحال سمجھنے سے قاصر تھے۔ چار پانچ ماہ تک میں ذہنی معالجوں کے درمیان گھرا رہا۔ آئے دن وہ میرا ذہن کریدنے اور اس کا بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر نت نئے سوالات کرتے رہتے۔ کافی دنوں تک میں انہیں بھی ٹالتا رہا لیکن پھر میں نے یہی محسوس کیا کہ اگر میں نے ذہن کا اذیت ناک بوجھ جلد نہیں پھینکا تو یقیناً" پاگل ہو جاؤں گا۔

چنانچہ میں نے ایک روز انہیں مختصر واقعات سنا ڈالے۔ اس روز مجھے وہ جرمانہ بھی ادا کرنا پڑا جو حکومت کی طرف سے مجھ پر بوگاما جزیرے کے خلاف قانون سفر کے سلسلے میں عائد کیا گیا تھا۔

بنکاک کے ذہنی اسپتال سے چھٹکارا پاتے ہی میں رنگون چلا گیا۔ جہاں میری اور تمہاری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ بنکاک فوری طور پر چھوڑنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اخبارات نے میری حیرت انگیز داستان کو بڑی ہوا دی تھی اور ہر وقت اخباری نامہ نگار میرا پیچھا کرتے رہتے تھے۔ میں ان حالات سے اس قدر اکتا گیا کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی طریقہ نہ تھا کہ میں بنکاک کو خیرباد کہہ دوں۔ میرا ارادہ براہ راست لندن جانے کا تھا لیکن ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ میں ابھی کسی لمبے سفر کے قابل نہیں ہوں۔ چنانچہ مجھے رنگون میں رکنا پڑا۔ جہاں میرا ذاتی معالج میرے لئے بڑا سود مند ثابت ہوا۔ یہ تھی میری داستان جس کا کچھ حصہ تم اخباروں میں پڑھ چکے ہو گے اس وقت میں نے دیدہ دانستہ کچھ واقعات پوشیدہ رکھے تھے۔ خاص طور پر مونیکا کی عبرتناک موت اور لوکارنا کے جسم کو اپنی خوراک بنانے کا حصہ میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔"

میجر ڈکسن کی داستان اس قدر دلچسپ اور حیرت انگیز تھی کہ میں نے درمیان میں ایک بار بھی بولنے کی کوشش نہیں کی لیکن جب وہ اپنی داستان سنا چکا تو میں نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"میجر ——— میں شکر گزار ہوں کہ تم نے اپنے سفر کی تمام باتیں بڑی تفصیل کے ساتھ سنا دیں۔ تمہاری داستان یقیناً" حیرت انگیز ہے اور پر اسرار بھی۔ لیکن کیا تم مجھے اس بات کی اجازت دو گے کہ میں یہ داستان کتابی شکل میں بازار میں لے آؤں۔"

"نہیں ———" میجر نے بڑی تیزی سے کہا "میں تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دوں گا۔ کتاب شائع ہونے کے بعد میں یقینی طور پر ایک بار پھر اخباری نمائندوں، حکومت اور واقف کاروں کی توجہ کا مرکز بن جاؤں گا۔ مجھے بار بار اپنے ماضی کے وہ زخم کریدنے پڑیں گے جو ابھی مندمل نہیں ہو سکے۔ کیا تم یہ پسند کرو گے

کہ میرا سکون برباد ہو کر رہ جائے؟ میں نے تمہیں اپنی داستان ایک ہم پیشہ اور دوست کی حیثیت سے سنائی تھی۔ اس لئے نہیں کہ میرے لئے زحمت کا باعث بن جاؤ۔"

قبل اس کے کہ میں میجر سے اپنی درخواست کے سلسلے میں معافی طلب کر سکتا وہ مجھے گھورتا ہوا میرے کمرے سے نکل گیا۔ اسے میری بات سے شدید صدمہ پہنچا تھا جس کی تلافی کرنا میرا فرض تھا مگر افسوس کہ میں ایسا نہ کر سکا۔ دوسرے روز جب میں نے میجر ڈکسن سے ملنے کی کوشش کی تو اس نے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ اگلے روز وہ ہوٹل چھوڑ کر جا چکا تھا۔

○

میجر ڈکسن سے فرانس کے ہوٹل میں میری آخری ملاقات 3 نومبر 1893ء کو ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے میجر کو اس کے لندن کے پتے پر متعدد خط لکھے لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ غالباً" میری داستان کی اشاعت والی درخواست پر وہ بہت زیادہ ناراض ہو گیا تھا۔ بہرحال میں نے اس کے بیان کردہ واقعات پہلی فرصت میں اسی تفصیل اور ترتیب کے ساتھ اپنی ڈائری میں درج کر لئے جیسے خود میجر نے سنائے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی میں میجر کو سمجھا بجھا کر اس کی حیرت انگیز داستان شائع کرنے کے سلسلے میں ضرور رضا مند کر لوں گا مگر بعد میں مصروفیات نے مجھے ایسا جکڑا کہ میں میجر ڈکسن اور اس کی داستان کو یکسر فراموش کر بیٹھا اور اپنے ذاتی کاموں میں الجھ کر رہ گیا۔

تقریباً" آٹھ سال تک میں اس عجیب و غریب داستان سے قطعی غیر متعلق رہا جو بدستور میرے سیف میں محفوظ تھی لیکن پھر اچانک ایک روز جب میں نے اخبار میں میجر ڈکسن کی موت کی خبر پڑھی تو سارے واقعات تازہ ہو گئے۔ مجھے ٹھیک سے وہ تاریخ یاد نہیں لیکن وہ نومبر 1902ء کا کوئی منحوس دن تھا۔ میجر کی موت کے تین ماہ بعد تک میں اس سلسلے میں کوئی آخری فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کی داستان کتابی صورت میں شائع کی جائے یا نہیں لیکن پھر میں نے اپنے وکیل کے مشورے کے بعد اسے

شائع کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا اور کتاب کی اشاعت میں مصروف ہو گیا۔ جب میجر ڈکسن کی حیرتناک کہانی چھپ کر منظر عام پر آئی تو برطانیہ میں کھلبلی مچ گئی۔ سب سے پہلے حکومت برطانیہ کی طرف سے مجھے طلب کیا گیا اور حقائق کی تصدیق کے سلسلے میں بار بار حکام کے رو برو میری پیشی ہوتی رہی۔

میں آئے دن کی طلبی اور کھینچاتانی سے بیحد دل برداشتہ تھا اور سوچتا تھا کہ میں نے میجر ڈکسن کی سنسنی خیز داستان کو کتابی صورت میں منظر عام پر لا کر یقیناً" حماقت کا ثبوت دیا ہے لیکن کتاب کی اشاعت کے تقریباً" دو سال بعد 1905ء میں میری محنت اور بھاگ دوڑ بار آور ثابت ہوئی اور مجھے میری پریشانیوں کا ثمر مل گیا۔ حکومت برطانیہ نے جو اس داستان میں خاصی دلچسپی لے رہی تھی۔ ٹانگا نیکا' سوالیہ اور ایتھوپیا کی حکومتوں کے سربراہوں کے ساتھ مل کر بوگاما جزیرے کو سرے سے نیست و نابود کر دینے کا فیصلہ کر لیا جو نہ جانے کتنے سیاحوں کی ہولناک موت کا باعث بن چکا تھا۔ چنانچہ 18 فروری 1905ء کو چاروں حکومتوں کی ہوائی بحری فوج نے مل کر بوگاما جزیرہ کو چاروں اطراف سے گھیر کر اتنی شدید بمباری کی کہ اس کا نام و نشان تک مٹا ڈالا۔

میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ اس روز میجر ڈکسن اور اس کی بد نصیب بیوی مونیکا کی بے چین روحوں کو ضرور قرار آگیا ہو گا۔

○